ISSN 2279 04030
کتابی سلسلہ ۶
سہ ماہی
آمد
ادب کے زندہ لہو کی گردش
سالِ نو ۲۰۱۳ء کی آمد مبارک!
خصوصی گوشہ
سیّد احتشام حسین
مدیر
عظیمہ فردوسی
مدیر اعزازی
خورشید اکبر

'آمد' کی تقریبِ رسمِ اجرا کے بعد اُردو بھون، پٹنہ میں محوِ گفتگو: دائیں سے ارتضٰی کریم، غضنفر، پیغام آفاقی، نسیم احمد نسیم، شمیم قاسمی اور عبید قمر

پٹنہ میں ایک ذاتی ملاقات کے موقعے سے لی گئی یادگار تصویر میں بیٹھے ہوئے: (دائیں سے) ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور خورشید اکبر، (پشت پر دائیں سے): سرور حسین، شمیم قاسمی، جاوید احمد ایڈوکیٹ اور

ISSN 2279-0403

ادب کے زندہ لہو کی گردش

کتابی سلسلہ ⑥

نظریاتی ادّعائیت کے خلاف کشادہ ذہنی رویوں [نجات پسندی] کی دستاویز

جلد : ① جنوری تا مارچ ۲۰۱۳ء شمارہ: ③

[دوسرا سال]

مدیر
عظیمہ فردوسی

مدیر اعزازی
خورشید اکبر

e-mail: khursheidakbar@gmail.com
Contact:09631629952 / 07677266932

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ:

آرزو منزل، شیش محل کالونی، عالم گنج، پٹنہ -۸۰۰۰۰۷

☆ ازراہِ کرم چیک اور بینک ڈرافٹ پر صرف Azeema Firdausi کا نام لکھیں۔
Canara Bank A/c No. 1967101009012,Boring Rd,Patna
IFSC Code : CNRB0001967(For Money Transfer within India)
SWIFT Code: CNRBINBBPER(For Internatioal Banking)

Title Code : BIHBIL 00337/04/1/2012-TC
[Approved by RNI]

SEHMAAHI

AAMAD

January to March 2013

Volume: 1 Issue: 2

Editor
Azeema Firdausi

Honorary Editor
Khursheid Akbar

اشاعت : جنوری تا مارچ ۲۰۱۳ء

تعدادِ اشاعت : ایک ہزار [۱۰۰۰]

زرِتعاون فی شمارہ : ایک سو پچیس روپے (=/125) ۲۰ر امریکی ڈالر

زرِتعاون سالانہ (چار شمارے) : ۶۰۰ر چھ سو روپے (رجسٹرڈ ڈاک سے، ہندستان میں)

رکنِ تاحیات [ہندستان میں] : دس ہزار روپے ر بیرونی ممالک سے : ۱۵۰۰ امریکی ڈالر

برطانیہ : ۶۰ر پاؤنڈ ر امریکہ (و دیگر یوروپی ممالک) : ۸۰ر امریکی ڈالر

خلیجی و دیگر ایشیائی ممالک [بیرون ہند] : ۶۰ر امریکی ڈالر ر ساڑھے تین ہزار ہندستانی روپے

خصوصی معاونین ر ادارہ جات سے : ایک ہزار روپے (سالانہ)

کمپوزنگ : شجاع الزماں، آئیڈیل کمپیوٹر، مہندرو، پٹنہ۔۶

طباعت : پاکیزہ آفسٹ، شاہ گنج، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۶

سرورق : ذوالفقار حیدر، سبزی باغ، پٹنہ۔۴

قانونی مشیر : سیّد محمد کمال الدین، ایڈوکیٹ [پٹنہ ہائی کورٹ]

- ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر عظیمہ فردوسی نے پاکیزہ آفسٹ پریس، شاہ گنج، پٹنہ سے چھپوا کر آرزو منزل، شیش محل کالونی، عالم گنج، پٹنہ۔۷ سے شائع کیا۔

کائناتِ آمد

شہرِ مدعا: برٹرنڈ رسل کی تصنیف سے ایک اقتباس 6

اداریہ: ادب کا فلسفۂ نجات رنجات پسندی ؟ 7 خورشید اکبر

شہرِ اعتراف: سید احتشام حسین کا خصوصی گوشہ 18

احتشام شناسی : 20 پروفیسر محمد حسن

احتشام حسین کی تنقیدی شخصیت : 26 پروفیسر شمیم حنفی

احتشام حسین کے تنقیدی رویّے : 34 پروفیسر ابوالکلام قاسمی

سیّد احتشام حسین کی شخصیت : 43 پروفیسر قمر رئیس

لکھنؤ کی انجمن اور احتشام صاحب : 47 اقبال مجید

'ماہنامہ کتاب' اور احتشام حسین : 54 عابد سہیل

سید احتشام حسین : کچھ یادیں : 64 رتن سنگھ

ذات والد کے بعض نمایاں گوشے : 69 ڈاکٹر جعفر عسکری

پروفیسر احتشام حسین سے مصاحبہ : 74 ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

احتشام حسین کی مکتوب نگاری : 82 ڈاکٹر اکبر مہدی مظفر

شہرِ غزل: غزلیں 91

پیش رو غزلیں : سیّد امین اشرف رکرشن کمار طور رصبا اکرام 93 - 92

مدحت الاختر رقوس صدیقی 95 - 94

دس خاص غزلیں : عبدالرحیم نشتر 96

ہم عصر غزلیں : سلیمان خمار رراشد طراز 102 - 101

متان بجنوری ر ڈاکٹر ذکی طارق 104- 103

راشد جمال فاروقی رمعراج احمد معراج 105

سہیل اختر رڈاکٹر ظفر مرادآبادی 107 - 106

حنیف ساحل ر ڈاکٹر علی عباس امید 109 - 108

رڈاکٹر نثار جیراجپوری 110

طارق متین رقربان آتش 112 -111
تفصیل احمد رحسن اقبال 115 - 113
نوشاد احمد کریمی ر اصغر شمیم 117 - 116
سوغات غزلیں : غالب عرفان ر افتخار راغب 121 - 118

شہرِ آہنگ: نظمیں 122
پیش رَو نظمیں : صبا اکرام ر غالب عرفان 123
ہم عصر نظمیں : راشد جمال فاروقی رشکیل اعظمی 127 - 124
سلیمان خمار رکہکشاں تبسم 132 -127
ڈاکٹر نثار جیراجپوری رتبسم فاطمہ 136 - 133
خاور نقیب 137
سوغات نظمیں : وحید الحسن [امریکہ] 138
رباعیات : مامون ایمن [امریکہ] رمعراج احمد معراج 142 - 139

شہرِ افسانہ : افسانے 143
سُرخ و سبز 144 شوکت حیات
خدا کا بھیجا ہوا پرندہ 157 صدیق عالم
تاخیر 168 نور الہدیٰ سیّد [پاکستان]
مارٹن کوارٹرز کا ماسٹر 176 اخلاق احمد [پاکستان]
عاقبت 187 یاسین احمد
بوڑھے بہت تنگ کرتے ہیں 192 صغیر رحمانی
رشتے ناتے 200 غزال ضیغم

شہرِ اشتراک : روسی ادب سے منتخب افسانہ 205
معزز گستاخ 205 انتون چیخوف
ترجمہ : رفیق شاہین

شہرِ نقد و نظر: تنقیدی مضامین 212
افسانے کا منصب 213 پروفیسر وہاب اشرفی
کیفی اعظمی کی شعری جمالیات 223 ابوذر ہاشمی
عصمت کے نسوانی کردار [تانیثیت کے تناظر میں] 232 ساجد ذکی فہمی

شہرِ اضطراب : احساسِ زیاں 239
کراچی میں پُرانی کتابوں کا اتوار بازار 239 راشد اشرف۔ کراچی

شہرِ آمد : تعلّقِ خاطر 248
مطالعے کی میز سے [خاص تبصرے] 248 پروفیسر سیّد محمد عقیل
سہ ماہی 'آمد' کا فکر انگیز اداریہ 253 علی حیدر ملک
کتاب گیلری : 'آمد۔۵' 255 محمد حامد سراج
ممکناتِ 'آمد' [منظوم اظہارِ خیال] 260 عبدالمنان طرزی

شہرِ آئینہ : تبصرے 261
پیروڈی کا فن : امتیاز وحید / مبصر : 261 صفدر امام قادری
مرزا عظیم بیگ چغتائی کی ادبی خدمات : حنا آفریں / مبصر : 265 صفدر امام قادری
''دھوپ چھاؤں'' : ریاض الرحمان شروانی / مبصر : 269 صفدر امام قادری
'سوادِ حرف' : مختار شمیم / مبصر : 275 اظہار خضر
'ترجمہ : آئینہ بفردا میں' : ایم۔ علی / مبصر : 281 فہیم انور

شہرِ خیر و خبر : مکتوبات 288
اقبال مجید / اسیم کاویانی / سیّد شاہد مہدی / ڈاکٹر جعفر عسکری / پی۔پی۔ سریواستو رِند / شاہد عزیز / ولی عالم شاہین / صبا اکرام / غالب عرفان / احمد صفی / رومانہ رومی / راشد اشرف / ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی / عبدالرحیم نشتر / علی احمد فاطمی / رؤف خیر / راشد جمال فاروقی / ڈاکٹر ذکی طارق / ڈاکٹر ظفر مرادآبادی / جمال اویسی / ڈاکٹر حسن رضا / اقبال حسن آزاد / سلطان احمد ساحلؔ / محمد ضیاء الاسلام رضوی / کہکشاں تبسّم / تفصیل احمد / معراج احمد معراج / ڈاکٹر سحر افروز / اصغر شمیم / ڈاکٹر حنا افشاں۔

شہرِ رفاقت : مصنّفین کے پتے 318

شہرِ مدّعا

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

[غالب]

"Philosohy, as I shall understand the word, is something intermediate between theology and science. Like theology, it consists of speculations on matters as to which definite knowledge has, so far, been unascertainable; but the science, it appeals to human reason rather than to authority, whethr that of tradition or that of revelation. All *definite* knowledge-so I should contend – belongs to science; all *dogma* as to what surpasses definite knowledge belongs to theology. But between theology and science there is a No Man's Land, exposed to attack from both sides; this No Man's Land is philosophy. Almost all the questions of most interest to speculative minds are such as science cannot answer, and the confident answers of theologians no longer seem so convincing as they did in former centuries. Is the world divided into mind and matter, and, if so, what is mind and what is matter? Is mind subject to matter, or is it possessed of independent powers? Has the universe any unity or purpose? Is it evolving towards some goals? Are there really laws of nature, or do we believe in them only because of our innate love of order? .... Must the good be eternal in order to deserve to be valued, or is it worth seeking even if the universe is inexorably moving towards death? Is there such a thing as wisdom, or is what seems such merely the ultimate refinement of folly? To such questions no answer can be found in the laboratory. Theologies have professed to give answers, all to definite; but their very definiteness causes modern minds to view them with suspicion. The studying of these questions, if not the answering of them, is the business of philosophy."

- Bertrand Russell : The History of Western Philosophy, Pub. by Simon & Schuster, 1972, Introductory Page - xiii to xiv.

اداریہ

ادب کا فلسفۂ نجات / نجات پسندی ؟

● خورشید اکبر

(۱)

علم کی کوئی بھی شاخ یا اس کا کوئی بھی شعبہ خواہ فلسفہ ہو، سائنس ہو، ادب ہو یا سماجی علوم — سبھی اپنے آغاز، ارتقا اور امکانات کے پیشِ نظر کسی نہ کسی عنوان سے انسانی وجود اور کائنات کے اسرار و رموز کی گرہ کشائی اور نت نئے انکشافات و نظریات کے پیشِ نظر 'نجاتِ انسانی' کے مسائل و مباحث میں سرگرداں نظر آتے ہیں اور اس طرح ردّ و قبول کا ایک اٹوٹ سلسلہ قایم ہے اور آیندہ بھی رہے گا۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ ادب میں بھی بہ یک وقت کئی طرح کے اصول و نظریات صحیح اور کارآمد ثابت ہوسکتے ہیں اور قابلِ تردید بھی، تو پھر ادب کے 'فلسفۂ نجات' یا 'نجات پسندی' کے مباحث میں شرکت سے بھلا کسی کو کیا قباحت ہوسکتی ہے، بہ شرطے کہ اسے استدلال و شواہد کے ساتھ پیش کیا جائے۔ حالاں کہ یہ کام تب تک آسان نہیں ہے جب تک اس پر سیر حاصل مکالمہ قایم نہ ہو جائے یا ادبی معاشرہ اسے حسبِ ضرورت قبول نہ کرلے کہ کوئی بھی ادبی نظریہ خلا میں معلق نہیں رہ سکتا۔ اسے اپنی نشو و نما اور پرورش و پرداخت کے لیے زرخیز سرزمین اور سازگار آب و ہوا درکار ہوتی ہے۔ یہ الگ بات کہ بعض سچائیاں ہمارے درمیان پہلے سے کسی نہ کسی صورت میں موجود ہوتی ہیں لیکن انھیں دریافت یا شناخت کرنے میں ہم اکثر دیر لگا دیتے ہیں۔ بہرحال، یاد رہے کہ ہر نظریہ عمل و اطلاق کی کسوٹی سے پہچانا جاتا ہے۔

یہ بھی سچ ہے کہ ادب [تخلیق / تنقید / تحقیق]، اپنی تمام تر خالص آزادی اور خودمختاری [Autonomy] کے باوجود انسانی فطرت کی نفسیاتی رمزیات، سماجی رسومیات، فکری و ساختی تعینات [Determinism]، جمالیاتی سروکار اور فلسفیانہ موشگافیوں سے خود کو تادیر الگ نہیں رکھ سکتا حتیٰ کہ مذاہب [تصوّف / روحانیات / اسراریات]، نیچرل سائنس [مطالعۂ مظاہرِ قدرت و مادّی اشیا / طبیعات / کیمیا / حیاتیات / حیوانیات / نباتیات وغیرہ]، سیاسیات، سماجیات، معاشیات، بشریات نیز دیگر سماجی و انسانی علوم کے مروجہ اور ممکنہ اصول و نظریات و انکشافات سے ضرورتاً اپنی شرطوں پر استفادہ کرتا رہتا ہے کہ ان سے یکسر چشم پوشی مناسب نہیں۔ ویسے بھی موجودہ عہد بین العلومی مطالعات [Inter-Disciplinary Studies] پر اصرار کرتا ہے جنھیں نظرانداز کرنا ادب کے

فطری اور کشادہ رویّے کو محدود اور مسدود کرنے کے مترادف ہوگا۔

'نجات' کا سفر مادّیت سے ماورائیت، کثافت سے لطافت، مادّہ سے جوہر اور تعیّناتیت [Determinism] سے عدم تعیّناتیت کی سمت ہوتا ہے جو تمام طرح کی غیر ضروری، غیر فطری اور غیر انسانی بندشوں کو ہمہ جہت کشادگی میں بدلنے کی جدّ وجہد سے عبارت ہوتا ہے اور ہر نوعیّت کے جبر کی نفی پر آمادہ رہتا ہے : خواہ یہ جبر وجودی، ذہنی، نفسیاتی، مذہبی، سماجی، سیاسی، معاشی، ثقافتی یا کسی بھی خارجی یا باطنی یا امکانی صورتوں میں وقوع پذیر ہو۔ 'نجات' ایک ہمہ گیر تصور ہے، جس کا حصول انسانی زندگی کا عین مقصد ہے اور اس کا عدم حصول اس کی بے اطمینانی اور بغاوت واحتجاج کا باعث۔ نجات مختلف سطحوں پر اثر پذیر ہوسکتی ہے۔ اس کا تفاعل [Function] وجودی یا ذاتی سطح پر: جذبہ، احساس، فکر، وجدان، کیفیت، تخیّل، قوتِ تسخیر، قوتِ حافظہ اور قوتِ تصرف اور قوتِ ادراک کے ساتھ اجتماعی سطح پر: سماج، ثقافت، سیاست، معیشت وغیرہ کو بھی متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ گویا 'نجات' مسئلہ بھی ہے، حل بھی؛ اعلان بھی ہے، امکان بھی؛ رستہ بھی ہے، سامان بھی؛ منزل بھی ہے، سفر کا پیمان بھی؛ ایقان بھی ہے، ایمان بھی وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح 'نجات' ہماری انفرادیت واجتماعیت کی ہمہ رنگی اور ہمہ آہنگی کا استعارہ ہے، جس کے بغیر داستانِ حیات وکائنات نامکمل ہے، اس کی جستجو اور طلب ودریافت تمام شعبہ ہائے حیات پر حاوی ہے۔ اتنا ہی نہیں انسانی تہذیب وتمدّن کی پوری تاریخ حصولِ نجات کے جہدِ مسلسل کی خونچکاں داستان رہی ہے جس کے پسِ پشت مذاہب وسیاست کی اقتداری کشمکش، تجارت ومعیشت کے استحصالی رویّے، ادب وثقافت کے بدلتے ہوئے چہرے اور فلسفہ وسائنس کے نظریات و انکشافات کبھی مثبت تو کہیں منفی کردار میں نظر آتے ہیں۔

نجات، انسان کی ازلی خواہش اور ابدی مُراد [خواب] ہے، جس کے حصول کی خاطر انسانی وجود کے جہدِ للبقا [Struggle for the Existence] کا سلسلہ روزِ اوّل تا روزِ آخر قایم ودایم ہے اور ڈارون [Darwin] کے نظریۂ ارتقائیت [Theory of Evolution] کے برخلاف 'بہترین کی موجودگی' [Survival of the Fittest] کے بجائے وجود کا اثبات افضل، اوسط اور اسفل ترین سطحوں سے بھی ظاہر ہے بلکہ تسلسل برائے تغیر [Continuity for change] کے اصولِ فطرت [Law of Nature] پر گامزن ہے۔ اسی میں وجود کی معنویت [Relevance of Existence] اور نجات [Liberation] کا راز پوشیدہ ہے۔

خیال رہے کہ نجات محض ایک ذاتی / وجودی / نفسیاتی تصور نہیں ہے بلکہ اس کے اندر بہ یک وقت سماجی / مذہبی / ثقافتی / ادبی / سیاسی اور علمی حوالہ بننے کی بھی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس نقطۂ نظر سے نجات، مختلف النوع مروّجہ وممکنہ شعبہ جاتِ علم: مثلاً فلسفہ، نفسیات، مذہبیات، جمالیات [فنونِ لطیفہ]، ادبیات، بشریات، سماجیات، سیاسیات، خالص سائنسی علوم اور منجملہ علمِ کائنات [Cosmology] وغیرہ کا موضوع ومسئلہ بن سکتی ہے، بلکہ پہلے سے بھی بنتی رہی ہے۔

نجات کے حوالے سے ذہن میں کئی طرح کے سوالات پیدا ہوسکتے ہیں، مثلاً :

ا۔سوال : نجات کیا ہے؟

جواب : نجات، ہمہ جہت آزادی رخود مختاری رکشادگی رہم آہنگی رخوش حالی ربہشت سامانی کے اثبات اور ہر طرح کے غیر فطری وغیر انسانی جبر واکراہ کی نفی سے پیدا شدہ وہ صورتِ حال ہے جو کسی بھی فرد، جماعت اور ادارے کی ہمہ جہت ترقی اور عروج کی ضامن ہوتی ہے بہ شرطے کہ دیگر افراد، جماعت یا ادارے کی بے جا حق تلفی یا ان کے ساتھ زیادتی مقصود نہ ہو۔

[نوٹ : یوں تو لغوی اعتبار سے چھٹکارا رآزادی رخود مختاری رغیر پابندی رغیر مشروطیت رکشادگی رروشن خیالی ر ہم آہنگی رجبر واستبداد کی غیر موجودگی رکھلا پن رغیر ضروری اور غیر فطری بندشوں یا پابندیوں کی تخفیف وغیرہ نجات کے مترادفات کے طور پر مستعمل ہیں لیکن یہ سارے مفاہیم نجات کا عین بدل نہیں کہے جاسکتے ، البتہ نجات کے موافق وسائل و ذرائع [Tools and Mediums] کے طور پر کام میں لائے جا سکتے ہیں۔ حالانکہ ہندو اساطیر میں 'نجات' پنر جنم یا آواگون سے مکتی یا موکش (मोक्ष) کے معنی میں مستعمل ہے اور بودھ دھرم میں اسے نروان (निर्वाण) کہا جاتا ہے اور اسلامی عقیدے میں یہ بہشت کا انعام ہے!]

یہ تو ہوئی 'نجات' کی سماجی، مذہبی اور جمہوری تعبیر۔ اب دوسرا سوال بھی ہے!

۲۔ سوال : نجات کی تخلیقی رادبی رثقافتی تعبیر کیا ہے؟

جواب : 'نجات' تخلیقی عمل کی وہ صورتِ حال یا انبساط کی وہ کیفیت ہے جو غیاب کے ظہور کی ترجمان اور ظہور کے غیاب کی جویا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس تنقید یا تحقیق کے احتسابی عمل کے تحت تخلیقی فن پارے میں برتے گئے مجموعۂ الفاظ میں ظہور پذیر ہونے والی وجدانی رتخیلاتی رفکری رحسی ربصری رلمسی رسمعی رشامی رذوقی رلسانی ر معنیاتی رشعوری رلاشعوری راجتماعی شعور کی کیفیات کو 'جوہرِ غیبی' یا 'جوہرِ نجاتی' کے حوالے سے نشان زد کرنے یا لطف اندوز ہونے کے بعد ہی قدر شناسی کا حق ادا کیا جاسکتا ہے۔

[نوٹ: سطورِ بالا میں شعر وادب کے لیے 'مجموعۂ الفاظ' لیکن موسیقی کے لیے مجموعۂ آواز یا آہنگ رمصوری کے لیے مجموعۂ رنگ یا مجموعۂ خطوط ونقوش ونقاط ررقص کے لیے مجموعۂ حرکات وجنبش واداوکیف وسرور وغیرہ رسنگ تراشی یا مجسمہ سازی کے لیے نقش ونگار ورنگ وروغن وغیرہ کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔]

۳۔سوال : 'نجات پسندی' کا اساطیری اور مذہبی پس منظر کیا ہے؟

جواب : ایک عام مذہبی عقیدے کے مطابق عزازیل [ابلیس رشیطان] اپنی عبادت وریاضت، ذہانت و فطانت اور برگزیدگی کے سبب فرشتوں میں افضل ترین اور نہایت اعلا مقام ومرتبے پر فائز اور اللہ کا مقرب ترین فرشتہ ہوتے ہوئے بھی اپنی افضلیت کے احساس اور تکبر کے زیرِ اثر آدمؑ کو ایک سجدہ نہ کرنے سے بحکم خدا راندۂ درگاہ قرار دیا گیا۔ جب کہ آدمِ خاکی مسجودِ ملائک ٹھہرے۔

دوسری طرف اللہ نے چونکہ آدمؑ کو بہترین صورت پر پیدا کیا اور اسے اشرف المخلوقات بنانے کے ساتھ اس کے سر پر خلافت کا تاج بھی رکھا اور اس کی دل جوئی کی خاطر حوّا کو ہمدم و ہمراز بنایا لیکن آدمؑ و حوا بھی اللہ کے حکم کی نافرمانی کے سبب جنت سے نکالے گئے۔ اور اس کے بعد ان کی اولادیں اسی فردوسِ گم شدہ کی بازیافت کی خاطر سرگرداں ہیں۔

ممکن ہے کہ بعض لوگ ابلیس کے انکار اور آدمؑ و حوا کے شجرِ ممنوعہ کا پھل چکھنے والے واقعے کو 'نجات پسندی' کی منفی تعبیر کے طور پر پیش کریں اور ان واقعات میں پوشیدہ درسِ نجات کی رمزیات کو نظر انداز کردیں۔ واضح رہے کہ 'نجات پسندی' کوئی منفی یا انتہا پسندانہ نظریہ نہیں ہے کیونکہ مہاتما بدھ نے عرفانِ ذات کے بعد اپنی نجات پسندی کو 'مدھیم مارگ' [راہِ اعتدال] سے تعبیر کیا تھا۔ ہندو مذہب میں بھی بُردباری [Tolerance] یا सहिष्णुता پر بہت زور دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی عالمی اُخوت [विश्वबन्धुत्व] یا Universal Brotherhood اور वसुधैव कुटुम्बकम یعنی The whole world is a family جیسے اصولوں کو 'نجات پسندی' [मुक्तिमार्ग] کے لیے معاون تصوّر کیا گیا ہے۔ مذہبِ اسلام بھی میانہ روی کو 'راہِ نجات' سمجھتا ہے۔ بہ قولِ اقبالؔ ایک ایک شعر ابلیس اور آدم کے لیے:

اسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیوں کر ❖ مجھے معلوم کیا وہ رازداں تیرا ہے یا میرا

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں ❖ کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

۴۔ سوال : 'نجات پسندی' کی فلسفیانہ اساس کیا ہے؟

جواب : 'نجات پسندی' اپنا مقصد و مقصود آپ ہے۔ ادب کی تخلیقی صداقت' جمالیاتی و تخلیقی تجربے کی ارتفاعی سطح پر، فلسفیانہ یا مابعد الطبیعاتی [Metaphysical] صداقت کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ اس اعتبار سے ادبی صداقت مذہب، فلسفہ اور سائنس کی مشترک سرحدوں کو بھی چھوتی ہوئی آگے امکانات کے نادیدہ جہانوں میں داخل ہو جایا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی، اپنی آزادانہ و خود مختارانہ روش اور مستانہ سرشاری کے باوصف تخلیقی وظیفہ نفسیاتی / سماجی / سیاسی نیز دیگر غیر ادبی صداقتوں کو بھی، حسبِ تقاضائے فکر و فن، اپنا موضوع / حوالہ / تلازمہ بنانے سے گریزپا نہیں رہتا۔ اس طرح ہر تخلیقی صداقت یا تخلیقی وحدت کی کثرت فشانی [Pluralistic Disseminations] 'نجات پسندی' کی فلسفیانہ اساس بن سکتی ہے۔

علاوہ ازیں مشرقی و مغرب کی قدیم، جدید اور مابعد جدید فلسفیانہ افکار کے بے شمار سرمایے کی روشنی میں بھی 'نجات پسندی' کے مضمرات و ممکنات کی مستند روایات کے تاریخی تسلسل و معنویت کو شناخت کیا جاسکتا ہے۔ **قدیم مغربی فلسفے کے تحت:** فیثا غورث، ہر اقلیطس، سقراط، افلاطون، ارسطو؛ **کلیسائی دبستانِ فلسفہ کے یہودی اور عیسائی مفکرین:** سینٹ آگسٹائن، سینٹ بینے ڈِکٹ، جان اسکاٹ، سینٹ تھامس ایکوناس سے لے کر جدید فلسفے کے نشاۃ الثانیہ کے زیرِ اثر: ڈیکارٹس، اسپینوزا، لائبنیز، برکلے، ہیوم سے لے کر کانٹ، ہیگل، بائرن،

شاپن ہاؤور، نطشے اور افادیت پسند [Utilitarian] فلسفی بیتھم تک سیاسی فلسفیوں میں: میکیاویلی، ہابس، لاک، روسو، جان اسٹوورٹ مل سے لے کر کارل مارکس، اینجل، لینن، اسٹالن، ماؤزے تنگ، ہیرالڈ جے لاسکی چارلس میریم ڈیوڈ ایسٹن، گیبریل آمنڈ وغیرہ؛ وجودیت کے فلسفیوں میں ہیڈیگر، کیرکے گارد، ژاں پال سارتر وغیرہ تک؛ نفسیاتی مفکرین میں: فرائڈ، یونگ اور ایڈلر وغیرہ؛ سماجیاتی مفکرین میں: لیوائسٹراس، دُرخائم، میکس ویبر، پیریٹو، رابرٹ مشلس، ہیبر ماس، ٹالکاٹ پارسنس، مرٹن وغیرہ؛ مابعد جدید لسانی افکار و فلسفہ کے تحت: ژاک دریدا، لیوتار، آلتھوسے، بادریلارد، جارج سمل، فوکو وغیرہ؛ اسلامی فلسفیوں میں: فرقۂ معتزلہ اور فرقۂ اشعری سمیت صوفی مسلک و دیگر مفکرین: الکندی، فارابی، غزالی، رازی، بوعلی سینا، ابنِ عربی، البیرونی، حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ منیریؒ وغیرہ؛ ہندو ویدانت اور فلسفے کے تحت: وید، اُپنشد اور پُران جیسی مذہبی کتابیں نیز پتنجلی، سانکھیہ، شنکراچاریہ، راجہ رام موہن رائے، دیانند سرسوتی، سوامی وویکانند، اروند گھوش، رادھا کرشنن وغیرہ کے علاوہ بودھ اور جین فلسفے کی مستحکم روایات کے تناظر میں، تقاضاے عصر کے ساتھ، 'نجات پسندی' کے احتساب کی ضرورت ہے، جس کے بغیر ادبی فن پاروں پر اس نظریے کا اطلاق کئی طرح کی دشواریاں پیدا کرسکتا ہے۔ 'نجات پسندی' کی فلسفیانہ اساس کے ماخذات کی سمت یہ چند اشارے ہیں جنھیں بے حد احتیاط کے ساتھ موضوعیت و معروضیت، معنویت و عدم معنویت، وقوعیت و قیاسیت اور اثبات و نفی کی جدلیاتی کسوٹی [-Dialectical Touch stone] سے گزارنے اور چھان پھٹک کر دیکھنے کے بعد ہی ان کے صحت مند عناصر کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ گویا پوری فلسفیانہ وراثت کی ''زندہ روایت'' ہی کارگر اور قابلِ قبول ہوگی، مُردہ روایت پر اصرار ادب میں نئی فرقہ پرستی اور تنگ نظری کو جنم دے سکتی ہے جس سے 'نجات پسندی' کے کشادہ ذہنی روّیے کو لاحق خطرے کا اندیشہ ہے۔ پھر بھی نجات پسندی کے آفاقی اور بین الاقوامی فلسفیانہ اساس کی ترتیب و تنظیم کے پیشِ نظر مذکورہ بالا مفکرین، مذہبی پیشواؤں اور فلسفیوں کے بعض اصول و نظریات سے اختلاف اور انکار کی گنجائش موجود رہنے کے باوجود علم و آگہی کے فروغ و تسلسل میں ان کے بصیرت افروز اجتہادی نقاطِ نظر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ تہذیب انسانی اپنے اگلے ارتقائی سفر میں ان سے بار بار رجوع و استفادہ کرنا چاہے گی۔

میں نے دانستہ طور پر مختلف مکاتبِ فکر کے مذکورہ بالا فلسفیوں کی محض ایک اجمالی فہرست پیش کردی ہے لیکن ان کے نظام ہائے افکار کے تعارف، خصائص، مباحث، تشریحات، سوالات، تضادات اور نتائج کو زیرِ بحث لانے سے عمداً گریز کیا ہے کہ ان کے تفصیلی بیان کے لیے ایک الگ دفتر چاہیے جو فی الوقت میری دسترس سے باہر ہے۔ پھر بھی 'نجات پسندی' کی فلسفیانہ اساس کے تعلق سے چند کلیدی نکات کی جانب اشارے کرنا چاہوں گا:

(i) فلسفی روسو [Rousseau] کا قول ہے: ''انسان آزاد پیدا ہوا لیکن وہ ہر جگہ زنجیروں میں قید ہے'' ['Man is born free, but every where he is in chains'] ۔ یہ فلسفیانہ نکتہ 'نجات پسندی' کا ایک رہنما اصول بن سکتا ہے کہ انسان کی آزادی و خود مختاری [نجات پسندی] پر کہیں سماج، کہیں مذہب، کہیں سیاست، کہیں

نفسانی خواہشات، کہیں رسم ورواج اور کہیں مصلحت اور کہیں حالات وغیرہ نے پہرے لگا رکھے ہیں۔

(ii) اسی طرح انگریزی کے شاعر جان کیٹس [John Keats] کا مشہور زمانہ مصرع ہے:

''حسین شے ایک ابدی مسرّت ہے۔''

['A thing of beauty is a joy forever.']

گویا حُسن ابدی نجات کا ذریعہ ہے اور یہ بہت گہری اور بڑی بات ہے۔

(iii) ہندو اساطیر میں حق [Truth] کو اس کلمۂ کلید [سوتر واکیہ] میں پیش کیا گیا ہے: 'ستیم شِوم سُندرَم' ['सत्यम् शिवम् सुन्दरम्'] یعنی صداقت خیر [نور] ہے اور خیر حُسن ہے یا حسین ہے۔

(iv) قرآنِ پاک میں مذکور ہے اللہ جَمِیل ''وَ یُحِبُّ الْجَمالَ o یعنی اللہ جمیل [حسین] ہے اور جمال [حُسن] کو پسند کرتا ہے۔

کہنے کی مراد یہ ہے کہ انسانی حیات وکائنات میں جہاں بھی حُسن ظاہری یا باطنی ہے وہی خیر اور صداقت ہے یا جہاں صداقت ہے وہاں خیر اور حُسن ہے یا جو خیر ہے وہی حُسن بھی ہے اور صداقت بھی۔

(v) سقراط نے کہا : 'علم خیر ہے'۔ ['Knowledge is virtue']۔ یعنی خیر [نور] کی جستجو علم کی جستجو ہے اور علم فی نفسہٖ خیر [اعلاترین خوبی] ہے۔

اس طرح دنیا بھر کے فلسفے اور ادبیاتِ عالم سے بے شمار ایسی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جو 'نجات پسندی' کے حق وحمایت میں موجود ہیں نیز اردو شعروادب کا کلاسیکی، تصوّف پسند، ترقی پسند، جدید اور مابعد جدید سرمایہ بھی نجات پسندانہ عناصر سے خالی نہیں ہے بشرطے کہ ہم اس نقطۂ نظر سے بھی اپنے فن پاروں میں 'جوہرِ خودی' [Self conscious atom or atom of self consiousness] کو دریافت کریں جو بالآخر ہمیں 'جوہرِ خدا' [God's Particle] کی شناخت سے آشنا یا ہم کنار کر سکتے ہیں کہ یہی جوہرِ خودی، ذات وکائنات کے قفلِ ابجدی کی کلیدِ اعظم [Master Key] ہے جس کے اندر 'نجاتِ ابدی' کا راز پنہاں ہے۔ بقولِ شاعر:

ایں سعادت بہ زورِ بازو نیست ❖ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یا بہ زبانِ غالب :

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں ❖ غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

اب مولانا جلال الدین رومیؔ کو بھی سُنیے :

بشنو از نے چوں حکایت می کند ❖ وز جدائی ہا شکایت می کند

[ترجمہ : بانسری سے سُن کیا بیان کرتی ہے ❖ اور وہ جدائیوں کی (کیا) شکایت کرتی ہے]

کز نیستاں تا مرا ببُریدہ اند ❖ از نفیرم مرد وزن نالیدہ اند

[ترجمہ: کہ جب سے مجھے بنسلی سے کاٹا ہے ❖ میرے نالہ سے مرد وعورت (سب) روتے ہیں]

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق ❖ تا بگویم شرحِ دردِ اشتیاق

[ترجمہ: میں ایسا سینہ چاہتی ہوں جو جدائی سے پارہ پارہ ہو ❖ تاکہ میں عشق کے درد کی تفصیل سناؤں]

[مثنوی مولانا رومؒ، دفترِ اوّل، ترجمہ: قاضی سجاد حسین]

ہم اپنی اصل یعنی 'نور' کو فراموش کر چکے ہیں اور 'نجات پسندی' یا ادب کا فلسفۂ 'نجات' اسی نور کی بازیافت کا عہد نامہ ہے تاکہ ہم ادب کے ساتھ تمام علوم وفنون کو ظلمت کی سازشوں سے بچا کر نور کی سمت، باطل میں الجھے افکار وخیالات کو حق کی طرف اور فنا پذیر وجود کو بقائے نجات کی راہ پر گامزن کر سکیں۔

ماقبل سقراط یونانی فلسفی ہراقلیطس [Heraclitus] اصل عنصر آگ [Fire] کو مانتا ہے۔ اس کے مطابق آتش [آگ] کو قرار نہیں ہے۔ یہ کسی لمحہ حالتِ سکون میں نہیں رہ سکتی اور مسلسل حرکت میں رہنا اس کی بنیادی فطرت ہے۔ یہی آگ بھاپ [Vapour] میں تبدیل ہو کر سانس [Breath] کی شکل اختیار کر لیتی ہے جو روح کا جوہر اور ذی حیات وجود میں جاری وساری ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ آگ محض زندگی کی اساس ہی نہیں ہے بلکہ یہی اشیا میں بھی تبدیل ہوتی رہتی ہے مثلاً آگ پانی میں بدل جاتی ہے، پانی مٹی [خاک] کا روپ لے لیتا ہے اور مٹی دوبارہ پانی اور آگ کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے اور یہ سلسلہ دورانی ترتیب [Cyclic order] سے، بغیر رُکے، چلتا رہتا ہے۔ بقولِ ہراقلیطس:

"All things are exchanged for fire, and fire for all things as wares are excharged for gold and gold for wares." - Heraclitus.

لیکن دوسرے مفکرّین ہراقلیطس کے اس نظریے سے مکمل اتفاق سے گریز کرتے ہیں۔ پھر بھی کلی طور پر اس کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ ہراقلیطس نے ایک اور آفاقی نظریہ پیش کیا ہے کہ کائنات مسلسل گردش ر بہاؤ [Flow] میں ہے۔ اس کا کہنا ہے:

"Into the same river we go down and we do not go down, for into same river no man can enter twice, ever it flows in or flows out."
- Heraclitus

جدیدیت کے نمائندہ شاعر باؔنی کے لفظوں میں یہ حقیقت یوں بیان ہوئی ہے:

پیہم موجِ امکانی میں ❖ اگلا پاؤں نئے پانی میں [باؔنی]

یہی بات زندگی کے دیگر مظاہر کی طرح ادبی اصول ونظریات پر بھی صادق آتی ہے۔

اسلامی تصوّف اور نظریۂ وحدۃ الوجود کے اہم مفکّر ابن عربی نے بھی عناصر کی تخلیق کے متعلق اپنی تصنیف 'فتوحاتِ مکّیہ' میں روشنی ڈالی ہے۔ اسی طرح مخدوم شرف الدین یحیٰ منیریؒ کے رسالہ 'ارشاد السالکین' میں مذکور ہے کہ نورِ لطیف میں بہ ارادہ کثافت پیدا ہونے کے سبب نار [آگ] ظاہر ہوئی، آگ سے باد [ہوا]، باد سے آب [پانی] اور آب سے خاک [مٹی] کا ظہور ہوا۔ بقولِ غالب: ع

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی۔

خیال رہے کہ آدم کی تخلیق خاک سے ہوئی اور ابلیس کی آگ سے لیکن دراصل تخلیقِ حیات وکائنات کا بھید نور کے

مختلف درجات کے مظاہر [کثافتی تناسب کے اعتبار سے] کے سبب ہے اور انسان اپنی اصل یعنی 'نور' [نجات] کا متلاشی ہے۔

یہ تو ہوئی نجات کے حصول کی ذاتی / وجودی منزل۔ اب سوال ہے 'نجات' کی اجتماعی بازیافت کا ورنہ فلسفۂ نجات، ذات کے خول تک ہی محدود رہ جائے گا۔

۵۔ سوال : کیا نجات کا حصول اجتماعی سطح پر ممکن ہے؟

جواب : یہ بالکل ممکن ہے، اگر ذاتی سطح پر نجات یافتہ افراد و اشخاص اس کے لیے اپنی اپنی سطح سے یا مشترکہ طور پر کوشش و عمل کو اختیار کریں۔ مگر 'نجات' کے مسئلے کا حل یا تدارک صرف کسی فرد یا افراد کی پیش قدمی کی امید میں یوں ہی التوا میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اس کی خاطر ایک ایسے سماجی / معاشی / ثقافتی اداروں کے فروغ و استحکام اور سیاسی نظام کے قیام یا پہلے سے موجود اور حاصل شدہ جمہوری سیاسی نظام یا اس سے بہتر متبادل سیاسی نظام پر مشترک غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ایسی کسی مثالی صورت یا ماڈل [Fool-Proof Model] کی غیر موجودگی میں مروّجہ جمہوری سیاسی نظام کو اجتماعی حصولِ نجات کے مقصد سے استعمال کیا جا سکتا ہے کہ ہمہ جہت ترقی اور عروج کے آلۂ کار کے طور پر اس نظام کو فی الحال مزید جواب دہ، حسّاس، شفّاف، مساوات پسند اور انصاف جوئی کا فرائض بردار بنانے کی ضرورت محسوس کی جا سکتی ہے کیونکہ ترقّی کی پہلی سطح مادّی [Material] ہوتی ہے اور بغیر مادّی آسائشوں اور فراغتوں کے 'نجات' کی دوسری بلند تر سطحوں [غیر مادّی / روحانی] کو حاصل کرنا غیر ممکن نہیں تو بہت حد تک دشوار ضرور ہے۔

ادب کے فلسفۂ نجات / 'نجات پسندی' کے خصائص و کردار :

ا۔ ادب کا نظریۂ نجات، نجات پسند ہونے کے ساتھ تغیر پسندی کا بھی قائل ہے۔ چونکہ زندگی اور کائنات کی ہر شے مسلسل تغیر پذیر ہے اور یہ تبدیلی کبھی بتدریج تو کبھی انقلاب آشنا بھی ہوا کرتی ہے۔ اس لیے 'نجات پسندی' ہر طرح کی نظریاتی اڈعائیت [Dogmatism] کے خلاف ہے، لیکن تمام گزشتہ اور مروّجہ افکار و نظریات کی تقلیب شدہ صورتوں سے، بہ تقاضائے عصریّت و معنویت، استفادہ کر سکتی ہے۔

۲۔ 'نجات پسندی' آزادی / خود مختاری / کشادہ ذہنی رویّے کا عہد نامۂ تخلیق ہے جو کسی بھی طرح کی بنیاد پرستی [Fundamentalism] یا احیا پرستی [Revivalism] کے خلاف ہے، لیکن فطرت و ثقافت کے آفاقی اصولوں کی شناخت اور سماجی / سائنسی / مابعد الطبیعاتی صداقتوں پر اصرار کے باوجود مقامی [Local / Regional] اور عارضی اثرات [Provisional Effects] سے بھی علاقہ رکھتا ہے۔

۳۔ ہر چند کہ 'نجات پسندی' اپنے اس ترجیحی وظیفے کو فراموش نہیں کرتی کہ 'نجات' انسان کی ازلی خواہش اور ابدی مراد [خواب] ہے، جس کے ممکناتی حصول کی فطری جدّ و جہد انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر مسلسل چلتی رہتی ہے لیکن اس کے شانہ بہ شانہ اس حقیقت سے بھی انکار مشکل ہے کہ یہ ایک تدریجی اور ارتقائی مرحلہ

[Process] ہے جس کے تحت کبھی کبھی کسی ناگہانی عجلت یا محرومیوں [Deprivations] اور توقعات [Expectations] کی مشترک یا مجموعی تعداد میں اضافے کے سبب پورے سماجی رسیاسی نظام کو خلفشار و انتشار سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے جس کے نتیجے میں سماجی رسیاسی نظام کو اپنے تنظیمی وجود کی مدافعت کی خاطر موافقت و مطابقت [Adjustment and adaptations] کے لچیلے روّیے کو اختیار کرنا پڑتا ہے ورنہ انقلاب آخری راستہ ہوتا ہے۔ اس طرح 'نجات پسندی' ادبی نقطۂ نظر سے فرد اور نظام کے مابین زندگی کی کشمکشوں اور آویزشوں کا رزمیہ [Epic] بن جاتی ہے جس میں حیات وکائنات کے سبھی رنگ جلوہ گر ہوتے ہیں۔

۴۔ 'نجات پسندی' ہر طرح کے جبر، تعیّنا تیت [Delerminism]، غیر فطری و غیر انسانی احکامات [Dictations] نیز تمام تر منفی روّیوں کی نفی اور وجود کے اثبات کی تخلیقی دستاویز ہے جس میں عوامی و جمہوری احساسات وثقافت، حاشیائی کشمکش و تضادات [Sub-Altern tensions and contradictions]، تانیثی نجات [Feminist Liberation] دَلت پسماندہ نجات [Dalit Backward's Liberation] وغیرہ کے تخلیقی امکانات روشن ہیں۔

۵۔ 'نجات پسندی' ہر نظریے کو شک کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور کسی بھی ادبی اصول کو 'نسخۂ کیمیا یا ذریعۂ نجات تصور نہیں کرتی بلکہ تمام گزشتہ اور مروجہ افکار و نظریات کو چھان پھٹک اور جانچ پرکھ کے بعد ہی ردّ یا قبول کرنے کے حق میں ہے۔

۶۔ 'نجات پسندی' تمام تر علمی، ادبی اور ثقافتی سرمایے کا احترام کرتی ہے اور بدلے ہوئے تناظر میں ان سے ازسرِ نو مکالمہ اور استفادہ اپنا فرضِ عین سمجھتی ہے۔

۷۔ 'نجات پسندی' کوئی سیاسی منشور [Political Manifesto] یا خفیہ تخریبی ایجنڈا نہیں ہے بلکہ ادب کی خودمختاری [Autonomy]، آزاد مشربی، کشادہ ظرفی اور شفافیت کا شناخت نامہ ہے جو عالمی اُخوت [Universal Brotherhood] انسان دوستی [Humanism] اور بقائے باہمی [Peaceful co-existence] کے ساتھ صحت مند جمہوری قدروں کی پاسداری چاہتا ہے۔

۸۔ 'نجات پسندی' ادب کے بین العلومی مطالعات [Inter-disciplinary Studies] پر اصرار کرتی ہے۔

۹۔ 'نجات پسندی' ہر نوعیت کے ادبی رلسانی راصنافی و دیگر تخلیقی اجتہاد اور نو بہ نو تجربے کا استقبال کرتی ہے بشرطے کہ وہ تنگ نظری، تعصب پسندی اور دقیانوسیت سے پاک نیز ہماری زندہ ثقافتی قدروں سے ہم آہنگ یا اس میں اضافے کا باعث ہو۔

۱۰۔ 'نجات پسندی' تمام انسان اور کائنات کے ہر ذرّے سے عشق اور مذاہب عالم کی زندہ وتوانا روحانی قدروں کی آفاقیت پر یقین رکھتی ہے کہ عشق ہی اصل 'جوہرِ تخلیق' ہے اور 'جوہرِ خودی' بھی!

خاکسار نے اپنی کم علمی اور عجز بیانی کا کج مج نمونہ، جو بحث طلب، اور تشنۂ تکمیل ہے، 'آمد' کے ذی فہم اور دوراندیش قارئین کے حضور پیش کر دیا ہے۔ اب اس پر مباحث قائم کرنا، قطع و برید کے عمل سے گزارنا، ترمیم و اضافے

کوراہ دینا اور اسے حسبِ ذوق و توفیق ردّ یا قبول کرنے کا اہم فریضہ انجام دینا ان کے ذمّے ہے۔ بقول حافظ شیرازی:

شبِ تاریک، بیمِ موج، گردابِ چنیں حائل ❖ کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا

(۲)

اداریہ کا پہلا حصّہ اس قدر طوالت اختیار کر گیا ہے کہ اب 'آمد' کے مشمولات پر تفصیلی گفتگو کا یارا نہیں۔ پھر بھی چند مختصر باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں: سیّد احتشام حسین کا خصوصی گوشہ قارئین کی خاص توجہ کا مستحق ہے۔ ان کی پیدائش کے سو سال ۲۰۱۲ء کے جولائی میں پورے ہو گئے۔ اس اعتبار سے یہ گوشہ 'آمد' ۴ میں شائع ہونا تھا لیکن بعض مشاہیر اہلِ قلم کی نگارشات کے حصول میں کچھ وقت گزر گیا اس لیے قدرے تاخیر ہوئی۔ پروفیسر محمد حسن، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر ابوالکلام قاسمی اور پروفیسر قمر رئیس کے مضامین غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے زیرِ اہتمام پروفیسر نذیر احمد کی مرتّب کردہ کتاب 'سیّد احتشام حسین: کچھ یادیں کچھ جائزے' [مطبوعہ: ۱۹۹۷] سے ماخوذ ہیں اور خصوصی شکریے کے ساتھ دوبارہ شائع کیے جا رہے ہیں۔ یہ مضامین مطالعۂ احتشامیات کے تحت خاص تاریخی حیثیت کے حامل ہیں جن کی ادبی اہمیت اور تنقیدی معنویت سے انکار ممکن نہیں۔ شمیم حنفی اور ابوالکلام قاسمی اردو کے مایۂ ناز اور کشادہ ذہنی رویّوں کے بنیاد گزار نقّادوں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے 'آمد' کو بہ وجوہ اپنی خیال انگیز تحریروں سے ہنوز محروم رکھا تھا۔ اس طرح احتشام حسین کے بہانے ان کی پُر وقار شمولیت کی سبیل نکل آئی ہے۔

سیّد احتشام حسین اُردو کی نابغۂ روزگار اور کثیر الجہات شخصیتوں میں بلند ادبی مرتبے کے حامل رہے ہیں اور مخصوص نظریاتی وابستگی کے باوجود انھوں نے وضع داری، روشن خیالی، صلحِ کل نیز ادب کے نجات پسند وظیفے کو کبھی فراموش نہیں کیا جس کا اعتراف ان کے مختلف النوع ادبی نگارشات کے حوالے سے آیندہ بھی کیا جاتا رہے گا۔ ان کی پہلو دار شخصیت کے تناظر میں اقبال مجید، عابد سہیل، رتن سنگھ اور ان کے فرزندِ ارجمند ڈاکٹر جعفر عسکری کی تازہ تحریریں ایک قد آور ترقی پسند نقّاد کی حلیمی، انکساری اور اپنے عزیزوں یا آنے والی نسل کے تئیں ان کی بے پناہ شفقتوں کا قابلِ تقلید منظر نامہ پیش کرتی ہیں۔ احتشام حسین سے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے لیے گئے انٹرویو کی مکرّر اشاعت بھی اردو کی موجودہ تنقیدی مجہولیت اور فکری ژولیدگی کے لیے تازیانۂ عبرت کی مثال ہے۔ ڈاکٹر اکبر مہدی مظفر نے احتشام حسین کی مکتوب نگاری کو اپنا موضوع بنایا ہے اور 'آمد' کی بزم میں پہلی بار شریک ہو رہے ہیں۔ ان کے ساتھ گوشۂ احتشام کے تمام مستند قلمکاروں کا استقبال ہے!

اس بار 'آمد' کا تخلیقی حصّہ بھرا پُرا ہے؛ گزشتہ شماروں کی بہ نسبت نظمیں، غزلیں، رباعیات اور افسانے قدرے وافر ہیں۔ شوکت حیات اور صدیق عالم کے افسانے خاص کشش کا باعث اور 'نجات پسندی' کے تخلیقی شواہد ہیں۔ شوکت حیات نے 'سرخ و سبز' کے عنوان سے ایک فکر انگیز اور جہاد پرور افسانہ تخلیق کیا ہے جو ان کے مخصوص نظریۂ حیات اور ریڈیکل اجتہادی روّیے کا غمّاز ہے جس میں فنّی چابکدستی اور علامتی پیرایۂ اظہار کے سہارے پیغامِ انقلاب کو جیتے جاگتے تخلیقی پیکر میں ڈھالا گیا ہے جو ان کے کمالِ فکر و فن کی دلیل ہے۔ افغانستان کے سماجی، تاریخی اور سیاسی بحران کے پس منظر میں عالمی سیاست کی ریشہ دوانیوں کو بھرپور افسانوی ہنرمندی کے

ساتھ منکشف کیا گیا ہے۔ یہ افسانہ 'سُرخ' یعنی کمیونزم اور 'سبز' بمعنی اسلام کے امکانی اشتراک کی تبلیغ پر بھی آمادہ نظر آتا ہے۔ شریعت، روحانیت، جنس کی فطری ناگزیریت، مساوات، عمل پسندی، حکمت اور تدبّر کا یہ تخلیقی آمیزہ 'اسلامی اشتراکیت [Islamic Socialism] یا 'اشتراکی اسلام' یا 'کمیونسٹ اسلام' کے سیاسی متبادل [Political Alternative] کی طرف بھی ہماری توجہ مبذول کراتا ہے جو قارئین کو مثبت اور منفی دونوں طرح کے مکالمے پر اُکسائے گا۔ صدّیق عالم کی کہانی 'خدا کا بھیجا ہوا پرندہ' جادوئی حقیقت نگاری [Magical Realism]، تخلیقی بیانیہ، داستانوی جزئیات رَسی، ناسٹلجیا اور طرفگی کی کیفیت کے ساتھ استعاراتی فضا میں پروان چڑھتی ہے اور تاریخی شعور کی غمّاز ہے جو پرَت در پرَت قاری کو تحیّر کی سحر آفرینی سے دوچار کرتی ہے اور بہ ظاہر قصہ پن کی سادگی سے معمور ہونے کے باوجود بے پناہ تخلیقی تہہ داری کی مظہر ہے، جس کے ابعاد خیرہ کن ہیں۔ شوکت حیات اور صدّیق عالم کی یہ کہانیاں اردو کی متموّل افسانوی روایت میں بیش بہا اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یقین ہے کہ قارئین اس کی زیادہ بہتر داد دے سکیں گے اور نسبتاً دیانت دارانہ مکالمہ قائم کریں گے۔ دوسرے افسانے بھی اپنے خاص رنگ و آہنگ میں انسانی رشتوں سے گم ہوتی ہوئی حسّاسیت کے اس دَور میں بھی ہمیں چند ٹوٹتے ہوئے نازک دھاگوں کو سنبھال کر رکھنے کی غیرت سے آشنا کراتے ہیں۔ نورالہدیٰ سیّد، اخلاق احمد، صغیر رحمانی اور غزال ضیغم کی افسانوی تخلیقات کو انھی باریک و لطیف نفسیاتی تلازمے کی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یاسین احمد کی تحریر کردہ کہانی 'عاقبت' ہماری مذہبی اور ثقافتی قدروں کے انحطاط کی نوحہ خوانی ہے کہ عاقبت کے اندیشے بھی بے وقعت ہو چکے ہیں گویا صارفیت [Consumerism] نے ہر دیدہ و نادیدہ شے کی اوقات متعیّن کردی ہے۔ ایک حافظِ قرآن [نعیم] کو ہمارا آسودہ حال طبقہ کس نگاہ سے دیکھتا ہے، یاسین احمد کا افسانہ اس کی جیتی جاگتی مثال ہے۔

وقت اور صفحات کی تنگی کے سبب دیگر خیال انگیز مشمولات پر اظہارِ خیال ممکن نہیں ہو پا رہا ہے۔ امید کہ شریکِ قلم کار حضرات معاف فرمائیں گے۔ قارئینِ کرام سے تاثرات متوقع ہیں۔

- مظفر رزمی، رضیہ بٹ، دیوندر اسّر، پروفیسر وارث کرمانی، ہلال سیوہاروی، اسرار اکبر آبادی، حسن امام درد، صابر زاہد، ثمینہ راجہ، صفیہ صدّیقی، جیسی معروف و قابلِ قدر ادبی شخصیتوں کے انتقال کی خبر سے پوری اردو دنیا سوگوار ہے۔ ادارہ 'آمد' مرحومین کے حق میں دعائے مغفرت کرتا ہے اور ان کے پسماندگان و متعلقین کے تئیں اظہارِ تعزیت!

☆ قارئینِ 'آمد' کو سالِ نو ۲۰۱۳ء مبارک ہو۔ اللہ کرے، یہ سال تمام عالمِ انسانیت کی ہمہ جہت خوش حالی، ترقّی، صحت اور امن و سکون کا ضامن ہو! آمین ○

☆☆ اردو کے کہنہ مشق شاعر اور رسالہ ''سرسبز'' کے مدیر کرشن کمار طور کو حال ہی میں ان کے شعری مجموعہ ''غرفۂ غیب'' کے لیے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کا مستحق قرار دیا ہے۔ ادارہ 'آمد' انھیں دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

پٹنہ

۷/ جنوری ۲۰۱۳ء

خورشید اکبر

شہرِ اعتراف

سیّد احتشام حسین

کا

خصوصی گوشہ

"In fact, though, Marx and Engels themselves did not put forward any comprehensive theory of literature. Their views seem relaxed and undogmatic: good art always has a degree of freedom from prevailing economic circumstances, even if these economic facts are its 'ultimate determinant'."

● Peter Barry : An introduction to literary and cultural theory, Pub. Manchester University Press, 1995, Page - 158.

پروفیسر احتشام حسین

ایک نظر میں

۱۔	والد کا نام اور پیشہ	: سیّد ابو جعفر	زمینداری
۲۔	تاریخِ ولادت	: ۱۱؍ جولائی ۱۹۱۲ء	بہ حسابِ سرٹیفکیٹ
		: ۲۱؍ اپریل ۱۹۱۲ء	بہ حسابِ خاندانی معلومات
۳۔	مقام	: ماہُل، ضلع اعظم گڑھ (یو پی)	
۴۔	ابتدائی تعلیم	: مکتب، گھر پر	
		: ماہُل پرائمری اسکول، اعظم گڑھ	
۵۔	ہائی اسکول کی تعلیم	: ویسلی ہائی اسکول، اعظم گڑھ	
۶۔	یونیورسٹی کی تعلیم	: گورنمنٹ انٹر کالج، الہ آباد	
		: الہ آباد یونیورسٹی	
۷۔	آغازِ ملازمت	: جولائی ۱۹۳۸ء	شعبۂ اُردو و فارسی
		:	لکھنؤ یونیورسٹی
۸۔	تصنیفی زندگی کا آغاز	: ۱۹۳۲ء سے افسانہ، سیاسی اور سماجی مضامین	
	(افسانے یا تنقید؟)	: مزاحیہ افسانے، ڈرامے، مذہبی مضامین	
۹۔	اوّلین دو افسانے	: (۱) ایثار (۲) لاجونتی دونوں 'نگار' میں	
	اوّلین دو مضامین	: (۱) وزیرِ اعظم انگلستان کا فیصلہ ثانی ۱۹۳۲ء	
		(۲) غالب کا فلسفۂ عشق ۱۹۳۴ء	
۱۰۔	اوّلین دو تصانیف	: (۱) 'ویرانے' (افسانے) ۱۹۴۲ء	
		: (۲) 'تنقیدی جائزے' ۱۹۴۴ء	

احتشام شناسی

● پروفیسر محمد حسن

احتشام صاحب اپنی تصانیف میں زندہ ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر اپنے چھ مضامین کے سیاق وسباق میں زندہ ہی نہیں زندگی بخش اور حیات آفریں ہیں۔ نقاد کی بڑی مجبوری یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی نظر سے ادوار کا مطالعہ کرتا ہے، انھیں جانچتا پرکھتا ہے۔ اس کے نزدیک اس وقت اُس کی اپنی تنقیدی اقدار ہی سب سے زیادہ معتبر اور مستند ہوتی ہیں اور اس کا اپنا زمانہ بیت جانے کے بعد یا کبھی کبھی خود اس کے اپنے دور میں جانچ اور پرکھ کے معیار بدلنے لگتے ہیں۔ ایسے میں سب سے معتبر اور مستند پرکھ یہی ہے کہ تبدیلی کی ان آندھیوں میں کسی تنقید نگار کے کونسے جواہر پارے ہیں جو روشنی لٹا رہے ہیں۔

احتشام صاحب نے زندگی بھر لکھنے پڑھنے اور پڑھانے میں گزاری اور بڑی لگن اور بصیرت کے ساتھ گزاری نہ کبھی اپنی ذات کا پرچار کیا نہ کبھی اپنے کمالات کا ڈھنڈورہ پیٹا خاموشی سے اپنے کام میں لگے رہے۔ ان دنوں بلکہ برسوں میں بھی جب ان کے دل ودماغ پر بڑا بوجھ تھا اور ہر لمحہ قیامت بن کر گزرتا تھا مگر لب شکوے نا آشنا رہے اور زبان وقلم پہ کبھی کڑواہٹ طاری نہ ہوئی۔ ضبط نفس کہ اس صفت میں وہ کسی سادھو سنت اور مراقبہ گار صوفی سے کم نہیں تھے۔

اور اپنی اس کیفیت میں بھی، اور اس سے والہانہ گزر جانے کے بعد بھی ان کا سدا بہار قلم پھول برساتا رہا۔ انھیں دنوں میں یا ان کے آس پاس انھوں نے ''غالبؔ کا تفکر'' جیسا مضمون لکھا جس کا ذکر گل سر سبد کے طور پر کرنا واجب ہے۔ اور ایسے عالم میں یہ مقالہ لکھا گیا جب یہ بھی کوئی کہنے والا نہ تھا کہ:

زنجیر جنوں کڑی نہ پڑیو
دیوانے کا پاؤں درمیاں ہے

تخلیقی فن کار کا ذکر ہوتا ہے تو اس کے کبھی کارناموں میں تنقید کی نظریں اس کی دل شکستگی کی داستانیں

بھی پڑھ لیتی ہیں اور میرؔ جیسے فن کار کا ذکر ہو تو اس کے ہر لفظ میں شکستِ شیشۂ دل کی صدا سنائی دینے لگتی ہے مگر نقاد خواہ تخلیقی سطح کا نقاد کیوں نہ ہو اس کے درد و داغ و جستجو و آرزو کی آواز سننے والا کوئی نہ ہوگا۔

''غالبؔ کا تفکر'' مقالہ لکھتے وقت احتشام صاحب کے سامنے بڑے خطرات اور اندیشے تھے اور سب سے بڑا اندیشہ تھا میکانکی طرزِ فکر کا جو پورے مقالے کو فکر انگیز بنانے کے بجائے مضحکہ خیز بنا سکتا تھا۔ لہٰذا آج بھی اس مقالے کو پڑھا جائے تو احتشام صاحب کا قلم بڑی احتیاط کے ساتھ ایک ایک جملہ بلکہ ایک ایک لفظ چنتا چلا جاتا ہے اور کہیں بھی عجلت میں کوئی فیصلہ، کوئی قطعی محاکمہ عاید نہیں کرتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ غور و فکر کے نئے پہلو پیش کرتا جاتا ہے کہ اُن پر ذرا توجہ ہو تو قاری اپنے طور پر نتیجہ نکال لے۔ اوّل تو غالبؔ پر قلم اٹھانا ہی جسارت کا کام ہے، پھر ایسے فن کار کے بارے میں کوئی نیا پہلو ڈھونڈ نکالنا اس سے زیادہ دشوار ہے، جس پر اب تک الماریاں بھر کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور نت نئے زاویوں سے لکھی جا چکی ہوں۔ پھر وہ بھی ایک ایسے نقاد کے قلم سے کچھ لکھنا اور بھی دشوار ہے جسے نئی نگاہ اور فکرِ تازہ ہی کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا ہے۔ احتشام صاحب نے اس للکار کو قبول کیا۔ اس میں یہ رمز بھی پوشیدہ تھا کہ ترقی پسند تاریخ اور ادبیات کا سائنسی مطالعہ محض کوئی وقتی مشغلہ یا مصلحت نہیں ہے بلکہ اس طرزِ تنقید سے دورِ قدیم کے جواہر پاروں کا بھی نیا ادراک اور عرفان حاصل کیا جا سکتا ہے۔

بنیادی استفہامیہ یہ تھا کہ غالبؔ کے فکر و فن میں نیا پن اور تازگی کے وسیلے کون سے ہیں؟ کیا یہ محض عطیۂ الٰہی ہے یا اس کے پیچھے کچھ خارجی محرکات بھی کارفرما ہیں؟ غالب کے سلسلے میں یہ سوال تھا بھی نہایت بلیغ کہ نہ تو وہ ایسے دورِ قدیم کے سرے پر کھڑے تھے جس کے بارے میں ہماری معلومات نتیجے نکالنے کے لیے نہایت ناقص ثابت ہوں اور نہ اس قدر قریب تھے کہ ان کے زمانے اور ماحول کا تجزیہ اس دور کی قربت کی وجہ سے ناممکن یا ناکافی ہو؟ غالبؔ کا کلام بھی سامنے تھا اور ان کا دور بھی۔ مگر ان دونوں کو ملا کر دیکھنا اور اس سے نتیجے نکالنے کا کام نہیں ہوا تھا۔

احتشام صاحب نے جگہ جگہ پر اس مطالعے کو میکانکی ہونے سے بچا لیا ہے اور بار بار مقالے کے اندر ہی اس کا اعتراف اور اعلان بھی کیا ہے۔ جس سے ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ غالبؔ کے علاوہ بھی کوئی شخص ان مراحل سے گزرتا تو اسی قسم کی تخلیقی سرگرمیاں اور اسی قسم کے شعری سرمایے سے نوازا جاتا۔ یہ اعزاز صرف غالبؔ کو حاصل ہونا تھا جو مغربی تہذیب و تمدّن کے اس نئے مرکز کلکتے گئے تو اپنی تمام تر شخصی اور تمدّنی وراثتوں کے ساتھ اور اپنے خاص مزاج اور اندازِ نظر کے ساتھ اور اسی لیے مغرب کی کلکتے میں نظر آنے والی جھلک سے انھوں نے جو اثر قبول کیا وہ دوسروں سے مختلف تھا۔ حد یہ ہے کہ ان اُردو شعرا سے بھی یکسر مختلف تھا جو کہ دوسرے علاقوں سے آئے تھے مگر کلکتے میں ہی آکر آباد ہو گئے تھے۔

یہاں صرف مغربی زندگی کی ہی ایک جھلک موجود نہ تھی بلکہ ان نئی اقدار کا بھی پرتو موجود تھا جو مغرب سے آرہی تھیں اور مشرق میں زندگی کا نیا تصور پیش کر رہی تھیں۔ اس پر غالبؔ کے مضمون سے غالباً متاثر ہو کر سید

سبطِ حسن نے اپنی کتاب 'نوید فکر' کے ایک طویل مقالے میں بحث کی ہے۔ ایک طرف سر سیّد احمد خاں تھے جو مغرب سے خود انگلستان کے سفر کے بعد متاثر ہوئے، اس کی اقدار سے بھی ضرور اثر قبول کیا مگر اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر یورپ کی ظاہری چمک دمک، میز کرسی اور کانٹے چھری اور لباس اور رہن سہن سے زیادہ، اور اقدار سے کم، حد یہ ہے کہ ایجادات واختراعات سے بھی بہت کم، جن کا ذکر غالبؔ کی مثنوی میں مرکزی اہمیت رکھتا ہے، اس کے مقابلے میں غالبؔ ہیں، جن کی پرداخت سر سیّد احمد خاں سے بھی زیادہ قدیم طرز پر ہوئی تھی، مگر جب لندن نہیں، محض کلکتے پہنچتے ہیں تو وہاں کے لباس اور کھانے پینے کے طور طریقوں سے اتنے متاثر نہیں ہوتے جتنے ان دُخانی کشتیوں سے جو سمندر کے سینے پر رواں ہیں یا ان (آج کے لفظوں میں) سائنسی ایجادات سے جو گویا انسان کی فطرت کے منہ زور عناصر پر فتحیابی کا نشان ہیں۔

یہ درست ہے کہ غالبؔ نے علاوہ فارسی مثنوی کے اور بھی جا بجا کلکتے کا ذکر کیا ہے اور اُردو میں بھی چھوٹا سا قطعہ ہے :

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

اور اس میں "بتانِ خود آرا" کا تذکرہ سب سے زیادہ ہے مگر یہ بتانِ خود آرا بھی آزادیِ نسواں ہی کا ایک باب ہیں جن کے نظارے عام ہیں اور ہر نظارے پر عاشقی کی قدغن نہیں ہے۔

احتشام حسین صاحب نے پہلی بار یہ سوال قایم کیا کہ یہ طرزِ نو، جو غالبؔ کی شاعری میں ابھری کیا اس طرز میں کوئی نغمہ مغرب سے اس تمدّنی رابطے نے بھی پیدا کیا تھا اور اگر نہیں، تو پھر غالبؔ کے ہاں سوائے اس نئے احساس کے کیا کوئی دوسرا خارجی محرّک یا محرّکات تھے؟ اسی دائرے کو اور وسیع کر کے وہ اس مقالے میں غالبؔ کے یوروپین دوستوں اور پھر دلّی کالج سے ان کے رابطوں کا تذکرہ بھی کرتے ہیں مگر بنیادی بات کہی جا چکی ہے۔

غالبؔ کے ہاں فکرِ نو کا سراغ لگانے اور اس کے سوتے تلاش کرنے کی یہ کوشش اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ اس سے تحقیقی اور ادبی شعور میں نئی دریافتوں کی شروعات ہوئی۔ اور لطف یہ ہے کہ ہر تحقیق اُردو کے ایک اہم نقاد کے ہاتھوں سر انجام پائی۔

احتشام صاحب کی یہی خصوصیت کم سے کم اُردو کے ایک اور اہم شاعر اور دانشور اقبالؔ کے سلسلے میں بھی قابلِ ذکر ہے۔ اقبالؔ ہمارے ان تخلیقی فن کاروں میں ہیں جو نقادوں کو اس قدر مرعوب کرتے آئے ہیں کہ وہ تنقید کا منصب بھول کر محض مدح سرائی یا حاشیہ آرائی کی سطح پر پہنچ جاتے ہیں، اور ان میں بعض بہت بڑے بڑے نام بھی ہیں، جو اقبال شناسی کے میدان میں آئے تو خود اپنے قد و قامت کو بھی برقرار نہ رکھ سکے اور محض مدح گویا حاشیہ نشین ہو کر رہ گئے۔ کچھ نقادوں نے اس کا تدارک یہ سوچا کہ اقبالؔ پر قلم ہی نہیں اٹھایا۔ البتہ مجنوں گورکھپوری

اور ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے اقبالؔ کے فکر وفن پر سوالیہ نشان انصاف پسندی کی معروضیت کے ساتھ لگانے کی کوشش کی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب یوسف حسین خاں کی کتاب 'روحِ اقبال' نئی نئی چھپی تھی اور اس کی تعریف و توصیف کا غلغلہ آسمان تک پہنچ رہا تھا۔ اس کتاب پر ایک کسی قدر تفصیلی تبصرہ اور پھر اسی سلسلے کا ایک اور مضمون احتشام صاحب نے لکھا اور پہلی بار تنقیدِ اقبال کے ضمن میں بعض بنیادی سوال اٹھائے۔

اقبال کے بارے میں دو رویئے ان دنوں دیارِ لکھنؤ میں عام تھے: ایک تو پیارے صاحب رشید سے منسوب تھا کہ انھوں نے اقبالؔ کا اُردو کلام خود ان کی زبانی سننے کے بعد ان سے فرمایش کی کہ کچھ اُردو میں بھی لکھا ہوتو عنایت ہو۔ گویا یہ سارا کلام تو فارسی زدہ تھا۔ دوسرا وہ رویہ جس کا نہایت سوقیانہ اظہار بعد میں یگانہ چنگیزیؔ کے ہاں ہوا۔ یہ گویا اقبالؔ سے مرعوبیت کا دوسرا ردِ عمل تھا۔ 'روحِ اقبال' میں البتہ اقبالؔ کے مطالعے کا ایک اور پہلو سامنے آیا تھا جو عملی زیادہ تھا اور ادبی کم۔ توصیفی زیادہ تھا تنقیدی کم۔ مگر کچھ اس کتاب کی ہیبت، کچھ مصنف کے طرزِ استدلال کا وزن، کچھ اقبال کی شخصیت کا دبدبہ کہ جو تنقیدیں یا تبصرے بھی سامنے آئے وہ محض توصیفی تھے۔ احتشام صاحب نے اس کتاب سے متاثر ہوکر ایک چھوڑ دو مضامین لکھے اور ان مضامین میں جو مباحث اٹھائے انھوں نے نہایت غیر جذباتی انداز میں اور مدلّل پیرائے میں اقبال کے فکر وفن پر بعض بنیادی استفہامیے قایم کیے: مثلاً اقبالؔ 'شکوہ' سے لے کر آخری دور تک، مومن کے لفظ کو دو الگ الگ معنوں میں استعمال کرتے آتے ہیں۔ ایک سے مراد وہ لوگ ہیں جو مسلمان گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں، دوسرے وہ ہیں جو مسلمان گھرانوں میں تو پیدا نہیں ہوئے اور نہ عقیدے کے لحاظ سے مسلمان ہیں مگر خودی کے اس جوہر سے متصف ہیں جو اقبالؔ کے نزدیک ارتقائے حیات کی ضمانت ہے۔ اور یہ دونوں تضاد خود اقبالؔ کے کلام میں ملتے ہیں۔ 'جوابِ شکوہ' میں واضح طور پر کہا گیا ہے:

مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور

تو کیا ''کافر'' بھی مسلم آئیں ہوسکتا ہے؟ اور اگر ہوسکتا ہے تو پھر کافر کیوں ہے؟ اس کے علاوہ خواتین کے تصوّر کے بارے میں بھی بعض استفہامیے احتشام صاحب نے اس تبصرے میں قایم کیے ہیں۔ اقبالؔ کے ہاں عورت کا تصوّر، اس کے اختیارات اور حقوق کیا ہیں۔ یہ سوال خاص طور پر اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اقبالؔ نے 'ضربِ کلیم' میں پورا ایک حصہ عورت کے عنوان پر ترتیب دیا جس میں مرا فرنگ ایک سوال، پردہ، خلوت، عورت، آزادیِ نسواں، عورت کی حفاظت، عورت اور تعلیم اور عورت جیسی مختصر نظمیں شامل ہیں۔ ان سب سے فکرِ اقبال کا یہ نکتہ ہی واضح ہوتا ہے کہ:

کیا چیز ہے آرایش و قیمت میں زیادہ
آزادیِ نسواں کہ زمرّد کا گلو بند

پھر خودی کے بارے میں بھی اقبال کی یہ جھجک کہ یہ نعمت جو انسان کے لیے مخصوص ہے مکالماتِ

فلاطوں نہ لکھ سکنے والی اس ہستی کے لیے مقدر نہیں ہے۔ جس کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں۔

اس کے علاوہ بھی کئی سوالات ہیں جو اقبال پر ان دونوں مضامین میں اٹھائے گئے ہیں، مگر اہمیت اس بات کی ہے کہ اقبال کے طلسم سے آزاد ہونے کی اردو تنقید میں یہ چند گنی چنی کوششوں میں ہے، جنھوں نے تنقید کو محض حاشیہ نشینی سے آزاد کر کے اسے خود اعتمادی اور فکری صلابت بخشی۔

اسی ضمن میں ذرا پہلے کے مضمون نظیر اکبرآبادی کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ بلاشبہ مجنوں گورکھپوری نے نظیر اکبرآبادی کے قد وقامت کا جائزہ لے کر اس کے مرتبے کا نئے سرے سے تعین کیا تھا مگر احتشام حسین نے نظیر کو جس معروضی نظر سے دیکھا اور دکھایا وہ مختلف ہے۔ مجنوں کا مضمون محض توصیفی ہے مگر احتشام صاحب نے ذرا آگے بڑھ کر نظیر کی شاعری کی عوامی قدر و قیمت کا اعتراف کرتے ہوئے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ اسے جمہوری مزاج کا آئینہ دار کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ جبکہ نظیر کے زمانے میں سلطانی جمہور کا سرے سے کوئی تصور موجود نہیں ہے۔

احتشام صاحب کی تجزیاتی نظر کا اندازہ ان مضامین سے کہیں زیادہ فانی اور حسرت موہانی پر ان کے مضامین سے ہوتا ہے یہ دونوں کلاسیکی طرز کے شعرا ہیں جنھوں نے غزل کو نئے سرے سے زندگی بخشی۔ ان دونوں فن کاروں کے بارے میں یہ مضامین محض توصیفی یا محض خوش عقیدگی پر مبنی نہیں ہیں۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ ان کے فن میں ان کی اپنی شخصیت کی حدیں تلاش کی جائیں اور ان حدود میں یہ کس قدر نئی اقدارِ حیات سے خود کو ہم آہنگ کرتے ہیں اسے واضح کیا جائے۔

اور اس کوشش میں احتشام صاحب نے ادبی تنقید کا دائرہ بہت وسیع بلکہ ہمہ گیر کر دیا ہے۔ کبھی کبھی انھیں قلق ہوتا تھا کہ وہ فراق گورکھپوری جیسی زبان اپنی تنقیدوں میں استعمال نہیں کرتے کہ ایک بار سننے یا پڑھنے والے کی زبان سے بے ساختہ واہ نکل جائے، پھر شاید غور کرنے پر اس قدر جلد اپنا ردِ عمل ظاہر کرنے پر قلق ہی کیوں نہ ہو مگر سچ یہ ہے کہ ان کی بنیادی وفاداریاں نفسِ مضمون اور طرزِ احساس اور اصولِ نقد سے تھیں اور انھیں وہ پوری سچائی، دیانتداری کے ساتھ اور سجاوٹ بناوٹ کے بغیر جوں کا توں ادا کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے طرزِ بیان کی آراستگی اور عبارت کی سجاوٹ اور بناوٹ سے بے نیاز وہ بے تکلف اپنی بات کہتے ہیں اور اس انداز سے کہتے ہیں کہ پڑھنے والے کی نظریں اسی بات پر مرکوز رہیں، ادھر اُدھر آرائش و زیبائش میں بھٹکنے نہ پائیں۔

البتہ اُن کے پیشِ نظر یہ ضرور رہتا ہے کہ تجزیہ کیا ہے۔ منصفانہ کیوں نہ ہو وہ ایسے الفاظ میں ضرور پیش کیا جانا چاہیے کہ جس پر تنقید کی جا رہی ہے اسے بھی گراں نہ ہو۔ یہ خوبی اُن کے پیرایۂ اظہار کی ہے جس میں قطعیت ہے مگر جارحیت نہیں۔ وقار ہے دشنام طرازی نہیں۔

زمانے کی تنقید سب سے بڑی تنقید ہے، نظیر اکبرآبادی کو مدتوں بعد یاد کیا جانے لگا۔ احتشام حسین کی تنقیدی خدمات بھی اپنا خراج پڑھنے والوں سے وصول کر رہی ہیں۔ احتشام حسین صاحب کی سب تحریریں شاید یکساں طور پر زندہ نہ رہیں۔ کسی مصنف کی بھی سب کاوشیں ابدی اور دائمی شہرت حاصل نہیں کرتیں، مگر ادب کی

تفہیم کے جو چراغ انھوں نے جلائے ہیں اُن کی روشنی دیر تک اور دور تک دائرے بناتی چلی جائے گی اور عین ممکن ہے کہ ان سے نئی بصیرتیں اور نئی آگاہیاں حاصل ہوں :

شاید کبھی افشا ہو نگاہوں پر تمھاری
ہر سادہ ورق جس میں سخن کشتۂ خوں ہے
شاید کبھی اس گیت کا پرچم ہو سرافراز
جو آمدِ صرصر کی تمنا میں نگوں ہے

(فیض)

.........☆.........

احتشام حسین کی تنقیدی شخصیت

● پروفیسر شمیم حنفی

میرے پاس احتشام حسین کی ایک پرانی سوانحی تحریر ہے، باریک ہلکے کاغذ پر، انگریزی میں ٹائپ کی ہوئی۔ اُس پر اخیر میں، احتشام صاحب کے دستخطوں کے ساتھ، ۷/اپریل ۱۹۵۲ء کی تاریخ دی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ اسٹڈی پلان کا ایک خاکہ بھی ہے، انگریزی میں ٹائپ کیا ہوا، اور اُس کے اخیر میں احتشام صاحب کے دستخط۔ پھر پہلی تاریخ کے تین ماہ بعد کی تاریخ۔ ۷/جولائی ۱۹۵۲ء۔

احتشام نے یہ تحریر امریکہ اور یورپ کے سفر پر روانگی سے پہلے، غالباً اپنی فیلوشپ کی درخواست کے ساتھ پیش کی تھی۔ ذیل میں اس تحریر کے کچھ اقتباسات کا ترجمہ دیا جارہا ہے۔

''۱۹۳۰ء میں، میں الہ آباد گیا تا کہ گورنمنٹ انٹر کالج الہ آباد میں داخلہ لے سکوں۔ اُن دنوں الہ آباد ہندستان کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ کانگریس نے بدیسی، خاص طور پر انگریزی سامان کے بائیکاٹ کی مہم چلا رکھی تھی اور سول نافرمانی تحریک نے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ فطری طور پر میں نے آزادی اور قومی ترقی کے آدرشوں کی طرف کھنچاؤ محسوس کیا۔ میں ایک چھوٹے شہر سے آیا تھا اور یہ محسوس کرتا تھا کہ کم سے کم عام معلومات کے معاملے میں، میں الہ آباد جیسے بڑے اور بیدار شہر سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کے مقابلے پر نہیں ٹھہر سکتا۔ اپنی اس کمی کی تلافی کے لیے میں اپنا بہت وقت لائبریری اور ریڈنگ رومز میں گزارنے لگا۔ میں اکثر ثقافتی اور ادبی کانفرنسوں میں بھی شرکت کرنے لگا۔ اس سے مجھ میں یہ ہمت پیدا ہوئی

کہ خود بھی لکھنا شروع کروں اور ۱۹۳۲ء کے آس پاس میں ادبی کیریئر کا آغاز ہوا، کچھ نظموں اور افسانوں کے ساتھ یہی سال تھا جب میں نے بی۔ اے پہلے سال میں انگریزی ادب، تاریخ اور اُردو کے (اختیاری) مضامین کے ساتھ الہ آباد یونیورسٹی جوائن کی۔"

●

"میں بہت زیادہ پڑھا کو ہونے اور کتابوں کا بہت دقت طلب قاری ہونے کا دعوا تو نہیں کرسکتا، تاہم اتنا تو کہہ ہی سکتا ہوں کہ میں نے اپنے امتحان کی ضرورتوں سے بالاتر ہوکر، تقریباً تمام مضامین پر کتابیں پڑھیں۔ میری پسند کے مضامین کا سلسلہ ادب سے سماجی علوم تک اور تاریخ، فلسفے اور مذہب سے جنسیات اور تحلیلِ نفسی تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ مطالعہ بہت منظم نہیں تھا اور کسی رہنمائی کے بغیر جاری تھا۔ مگر ۱۹۳۶ء کے آخر میں میرے خیالات ملک میں مروّج قومی اور ترقی پسندانہ رجحانات، یورپ کے اینٹی فاشسٹ میلانات کے اثر سے ایک خاص شکل اختیار کرنے لگے۔"

●

"اپنی کہانیوں، یا ڈراموں اور ادبی مضامین میں، میں نے اپنے ملک اور بدیسوں میں جاری جدّ وجہد، نیز ایک نہایت پُر پیچ اور کُھر درے انداز میں اپنے لوگوں کو جمہوری ترقی کے لیے ظاہر کرتی ہوئی آرزومندی کا تجزیہ کرتے اور اس کے اصل مزاج کو سمجھنے کی کوشش کی۔ میری تحریروں کا خاص مقصد سماجی طور طریق، عوام کے مختلف حلقوں کی زندگی میں اُس کے متنوع اظہارات کا تجزیہ کرنا اور اُسے حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کرنا تھا۔ میں وثوق کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا کہ کن مصنفوں اور مفکرّوں نے اس منزل پر میری رہنمائی کی، مگر (اتنا ضرور ہے کہ) زندگی کے بدلتے ہوئے اور بنتے ہوئے خاکوں سے خود کو ہم آہنگ رکھنے کی خاطر، میں ہر طرح کی کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔"

●

"اپنی تمام تحریروں میں، وہ تخلیقی ہوں یا تنقیدی، میں نے ہمیشہ اس امر کو ملحوظ رکھا ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے لیکن زندگی کی یہ عکاسی محض بے اختیارانہ نوعیت کی نہیں ہوتی۔ ادب کا استعمال اعلا انسانی مقاصد کی حصولیابی کے لیے بھی کیا جاسکتا ہے۔ میں اس بات میں یقین رکھتا ہوں کہ انسان خلقی طور پر شر پسند نہیں ہے۔ حالات اُسے ایسا بنادیتے ہیں اور اگر ہم زندگی کو اس طرح قابو میں رکھ سکیں کہ ہر قوم اپنے آپ

کو مسرور و محفوظ سمجھنے لگے، تو کوئی بڑی جنگ نہیں ہوگی۔ میں ایک طرح کی انسان دوستانہ بین الاقوامیت میں یقین رکھتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ تمام زمانوں میں اور تمام ملکوں میں، تمام اچھے انسانوں نے اپنے اپنے طریقے سے اور اپنی مخصوص حدوں میں رہتے ہوئے، اسی نصب العین تک رسائی کی جدّ و جہد کی ہے۔ اس طرح میرا ادب کا تجزیہ، چاہے معاصر ادب کا ہو یا ماضی کے ادب کا، ایک سماجیاتی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کے احاطے میں زیرِ بحث دور کے تمام سماجی سیاسی، تاریخی اور نظریاتی عوامل آ جاتے ہیں۔ میں نے اس حقیقت پسندانہ طریقِ کار کو سب سے زیادہ اطمینان بخش پایا ہے اور یہ دیکھ کر مجھے تشفی ہوتی ہے کہ یہ طریقِ کار جس کی تعمیر میں کچھ حد تک میری کوششیں بھی شامل رہی ہیں، آج مقبول ہو رہا ہے۔''

●

''ان دنوں، میری دلچسپی کئی کلچرل کاموں میں ہے لیکن سوائے پڑھنے پڑھانے اور لکھنے کے ایسا کوئی کام نہیں جسے میں اپنا مشغلہ کہہ سکوں۔ میرے وقت کا بیشتر حصہ اسی کی نذر ہوتا رہا ہے اور میرا خیال ہے کہ چوں کہ مجھ میں اور کسی قسم کی طلب نہیں اس لیے آئندہ بھی میں سب یہی کچھ کرتا رہوں گا۔''

●

ان اقتباسات میں جو باتیں کہی گئی ہیں اور اُن سے احتشام حسین کی مجموعی ذہنی ساخت، پس منظر اور طرزِ فکر کے بارے میں جو اطلاعات بہم پہنچتی ہیں اُنھیں مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ جس دور میں احتشام حسین کے شعور نے ایک واضح شکل اختیار کی، وہ قومی آزادی کی جدّ وجہد کا دور تھا۔

۲۔ احتشام حسین ایک روایتی، خاموش اور قدامت پسند ماحول سے نکل کر ایک نسبتاً کشادہ، ترقی پذیر اور سرگرم ماحول تک پہنچے تھے۔

۳۔ اُردو ادب، انگریزی ادب اور تاریخ کے اختیاری مضامین سے قطع نظر، احتشام حسین کی دل چسپی مختلف سماجی علوم، فلسفے، مذہبیات اور جنسیات میں تھی۔

۴۔ ۱۹۳۶ء یعنی ترقی پسند تحریک کے سَن آغاز کے ساتھ احتشام حسین کے خیالات میں ایک واضح ارتقا کے نشانات رونما ہوئے۔ ترقی پسندانہ لہجہ اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ قومی اور بین الاقوامی سطح پر پیدا ہونے والے سیاسی اور سماجی مسئلوں کی طرف اُن کی توجہ بڑھتی گئی۔

۵۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے بعد بھی احتشام حسین کے مطالعے نے کوئی معینہ اور ادعائی رُخ

نہیں اپنایا۔ زندگی کے آ میر پذیر اور ارتقاپذیر میلانات سے خود کو متعلق رکھنے کے لیے احتشام حسین نے مختلف النوع علمی اور فکری دائروں سے اپنی دلچسپی برقرار رکھی۔

۶۔ احتشام حسین کے نزدیک ادب زندگی کا ترجمان محض نہیں، زندگی کو بدلنے اور بنانے کا ایک موثر وسیلہ بھی ہے۔

۷۔ انسان کی بنیادی نیکی میں احتشام حسین کا یقین پختہ ہے اور انسانی معاشرے پر اس نیکی کے تسلط کو وہ اپنا اجتماعی نصب العین سمجھتے ہیں۔ ادب بھی اس نصب العین کی حصولیابی کا ایک ذریعہ ہے۔

۸۔ احتشام حسین مختلف معاشروں اور قوموں کے انفرادی تشخص پر زور دیتے ہیں اور اس تشخص کو وسیع تر بلکہ بین الاقوامی انسانی مقاصد کی تکمیل کے راستے میں رکاوٹ نہیں سمجھتے۔

۹۔ احتشام حسین کا تنقیدی اور تفہیمی رویہ بنیادی طور پر سماجیاتی ہے اور اسی رویے کو وہ اپنے عہد کے مزاج سے ہم آہنگ خیال کرتے ہیں۔

۱۰۔ علوم اور ادبیات کا مطالعہ احتشام حسین کے لیے ایک کُل وقتی مشغلہ ہے اور ذہنی، جذباتی آسودگی کے حصول کا واحد ذریعہ۔ پڑھنے پڑھانے اور لکھنے کے علاوہ وہ اور کسی قسم کی طلب نہیں رکھتے۔

یہ نکات احتشام حسین کی جس تحریر سے ماخوذ ہیں اور یہ تحریر جس وقت مرتب کی گئی، اس سے پہلے احتشام حسین کے تنقیدی مضامین، تین مجموعوں کی شکل میں، سامنے آچکے تھے۔ پہلا مجموعہ 'تنقیدی جائزے' جس کا سالِ اشاعت ۱۹۴۴ء ہے۔ اس کے بعد 'روایت اور بغاوت' ۱۹۴۷ء میں اور 'ادب اور سماج' ۱۹۴۸ء میں سامنے آئے۔ ترقی پسند تحریک اس وقت تک ہمارے فکری معاشرے میں میں اپنے قدم اچھی طرح جما چکی تھی۔ کچھ تو نظریاتی اذعائیت اور کچھ ابتدائی مراحل میں مقبولیت اور کامرانی کے نشہ اور احساس نے ترقی پسند ادیبوں کی اکثریت کو انتہاپسندی اور عدم توازن کے جس عام مرض میں مبتلا کیا تھا احتشام حسین بڑی حد تک اس سے محفوظ رہے۔ اس عہد کے کئی بزرگ ادیب، مثلاً مجنوں، اعجاز حسین، فراق، اپنی روشن خیالی، ترقی پسندی سے اپنی ذہنی قربت کے باوجود اس انتہاپسندی سے محفوظ جو رہے، تو اس کی وجہ یہ تھی کہ کلاسکیت کا احترام اور اپنی ادبی روایت کے تسلسل کا احساس انہیں قابو سے باہر نہیں ہونے دیتا تھا۔ احتشام حسین ادبی ترقی پسندی کے علاوہ جمالیاتی مادّیت اور کمیونسٹ انقلاب سے بھی متاثر تھے، مگر تاریخ کے عمل سے آگہی نے انھیں اپنی روایت کے تسلسل کا اور فلسفہ، نفسیات، مذہبیات کی بخشی ہوئی بصیرت نے انھیں انسانی تجربوں کی ہمہ جہت سچائی کا ایک ایسا شعور عطا کیا تھا جس میں فیشن ایبل اور مقبولِ عام قسم کی ترقی پسندی کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسعت تھی۔ غالی ترقی پسند آج ہی کی طرح اُس زمانے میں بھی دو اور دو چار قسم کی باتیں کرنے کے عادی تھے اور سماجی زندگی کے عام معیاروں کی طرح ادب کی معیار بندی کے معاملے میں بھی خاصے سادہ لوح تھے۔ اپنی ادبی روایت کی طرف ماضی کے معاشرتی تصورات اور اقدار کی طرف اُن کا رویہ کسی سوچی سمجھی بغاوت سے زیادہ ایک طرح کی بھیڑ چال اور

جذباتی اشتعال کا تھا۔ چنانچہ ادب اور انقلاب، جاگیردارانہ عہد کی ادبی وراثت، حتیٰ کہ اُس پورے دور پر سایہ فگن شاعری کی سب سے مستحکم اور دوررس آواز (اقبال) کے بارے میں عام ترقی پسندوں نے جس رائے کا اظہار کیا وہ آخر کو بے اعتبار ٹھہری۔ گنتی کی استثنائی صورتوں سے قطع نظر اس دور کی ترقی پسند تنقید جس زبان میں گفتگو کرتی ہے اور ادب کی تحسین و تعبیر کے لیے جن اصلاحوں سے کام لیتی ہے وہ مضحکہ خیز حد تک غیر علمی اور عامیانہ تھیں۔ احتشام حسین کی تنقید نہ صرف یہ کے اس وبائے ابتذال سے یکسر محفوظ رہی اس نے علمی مطالعے کی سنجیدگی، وقار اور وسعت کا ایک ایسا معیار قائم کیا جو آج بھی قابلِ قدر ہے اور ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔

احتشام حسین نے عام ترقی پسندوں کے برعکس گزشتہ ادوار کے ادب کو سرے سے قلم زد کرنے کی بجائے، نئے علوم اور نئے تہذیبی و معاشرتی تصورات کی روشنی میں اسے ایک نئی سطح پر سمجھنے کی کوشش کی۔ حالی اور پیروی مغربی کی بحث میں اُن کا اختلاف مولانا اختر علی تلہری اور مسعود حسن رضوی ادیب جیسے پرانی چال کے بزرگوں سے ہوا اور وجہِ نزاع یہ سوال ٹھہرا کہ 'حالی آؤ پیرویِ مغربی کریں' میں مغربی سے مراد ایران کا صوفی نژاد شاعر مغربی تبریزی ہے یا مغربی دنیا کے نئے چلن۔ ہر چند کہ احتشام حسین کا موقف اس معاملے میں روایت کے پاسداروں سے مختلف تھا، مگر اپنے مقدمات کی دلیلیں کھُل کر پیش کرنے کے باوجود، احتشام حسین نے اپنی روایت یا ادب کے روایتی تصوّر کی بابت کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے تضحیک کا پہلو نکلتا ہو۔ اُس زمانے میں پوری دنیا کا ادبی معاشرہ کچھ نئے سوالوں سے دوچار تھا۔ آندرے مالرو نے جو ترقی پسندی کے ابتدائی دور میں اس تحریک کے باقاعدہ ترجمان تھے، چند برس بعد ہی یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ ادب میں انسانی نقطۂ نظر کے قیام کی خاطر ہمیں ایک تو زندگی کے المیہ تصوّر پر غور کرنا ہوگا دوسرے انسانیت دوستی کے تصوّر پر۔ اور مالرو کے نزدیک یہ دونوں تصوّر ایسے اہم تھے کہ انسانی صورتِ حال اور انسانی امکانات، دونوں پر سوچ بچار کے بعد ہی اپنے آج اور آنے والے کل کا کوئی خاکہ ذہن میں مرتب کر سکتے ہیں۔

احتشام حسین کی تحریروں میں انسانی امکانات اور مستقبل سے مایوسی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا، تاہم اُن کی شخصیت میں ملال کا عنصر اور اُن کے مضامین سے سطحی نشاط پرستی کی جگہ انسانی صورتِ حال کو ایک فلسفیانہ سطح پر سمجھنے کی جستجو بہت نمایاں ہے۔ انھوں نے ادب میں قنوطیت اور رجائیت، امید اور ناامیدی، تعمیر اور تخریب کی حقیقت کو لکھنے والے کے سوانحی سیاق کے ساتھ ملا کر ایک تاریخی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی اسی لیے اُن کے ہاں کسی منفی تصوّر کو صرف اس کی منفیت کے باعث مسترد کرنے کا میلان تقریباً ناپید ہے۔

میرے ساتھ فیض پر ایک مکالمے میں (فیض نمبر، افکار کراچی ۱۹۶۵ء) احتشام صاحب نے فرمایا تھا:

''جس زمانے میں بعض ترقی پسند شاعری کے فنّی پہلوؤں کو کسی حد تک نظرانداز کر رہے تھے، اُس وقت بھی فیض نے اُنھیں اہمیت دی۔ چنانچہ 'ادبِ لطیف' کی ادارت کے زمانے میں وہ رسالہ کسی تحریک کے انتہا پسند نقطۂ نظر کا ترجمان بننے کے بجائے اچھے جدید ادب کا نمائندہ بنا رہا۔''

اسی مکالمے سے احتشام صاحب کی کچھ اور باتیں:

''(فیض کے یہاں) معروض اور موضوع کا سارا جوش وخروش نغمہ ورنگ بن جاتا ہے اور بقدرِ احساس ہی دل کو چھوتا ہے۔ اس کو علامات کا فنی استعمال بھی کہہ سکتے ہیں کیوں کہ علامتیں جب تک شخصی اور اجتماعی، دونوں حدوں کو نہیں ملالیتیں، ایک مبہم تاثر سے آگے نہیں بڑھ سکتیں۔''

●

''میرے خیال میں کسی دوسرے شاعر نے اتنے گہرے شعور کے ساتھ رومانیت اور کلاسکیت کو ایک کرنے کی کوشش نہیں کی جتنی فیض نے اور یہ سب کچھ کسی مصنوعی انداز میں نہیں بلکہ اپنی ادبی روایات اور تہذیبی اقدار کے صحیح احساس اور اپنے عہد کے تقاضوں کے صحیح ادراک کے نتیجے کے طور پر۔''

''(میر اور سودا کے باب میں فیض کے خیالات کے حوالے سے) فیض کے یہاں جو غم انگیزی اور میر کی سی دھیمی کیفیت ملتی ہے۔ تشنہ کامی کا جو احساس ملتا ہے، ہوسکتا ہے سودا کے کلام کے مطالعے سے اُنھیں اُس کی آسودگی کا سامان مل جاتا ہو۔ اور سودا کے یہاں نشاط کی جو کیفیت نظر آتی ہے اُس میں فیض شاید اپنی ناتمام خواہشوں کی منزل پالیتے ہوں۔''

●

ترقی پسندی سے نظریاتی وابستگی، انسانیت کے ایک مثبت تصور اور زندگی کی مادی بنیادوں میں یقین کے باوجود احتشام حسین حقیقت کا جو تصور رکھتے تھے، اس سے شخصی ادراک واظہار رومانیت اور روایت شناسی اور انسانی ہستی کے المیہ احساس کی گنجائش ہمیشہ باقی رہی۔ خیال اور تجربے کی طبعی اساس احتشام حسین کے نزدیک کسی انسانی واردات کی کلیت تک رسائی کا ذریعہ نہیں تھی۔ اسی لیے احتشام حسین اپنی تنقیدوں میں بالعموم حکم لگانے، حرف آخر کہنے سے گریز کرتے ہیں۔ کسی واقعے یا وجود کی کسی جہت کو دریافت کرنے کے جو بھی طریقے ہو سکتے ہیں اور اس سلسلے میں علوم اور افکار کے جتنے ذریعوں سے مدد لی جاسکتی ہے اُن میں سے کسی کو بھی وہ نظر انداز نہیں کرتے نہ کسی کی اہمیت اور کارکردگی سے انکار کرتے ہیں۔ تحلیل نفسی، جنسیات، مذہب اور مابعد الطبیعات احتشام حسین کے نظام فکر ہیں، اُن میں کسی کی بھی حیثیت ایک امتناع کی نہیں ہے۔

احتشام حسین میں اور ترقی پسندی کا رسمی تصور رکھنے والوں میں ایک یہ فرق بھی بہت نمایاں تھا کہ احتشام حسین نے اعلا ادب پاروں کی تلاش میں اپنے آپ کو صرف ترقی پسند ادب کی محدود اور تکرار آمیز دنیا کا پابند نہیں رکھا۔ علم اور ادب کے سچے اور غیر مشروط شغف کے بغیر کسی ادیب یا نقاد کے وجدان میں یہ لچک اور شعور

میں یہ وسعت نہیں آتی کہ وہ ہستی کو ہر رنگ میں دیکھ سکے اور حقیقت کو ہر شکل سے قبول کر سکے۔ نظریاتی عصبیت اور اسی کے ساتھ ساتھ ادب کو ادب کی طرح پڑھنے کے بجائے اسے اجتماعی زندگی کے لیے ایک طرح کی کھاد سمجھتے رہنے کی وجہ سے خاصے تعلیم یافتہ ترقی پسندوں میں سے بھی دنیا کے بہترین ادبی شہ پاروں سے ایک مستقل گریز اور دوری کا رویّہ ملتا ہے۔ مثال کے طور پر سجاد ظہیر اور فیض تو میراجی کی بصیرت اور تخلیقی زرخیزی کی داد دے سکتے تھے، مگر بہتوں کو ایک زمانے تک دستوئیفسکی کا نام لینے میں بھی جھجک ہوتی تھی۔ نفسیات، مابعد الطبیعات، سرّیت، تصوّف کے مضامین اور اشاریت تو خیر سرے سے ٹاٹ باہر تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی پسند تنقید کا جو سرمایہ سامنے آیا، اس کی بنیاد میں تاریخ کے ایک عامیانہ تصور سیاسیات واقتصادیات کی اصطلاحوں سے آگے کسی اور بصیرت کا سراغ مشکل سے ہی ملتا ہے۔ اور جب ادیبوں کے حوالے سے یہ تنقید اپنی دلیل استوار کرتی ہے اُن میں دوسرے اور تیسرے درجے کے لکھنے والوں کی بھر مار ہے۔ اس سلسلے میں یہ حقیقت بھی بھلا دی گئی کہ خود مارکس اور انگلز یا ترقی پسند نظریۂ ادب کے غیر روایتی مفسّرین ادب کی تخلیق وتعبیر کے جن اصولوں کو درست سمجھتے تھے ہمارے یہاں کی ترقی پسندی اُن سے اگر کوئی نسبت رکھتی تھی تو بس دور کی۔ مارکس اور اینگلز سے قطع نظر ،ارکسزم کو ایک نظریۂ زندگی کے طور پر قبول کرنے والے اور آرٹ، ادب کی سچّی اور مخلصانہ فہم رکھنے والے پھر بھی غالی ترقی پسند حلقوں میں Revisionist (اردو کے ترقی پسندوں کی زبان میں تحریف پسند) کہے جانے والے نقادوں کے یہاں عالمی ادب کے جن مشاہیر کا جا بجا ذکر ملتا ہے، اُس کے مقابلے میں اردو کی ترقی پسند تنقید کے ہیروز پر ایک نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ نظریاتی جبر اور ادّعائیت بصیرتوں پر کیسے کیسے ستم ڈھاتی ہے۔ احتشام حسین کی تنقید جو الگ سے پہچانی جاتی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے بالعموم انھیں ترجیحات کو اپنے فیصلوں پر اثر انداز نہیں ہونے دیا۔ رومانیت، کلاسکیت، سریّت، مذہبیت احتشام حسین کے نظامِ احساس میں اپنی ایک مخصوص جگہ رکھتی تھی، مارکسی جمالیات سے انھوں نے ادب کی تعبیر و تفہیم کے ایسے اصول اخذ کیے جو روایت سے اُن کے رشتے کو کمزور نہیں کرتے، غیر ترقی پسندانہ یا غیر طبعی طرزِ فکر اور تجربوں کو مسترد نہیں کرتے۔ محمد حسن عسکری نے اپنے تقریباً اسی دور کے ایک کالم میں (ساقی فروری ۱۹۴۵ء) ای۔ ایم۔ فورسٹر کی ایک تقریر کا حوالہ دیا ہے۔ اس تقریر کے چند جملے حسب ذیل ہیں:

> ''انسان کو غیر مرئی چیزوں کی ضرورت ہے۔ وہ صرف روٹی کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ ترقی کرتا ہوا، دوسرے جانوروں سے بہت دور جا پہنچا ہے کیوں کہ اُسے غیر مادّی چیزیں بہت دل کش معلوم ہوتی ہیں کیوں کہ ایسی چیزوں کو سمجھنا چاہتا ہے جو بیکار ہیں (یعنی فلسفہ) یا وہ ایسی چیزیں بنانا چاہتا ہے جو بیکار ہیں (یعنی ادب اور آرٹ)۔''

●

''آرٹسٹ بڑے جھگڑے کی چیز بن سکتا ہے اور وہ شاید ہی کہیں ٹھیک بیٹھتا

ہے۔ اگر وہ بڑا آرٹسٹ ہے تو اپنے زمانے کا نمائندہ ہو سکتا ہے لیکن اپنے زمانے کا نمائندہ بن سکنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اُس زمانے میں ٹھیک بھی بیٹھتا ہو۔''

(بہ حوالہ 'جھلکیاں'۔ ص ۲۷۔۱۳۶)

اسی لیے اور تو اور خود روس کے ادیبوں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے متاثر ادب کے مقابلے میں دوسری جنگ کے پیدا کردہ ابتری اور انتشار کے ملبے سے ظہور پذیر ہونے والے ادب کی بابت زیادہ خوش گمان تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ لڑائی چوں کہ انسانیت کی تاریخ میں اس وقت تک کی سب سے بڑی لڑائی ہے، اس لیے اُس کے سائے میں سانس لیتی ہوئی حقیقتوں سے جو ادب پیدا ہوگا، وہ بھی سب سے بڑا ہوگا۔

احتشام حسین نے اس ادب کی طرف جو رویہ اختیار کیا اُس کی تفصیل ایک علاحدہ تجزیے کی طالب ہے۔ البتہ دو باتیں اس موقعے پر کہی جا سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ احتشام حسین نے نئی نفسیات، نئی اخلاقیات، نئی حقیقت پسندی کی فکری احساس فراہم کرنے والے تصورات کو سمجھنے کی کوشش کی اور عام ترقی پسندوں کی طرح اُن کے نام سے بدکے نہیں۔ دوسرے یہ کہ انسان میں غیر مرئی چیزوں کی طلب سے انھوں نے انکار نہیں کیا اور غیر مارکسی تجربوں کے حوالے سے بھی انسانی ہستی کے اسرار سمجھنے کی کوشش جاری رکھی۔ ادب اور روحِ عصر کی نمائندگی کا مفہوم اُن کی نظر میں صرف یہ نہیں تھا کہ تاریخی طاقتوں کے ترجمان ادب تک خود کو محدود کر لیا جائے۔ انھوں نے تاریخ اور کسی فرد یا انسانوں کے کسی گروہ میں پیدا ہونے والے تصادم اور ٹکراؤ کو بھی ایک عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ سمجھنا چاہا۔ احتشام حسین کے نظری اور اصولی مضامین ہوں یا عملی اور اطلاقی نوعیت کے مضامین، ان میں ہمیں انسانی رویوں، واردات کے سلسلے میں کسی قسم کا تعصب نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ احتشام حسین کے تنقیدی طریق کار کے نتیجے میں جو باتیں سامنے آئی ہیں اُن سے ہم اتفاق کریں یا اختلاف، اُن کے طریق کار کی ہمہ گیری، وسعت اور اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ انسانی وجود اور واردات کی حقیقت تک پہنچنے کی جیسی گہری طلب، خیال کی جودورَسی اور دبازت اور مختلف النوع علمی اور فکری ضابطوں کو اپنی جستجو سے ہم آہنگ کرنے کا جو سلیقہ اور صلاحیت ہمیں احتشام حسین کی تنقیدوں میں ملتی ہے، وہ انھیں ترقی پسند تنقید میں اور اپنے عہد کی تنقید میں یکساں طور پر ممتاز کرتی ہے۔

احتشام حسین کے تنقیدی رویّے

● پروفیسر ابوالکلام قاسمی

اُردو میں نصف صدی قبل کا تنقیدی منظر نامہ آج سے خاصا مختلف تھا۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز سے قبل حالی اور شبلی کے تنقیدی تصوّرات اور رویّے اتنی اہمیت حاصل کر چکے تھے کہ اُن دونوں نقادوں کے خیالات کو حوالہ بنائے بغیر بالعموم منطقی اور مربوط تنقید لکھنے کے سلسلے کو آگے بڑھانا مشکل معلوم ہوتا تھا، جب کہ ترقی پسند تحریک کے ساتھ جس تصوّرِ شعروادب کو اپنانے اور اطلاق کرنے کا رجحان سامنے آیا وہ گو کہ اُردو کی اپنی روایت کے لیے قدرے نامانوس تھا مگر علمی اور نظریاتی سیاق وسباق نے اس تصوّرِ شعروادب کو بھی بہت جلد رائج اور مقبول کر دیا۔ ان دو رویّوں سے الگ ایک رجحان وہ تھا جسے ہم تاثراتی تنقید کے رجحانات کا نام دیتے رہے اور بعض ایسے نقادوں کو بھی جو تاثراتی نہ تھے ان مقبول عام دو رویّوں سے الگ ہونے کے باعث تاثراتی تنقید کے ہی خانے میں رکھا جاتا تھا۔

ایسی تنقید میں رومانی رویّوں کی نمائندگی کرنے والی تنقید بھی تھی اور خالص تخلیقی انداز کی وہ تنقید بھی جو تخلیقی بازیافت کی طرف مائل نظر آتی تھی۔ پروفیسر احتشام حسین، آل احمد سرور، کلیم الدین احمد، محمد حسن عسکری، اختر حسین رائے پوری وغیرہ کی تنقیدی سرگرمیوں کے آغاز اور ارتقا کا یہ زمانہ اسی فکری روایت اور ادبی سیاق و سباق کی مدد سے زیادہ بہتر طریقے پر اپنی شناخت متعین کرتا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ حالی اور شبلی سے، مابعد کی تنقید نے کیا استفادہ کیا اور حالی کی منطقی اور استدلالی تنقید اور شبلی کے تجزیاتی اندازِ نقد کا سلسلہ کیوں کر، اور کن تبدیلیوں کے ساتھ آگے بڑھا، یا تاثراتی طرزِ تنقید کو کس حد تک قابلِ قبول تنقیدی رجحان کی حیثیت حاصل ہوئی؟ اُردو تنقید کے عمومی ارتقاء پر لکھے جانے والے کسی مضمون

میں ان سوالات کا جواب دیے بغیر بات آگے نہیں بڑھائی جا سکتی۔ یہ مضمون چوں کہ احتشام حسین کے تنقیدی رویّوں پر مبنی ہے اس لیے ضمنی طور پر ان میں سے بعض سوالوں سے بحث کرنے کے باوجود صرف ان ناگزیر باتوں سے سروکار رکھا جائے گا جو اس موضوع کے تناظر کو واضح کرتی ہیں۔

احتشام حسین، اُردو کے ممتاز نقّاد اور دانشور کی حیثیت سے اپنی مخصوص پہچان رکھتے ہیں۔ دانش ور کی حیثیت سے اس لیے کہ انھوں نے اپنی تنقیدی تحریروں میں علمی، بلکہ بین العلومی پس منظر کو اپنی تفہیم کے وسیلے کے طور پر استعمال کیا، اور جہاں تک ان کی ناقدانہ حیثیت کا سوال ہے تو انھوں نے سماجی علوم اور دوسرے متعلقاتِ ادب کی بحثیں چھیڑ کر عملی طور پر ادب و شعر کے خود مکتفی تصوّر کی نفی کی۔ اس بات کو دیکھنے کے دو تناظر ہو سکتے ہیں: پہلا تو یہ کہ اس طرح کی تنقید کو وسعتِ مطالعہ پر ضرور محمول کیا جاتا ہے اور ایسے اندازِ نقد کو توسیعی اندازِ نقد کا نام دیا جا سکتا ہے اور دوسرا تناظر یہ ہے کہ اس نوع کی تنقید میں ادبی مذاق، تفہیم و تحسین اور تجزیاتی طریق کے استعمال کی نوبت کم ہی آتی ہے، اور یہ کہ اس طرزِ نقد میں خود ادب کو براہ راست زیرِ بحث آنے کا موقع برائے نام ہی ملتا ہے۔ احتشام حسین اور ان کی مسلک کے نقّادوں پر غور و خوض کرنے کے یہ دونوں رویّے تنقیدی مضامین کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری اور احتشام حسین نے جس طرح مماثل طور پر مارکسی اندازِ فکر کو اپنی اپنی تنقید میں رائج کیا، اس پر گفتگو کرنے کے لیے ان میں سے کسی ایک نقّاد کے بجائے ان جیسے نقّادوں کے نظریاتی مسائل پر یکساں انداز میں تبصرہ کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے تبصرے میں احتشام حسین کی انفرادی کوششوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے جس حد تک ممکن ہوگا اس مقصد کے حصول کے لیے احتشام حسین کی اپنی تحریروں کو حوالہ بنایا جائے گا اور یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے گی کہ نظریاتی پس منظر کے باوجود وہ ادب کے بنیادی مسائل کے بارے میں کیا نقطۂ نظر رکھتے ہیں، اور اپنے نقطۂ نظر کو کس حد تک کامیابی کے ساتھ ادبی تفہیم اور تحسین کا حصّہ بنانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

احتشام حسین نے تنقید کی ماہیت، اصولِ نقد، ادبی تنقید کی ضرورت اور ماضی کے ادب پر نئے تنقیدی ردِّ عمل کی نوعیت، جیسے اصولی اور نظری مسائل پر متعدد مضامین لکھے ہیں۔ ان مضامین میں انھوں نے تنقید کے منصب اور ادبی تنقید کے مصرف پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، تاہم اگر آپ ان مضامین کی مدد سے اصول و معیار کو نشان زد کر کے الگ کرنا چاہیں تو اس عمل میں آپ کو خاصی دشواریوں کا سامنا ہوگا۔ وجہ، سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ اپنی بات کفایتِ لفظی کے ساتھ بیان نہیں کرتے اور اکثر اپنے موضوع کے پس منظر میں اتنی دور تک کا سفر کرتے ہیں کہ پیش منظر یا موضوع کا ارتکاز اپنی اہمیت کھو دیتا ہے۔ اس کے باوجود اگر ان مضامین کے بنیادی نکات کو ڈھونڈ نکالا جائے تو بعض کارآمد باتیں سامنے آتی ہیں۔ احتشام صاحب اپنے مضمون 'اصولِ تنقید' میں لکھتے ہیں کہ:

''یوں دیکھا جائے تو اصول و ضوابط اور قواعد کی گفتگو کرنے سے پہلے علوم کی پیدائش اور ان حالات کا

جائزہ لینا ضروری ہے جن میں ان کی تخلیق ہوئی۔ان کے ارتقاء کے لیے صورتیں پیدا ہوئیں۔کسی قسم کے اصول کا تذکرہ بعد کے بنائے ہوئے قاعدوں کی روشنی میں کرنا اوران تاریخی پیچیدگیوں کونظرانداز کردینا جن میں اصولوں کی تدوین کرنے والوں نے اُنھیں مرتب کیا ہوگا، تاریخ اور فلسفہ دونوں کے نقطۂ نظر سے غلطی ہوگی۔''

ظاہر ہے کہ اس بیان میں اپنے موضوع: اصول نقد پر گفتگو کرنے سے زیادہ تخلیق کے محرکات وعوامل کی طرف اشارے کیے گئے ہیں اوراس سے مراد تخلیقی عمل ہے تو تخلیقی عمل کارشتہ ماضی کی تاریخی پیچیدگیوں سے جوڑا گیا ہے۔مگرسوال اپنی جگہ برقرار رہتا ہے کہ تاریخی پیچیدگیاں کیوں کرتخلیق کار کے تخلیقی عمل پر اثرانداز ہوتی ہیں؟اورکس طرح تاریخی اورسماجی صورتِ حال، تخلیقی عمل، عمل کا ظاہری حصہ نہ معلوم ہوتے ہوئے بھی، ادبی تخلیق میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے؟ وہ اپنے اسی مضمون میں تنقیدی شعور کی کارفرمائی کی گتھیوں کو آگے چل کر کھولتے ہیں۔

''تنقید منطق کی طرح ہرعلم وفن کی تشکیل اورتعمیر میں شریک ہے، بلکہ وجدان اور جمال کے جن گوشوں تک منطق کی رسائی نہیں ہے، تنقید وہاں پہنچتی ہے، رنگ وبواورکیف وکم کے غیر متعیّن دائرہ میں صرف قدم ہی نہیں رکھتی بلکہ ابہام میں توضیح کا جلوہ اور بےیقینی میں تعیّن کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔اس طرح تنقید کے سلسلے میں جب اصول کی گفتگو کی جائے گی تو طبعی اوراکتسابی علوم کے علاوہ ایک اورایسے علم یاحس سے کام لینے کی ضرورت پڑے گی جوان علوم کے منافی نہ ہوتے ہوئے بھی ان سب کے علاوہ کوئی بات ایسی بھی بتاسکے جس سے فیصلہ میں مدد ملے۔ممکن ہے وہ کئی علوم کے امتزاج کا نتیجہ ہو۔''

تنقیدی اصول بندی کے سلسلے میں ہرچند کہ اس اقتباس سے بھی کوئی واضح بات سامنے نہیں آئی۔اگر کوئی علم، یامخصوص حِس یاحسِ لطیف، ادب پارے کے فیصلے میں معاون ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے تو اس کی وضاحت ھنوز تشنۂ دلیل ہے۔اس بات کا احساس خود مصنف کو بھی ہے، اسی باعث وہ یہ وضاحت کرنا بھی ضروری سمجھتا ہے کہ:

''جس وقت اصولوں کی بات آتی ہے، ہرشخص کسی حد تک قطعیت کا تصور کرنے لگتا ہے۔ادب، سائنس ہو یا نہ ہو، لیکن اسے اپنے اظہار میں حقیقت کے قریب تو ہونا ہی چاہیے۔تنقید اس سے آگے بڑھتی ہے اور گو اسے بھی ایک خاص مفہوم میں سائنس نہیں کہہ سکتے لیکن سچائی کی گفتگو میں وہ سائنس سے بالکل قریب ہوتی ہے۔ایسی حالت میں اگراصول کے اندر بھی بےراہ روی یا بےترتیبی پائی گئی تو انھیں اصول کہنا ہی نہیں چاہیے۔''

احتشام صاحب تنقیدی اصولوں کی قطعیت پرحرف گیری بھی کرتے ہیں اورقطعیت پرمبنی اور منحصر چیز جسے ہم سائنس کہتے ہیں، اس کی ناگزیریت پراصرار بھی کرتے ہیں۔اگرآپ کسی خاص مفہوم میں تنقید کو سائنس نہیں کہتے تو بھلا سچائی کی گفتگو میں وہ سائنس سے قریب ہوکر کون سا فریضہ انجام دیتی ہے۔ظاہر ہے کہ یہ فریضہ ادب پر دوٹوک اور غیر جانب دارانہ فیصلہ صادر کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں، تو بھلا تنقید کی تجزیہ کاری، دقیقہ شناسی

اور تحلیل جیسے طریق ہائے کار کو سائنس کا ہم معنی بتانے سے کیوں احتراز کرتے ہیں، جب کہ آپ ایسے اصولوں کی ترتیب کا ذکر بار بار کرتے ہیں، جن کا انحصار انفرادی ذوق اور اپنی ذاتی پسند و ناپسند پر نہ ہو۔ احتشام صاحب کے بقول ''اصول تو اس لیے بنتے ہیں کہ ان سے دوسروں کی رہنمائی ہو سکے'' تو ایسی صورت میں جس طرح ذاتی تاثرات تنقید کے اصولی منصب کو مجروح کرتے ہیں اسی طرح ذاتی یا گروہی نظریاتی قطعیت بھی اجتماعی اصول بندی کی راہ میں حائل ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تنقید کے مختلف دبستانوں سے وابستگی کا اعلان کرنے والا کوئی شخص آسانی سے اپنے دبستانِ نقد کی اصول بندی تو نظریاتی بنیادوں پر کر سکتا ہے لیکن جہاں کہیں علی الاخلاق ادب کی پرکھ کے اصول وضوابط کو مدوّن کرنے یا معیار وضع کرنے کی بات کی جاتی ہے تو اس ضمن میں مشرق ومغرب کی تنقیدی روایت میں تنقیدی اصولوں کو زیادہ سے زیادہ آزاد اور غیر جانب رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔
احتشام حسین ادبی تنقید کی روایت پر گہری نگاہ رکھتے ہیں اور ان کو بخوبی اندازہ ہے کہ تنقید کا دائرۂ کار کیا ہے اور تنقید کے نام سے لکھی جانے والی کون کون سی باتیں تنقید کے دائرۂ کار میں نہیں آتیں، مگر ان کی مشکل صرف یہ ہے کہ وہ ان بنیادی تعریفوں اور اصولوں میں بھی اپنی سماجی وابستگی کا ذکر ضرور کرنا چاہتے ہیں، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اصول، اصول نہیں رہ جاتے، تعریف تعریف نہیں رہ جاتی، پوری کی پوری تنقید یا ادب کی تفہیم یا پرکھ کے تمام نظریات سماجیات کا لاحقہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے :

''ادب کی حیثیت کو سمجھنا اور ادیب کے ذہنی سرچشموں کا سراغ پانے کی کوشش کرنا، سماج کے ذہنی ارتقا کے مطابق فنی روایات کی توضیح کرنا اور قوم کی تہذیبی زندگی میں ادب اور ادیب کے مقام کا تعین کرنا تنقید کہلاتا ہے۔ گو نقادوں اور ادیبوں کا ایک گروہ تنقید کی اس حیثیت کا منکر ہے اور آج بھی تنقید کو محض تشریح، محض تسکینِ ذوق، اور محض حسنِ بیان سمجھتا ہے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ تنقید محض تشریح یا محض حسنِ بیان کی تلاش کا نام نہیں، لیکن یہ بات بھی تو دوسری طرح کی انتہا پسندی کی نمائندگی کرتی ہے کہ تنقید کے لیے محض سماج کے ذہنی ارتقاء کے مطابق فنی روایات کی توضیح اور محض قوم کی تہذیبی زندگی میں ادب اور ادیب کے مقام کے تعین کو لازمی قرار دیا جائے۔ یہ بات احتشام حسین سے بہتر اور کون جان سکتا تھا کہ اگر فن پارے کے مواد اور سماجی پس منظر کو کوئی اہمیت حاصل ہے تو ہیئت اور اسلوب اظہار کو بھی کوئی کم اہمیت حاصل نہیں۔ ہیئت اور مواد پر احتشام حسین نے متعدد مضامین لکھے ہیں اور نظری طور پر بڑے توازن کے ساتھ دونوں کی ہم آہنگی پر زور دیا ہے، مگر جب وہ تخلیق اور تنقید کے رشتے پر گفتگو کرتے ہیں تو بالعموم حسنِ بیان، تشریح وتعبیر، اور ہیئت کو یا تو ثانوی حیثیت دیتے ہیں یا پھر نظر انداز کر کے گزر جاتے ہیں۔ تاہم اپنے ایک مضمون میں انھوں نے تخلیق اور تنقید کے رشتے کو نظریاتی تحفظات کے بغیر بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

''اچھی تخلیقی قوت اچھی تنقیدی قوت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تخلیقی عمل میں ہی تنقیدی عمل کی نمود بھی پیدا

ہو جاتی ہے اور دونوں ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔"

یہاں احتشام حسین نے ٹی۔ایس۔ایلیٹ سے استفادہ کیا ہے، یا اگر استفادہ نہیں کیا تو یہ ایلیٹ کے تخلیق و تنقید سے متعلق مشہور تصور کی بازگشت ضرور ہے۔ لیکن احتشام حسین صرف ان اشاروں پر ہی اکتفا نہیں کرتے، اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہیں اور بعض مثالوں سے تخلیقی عمل اور تنقیدی شعور کی باہم کارفرمائی کی وضاحت بھی کرتے ہیں۔

جس طرح تخلیق کار کے اندر پائے جانے والے تنقیدی شعور کو احتشام حسین نے اس کے تخلیقی عمل کے لیے ضروری قرار دیا ہے، اسی طرح انھوں نے اس ردِ عمل کو بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے جو ادب پارے کے مطالعے کے دوران قاری پر وارد ہوتا ہے۔ ان کو اس بات کا احساس ہے کہ ردِ عمل کی نوعیت قاری کی انفرادی شخصیت اور افتادِ طبع کے اعتبار سے مختلف اور متنوع ہو سکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"ادب کا مطالعہ سیدھے سادے طریقے پر شروع ہوتا ہے، لیکن پڑھنے والا جس قدر لکھنے والے کے جذبات اور خیالات، تجربات اور افکار میں شریک ہوتا جاتا ہے اتنا ہی اس کا مطالعہ معنی خیز ہوتا جاتا ہے۔ یہ معنی خیزی مختلف سطحیں رکھتی ہے، کسی کے لیے لذت اندوزی اور جمالیاتی حظ کی منزل پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے، کسی کے لیے توسیعِ شعور اور علم کا ذریعہ بنتی ہے، کسی کے لیے اس سے محض جذبے کی تحریک ہوتی ہے، کسی کے لیے معلومات کا ذریعہ بنتی ہے، شعر و ادب کے مطالعے سے معنی تو ہر شخص اخذ کرتا ہے لیکن اس کی نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں۔"

احتشام حسین کی نظریاتی قطعیت کے عام رویّے کے برخلاف اس بیان میں انھوں نے اپنے نظریات اور تصورات اوپر سے مسلّط کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ ایک باذوق اور صاحبِ بصیرت نقاد کی طرح مختلف قاری پر ادب پارے کے مرتب ہونے والے مختلف اثرات کا اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے اور تنقید میں اصول اور معیار کی ضابطہ بندی کے باوجود ہیئت اور اسلوب کے مطالعہ کے جو مختلف رویّے ہو سکتے ہیں ان کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ کلیم الدین نے احتشام حسین کی تنقید نگاری کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں احتشام صاحب کے بیانات میں تکرار اور مارکسی مفکرین کے خیالات کو بغیر حوالے کے پیش کرنے کے الزامات عائد کیے ہیں۔ کلیم الدین کی رائے کی شدّت اپنی جگہ مگر ان کے متعدد اعتراضات کو عرصے تک دہرایا جاتا رہا ہے اور قرار واقعی جواب دینے کی کوشش کم کی گئی ہے۔ اسی نوع کے اعتراضات میں سے کلیم الدین کا ایک اعتراض تنقیدی اصولوں کے بارے میں ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

"احتشام صاحب نے کوئی نئے اصول تنقید نہیں بنائے، وہ مارکسی ہی سہی۔ ان کی تنقیدوں میں اصول کی دھجیاں اور پرزے ملتے ہیں۔ لیکن ان دھجیوں اور پرزوں کو ملا کر کوئی اچھا لباس نہیں بنا سکتے ہیں۔ وہ تفصیلات کی ضرورت سمجھتے ہوئے بھی تفصیلات سے گریز کرتے ہیں۔"

کلیم الدین احمد کی یہ رائے انتہا پسندی پر مبنی ہے۔ ہر نقاد نئے اصول نہیں بناتا۔ مغرب میں ارسطو،

ہوریس اور لان جائنس سے لے کر آئی۔ اے۔ رچرڈز، یا نئی امریکی تنقید کے علم برداروں تک اور مشرق میں ابن المعتز اور قدامہ ابن جعفر سے لے کر فارسی کے شمس قیس رازی اور خود عربی کے عبدالقاہر جرجانی تک صحیح معنوں میں جتنے اصول ساز اور نظریاتی بنیادیں فراہم کرنے والے رہے ہیں ان کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ اُردو میں اصول سازی کی جو کوشش الطاف حسین حالی کے یہاں نظر آتی ہے اس پایے کی کوئی دوسری مثال آج تک نہیں پیش کی جا سکتی۔ ایسی صورتِ حال میں پرانے اصولوں اور معیاروں کو اپنی لسانی اور تخلیقی ضرورت کے اعتبار سے نئے انداز میں مرتب کرنا اور کامیابی کے ساتھ اپنے ادبی سرمایے پر ان کا اطلاق کر لینا، کوئی کم اہم بات نہیں۔ اس ضمن میں اُردو کے کئی معاصر اور ماضی قریب کے نقادوں کے نام بھی لیے جا سکتے ہیں۔ احتشام کی تنقیدی کاوشیں ایسی نہیں کہ ان کی اہمیت سے یکسر انکار کر دیا جائے۔ ویسے یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ گر محولہ بالا بیان سے کلیم الدین احمد کی مراد اگر مختلف اوقات اور مختلف مضامین میں پیش کیے گئے الگ الگ اور بسا اوقات متصادم اور متضاد تنقیدی اصولوں سے ہے تو اس قسم کے بیانات میں تطابق کی کوئی صورت نکلتی ہے یا نہیں۔ بادی النظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ احتشام حسین کی تنقید کی پوری عمارت مارکسی تصوّرات کی بنیاد پر استوار ہوئی ہے، مگر اس کے ساتھ ہی وہ بعض جگہ تخلیق کے مطالعے میں تخلیق کار کی شخصیت اور نفسیات کی اہمیت کا بھی احساس دلاتے ہیں۔ یہی نہیں، فرائڈ کے حوالے سے شعور، تحت الشعور، لاشعور، جنسی دباؤ اور جنسی تھکن جیسی اصطلاحوں کا استعمال کر کے دبائے ہوئے جذبات کے فنی اظہار کی نوعیت کو سمجھنے کی بات کرتے ہیں تو ایسے موقع پر وہ بجائے مارکسی نقاد کے نفسیاتی نقاد کا فریضہ انجام دیتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ جب کہ ان کے نظامِ فکر کی مناسبت سے فرائڈ سے کہیں زیادہ یونگ کا تصوّرِ اجتماعی لاشعور زیادہ ہم آہنگ ہوتا۔ کم و بیش یہی اندازِ نظر تاثراتی تنقید کے سلسلے میں ملتا ہے۔ احتشام صاحب بجا طور پر ذاتی تاثرات کی بنیاد پر تنقید کی عمارت کھڑی کرنے سے انکار کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ تنقید، تخلیق کی تشریح تو ضرور کر سکتی ہے مگر اس کی باز آفرینی نہیں کر سکتی :

''تشریح میں کیفیات کی باز آفرینی نہیں ہو سکتی کیوں کہ کسی پر پڑے ہوئے اثرات کو پوری طرح اپنے اوپر طاری کرنا ناممکن ہے کیوں کہ جذبات خاص قسم کے محرکات اور پیچیدہ حالات کے ماتحت پیدا ہوتے ہیں۔''

مگر وہ اپنے اسی مضمون میں چند صفحات کے بعد واضح لفظوں میں لکھتے ہیں کہ ''اپنے ذوق اور وجدان کے سہارے کسی ادیب یا شاعر کی روح میں اتر جانا آسان ہے۔''

احتشام صاحب کا ایک بڑا اہم اور بصیرت افروز مضمون ''ماضی کا ادب اور نیا تنقیدی ردِ عمل'' ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے روحِ عصر اور تاریخیت وغیرہ کے ان مسائل سے تفصیلی بحث کی ہے جو ساختیاتی مباحث کے زیر اثر گزشتہ چند برسوں میں یورپ اور امریکہ کے ادبی نظریہ سازوں کے مابین خصوصی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ وہ اپنی تمہید میں ایک عہد کے ادب کو دوسرے عہد کے ادب سے مختلف قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ:

''جیسے ہی ہم کسی ادب کو قدیم یا کلاسیکی کہتے ہیں ایک تاریخ یا زمانی دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں اور مطالعہ کی کم سے کم ایک بنیاد سامنے آجاتی ہے۔ حالانکہ بعض علمائے ادب تاریخی مطالعے کی زبردست مخالفت کرتے ہیں۔ لیکن ان سے یہ گتھی کبھی نہیں سلجھ سکی کہ ایک عہد کا ادب دوسرے عہد کے ادب سے کیوں مختلف ہو جاتا ہے اور دوسرے عہد کے دل میں اس کے تاثرات وہی کیوں نہیں ہوتے جو اس کے عہدِ تخلیق میں رہ چکے ہیں۔ ہر زمانے کے ادبی ذوق کی داستان الگ ہے جس کے بننے میں صوتی، لسانی، معنوی، اجمالی، قومی اور فکری تغیرات حصہ لیتے ہیں''

لیکن بعد میں ان کو جیسے ہی اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ مختلف ادوار کے ادب میں کچھ ایسی مشترک قدریں بھی ہوتی ہیں جو زمانی حدوں کو پھلانگ جاتی ہیں اور ماضی کا ادب بھی ہمارے لیے اپنی تمام معنی خیزی کے ساتھ منکشف ہو سکتا ہے، تو وہ اپنے موقف کی وضاحت کچھ اس انداز میں کرنے لگتے ہیں کہ پڑھنے والا دونوں باتوں میں تطابق قائم نہیں کر پاتا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''زمانی ادوار، جغرافیائی حد بندی اور تاریخی حالات کے باوجود جذبات اور محسوسات کی دنیا میں کچھ ایسے مشترک عناصر مل جاتے ہیں جو ماضی کو حال میں گھسیٹ لاتے ہیں اور فاصلوں کو مٹا دیتے ہیں۔ اور ہم آہنگی کی وہ فضا پیدا ہو جاتی جو ادب کے آفاقی اور ابدی پہلوؤں کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہی چیز قدیم ادب کو جدید عہد میں ادب کی حیثیت سے قابلِ قدر بناتی ہے۔''

وہ اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ جن قومی اور فکری تغیرات کو انھوں نے ابتدا میں مختلف ادوار کے ادب کے درمیان حدِ فاصل قرار دیا تھا ان کو معاشی اور سماجی حالات سے بدل تو دیتے ہیں مگر ادوار کی ادبی مغائرت میں بھی اپنے آپ کو ایک سلسلے اور تعلق سے مربوط کرنے پر مجبور پاتے ہیں۔ پہلے وہ قدیم دکنی شاعروں کے کلام سے نامانوسیت کا ذکر کرتے ہیں مگر بعد کے بیان میں اسے مسائل کی عمومیت میں بدل دیتے ہیں:

''ان کے ماضی اور مستقبل میں ایک سلسلہ اور تعلق ہے۔ جہت اور اخلاق کے تصورات میں تبدیلی ہوئی ہے لیکن آج کا انسان بھی ان ناگزیر تعلق پر مجبور ہے۔ معاشی اور سماجی حالات کی وجہ سے ان کا طرزِ اظہار بدلا ہوا ہے، لیکن ان مسائل کی عمومیت زندہ ہے۔ ان سے جن جذبات کی تخلیق اور تحریک ہوتی ہے ان کا عمل آج بھی جاری ہے۔''

پروفیسر احتشام حسین کو چوں کہ تاریخ، تہذیب اور اقدار سے خاص دلچسپی ہے، اس لیے وہ ادب کی تفہیم کے لیے بالعموم تاریخی سیاق و سباق کو اہمیت دیتے ہیں، اور جب تاریخی سیاق و سباق کی بات آتی ہے تو اس سے متعلق مسائل کے طور پر تہذیب اور قدروں کا مسئلہ بھی زیرِ بحث آتا ہے۔ ان کے متعدد مضامین ادب کے حوالے سے مختلف ادوار کی تفہیم یا تہذیب کے کسی نہ کسی تشکیلی عنصر پر مبنی ہیں۔ اس نوع کے مضامین میں ادب اور تہذیب، ادب اور اخلاق ماضی کا ادب اور، قدیم ادب اور نیا ردِ عمل، جیسے عنوانات سے معنون تحریریں بڑی اہم

ہیں۔ ان مضامین میں انھوں نے ادب کو تاریخی سیاق وسباق میں بھی دیکھا ہے اور ثقافتی تبدیلیوں کے حوالے سے بھی قدیم اور جدید دور کے ادب کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ موضوع احتشام حسین کا صرف پسندیدہ ہی موضوع نہیں ہے بلکہ اس کے مضمرات کو وہ بخوبی سمجھتے بھی ہیں اور ان مضمرات کا عالمانہ تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ ادب کے عمرانیاتی مطالعے کو نئے ادبی اور تنقیدی تصورات کے زیر اثر جو اہمیت حاصل ہوگئی ہے اس اہمیت کے پیش نظر احتشام حسین کے اس نوع کے مطالعے ادب کے بین العلومی مطالعے میں بعض نئی جہات کا اضافہ کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مضمون 'ادب اور تہذیب' میں ادب کو جس تہذیبی تناظر میں دیکھا ہے اس کی معنویت آج کچھ زیادہ ہوگئی ہے۔

''قدریں تہذیب کے انھی عناصر پر مشتمل ہوتی ہیں جو صدیوں کی تخلیقی اور تعمیری جدوجہد سے پیدا ہوتے ہیں اور جن سے ایک تہذیب اور اس کے عزیز رکھنے والے پہچانے جاتے ہیں۔ قدریں بدلتی رہتی ہیں، ان کی حدیں بدلتی رہتی ہیں لیکن تہذیب کے ہر دور میں ان کا وجود پایا جاتا ہے۔''

اس نقطۂ نظر کا انطباق، احتشام حسین نے شعری ادب سے کہیں بہتر اور کارآمد طریقے پر فکشن کی تنقید پر کیا ہے۔ وہ جب نذیر احمد کے ناولوں کی تاریخی حیثیت کا تعین کرتے ہیں یا فسانۂ آزاد کے مشہور کردار خوجی کو ایک تہذیبی نمونے کے طور پر دیکھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فکشن میں کردار نگاری کے روایتی تصور سے بہت بلند ہو کر بھی غور کرتے ہیں اور اس ضمن میں بعض فنی نکات کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا خیال ہے کہ اگر سرشار نے خوجی کو میاں آزاد کی شخصیت کا لازمہ نہ بنایا ہوتا تو اس کردار کی شناخت دب کر رہ جاتی۔ وہ کہتے ہیں کہ ''آزاد کو بگاڑ دیا جائے تو وہ خوجی بن جائے گا اور خوجی کو سنوار دیا جائے تو وہ آزاد کے قریب پہنچ سکتا ہے۔'' کم و بیش یہی فنی چابکدستی ان کو نذیر احمد کے یہاں بھی نظر آتی ہے جب وہ نذیر احمد کے مشہور کردار اکبری اور نعیمہ کا موازنہ کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''نذیر احمد اپنے کرداروں کو تمثیلی ہونے سے بچانے کے لیے ان کی نفسیات میں کس طرح باریک فرق پیدا کر دیتے ہیں، اس کی مثال مراۃ العروس کی اکبری اور توبۃ النصوح کی نعیمہ کے کرداروں کا فرق ہے۔ اکبری پھوہڑ اور بے وقوف ہے، نعیمہ لاڈ پیار میں بگڑ جاتی ہے۔ دونوں ناولوں کے موضوع کے اعتبار سے ان کی زندگی کے مسائل اور راستے مختلف ہیں۔ یہ فرق ایک ذہین فن کار ہی پیدا کر سکتا ہے۔''

احتشام صاحب نے فکشن کے کرداروں کے مطالعے میں حقیقت نگاری کے سکہ بند ترقی پسند نقطۂ نظر سے بھی انحراف کیا ہے۔ انھوں نے خوجی کے کردار کو حقیقت نگاری سے کہیں زیادہ ہمہ گیری اور ادبی جامعیت کے معیار پر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ فکشن کے کسی کردار کے لیے اپنے گروہ یا اندازِ نظر کی نمائندگی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے اس میں ''روایتوں کا تسلسل'' مقید ہو اور جس میں صدیوں کی صداقت کی ترجمانی کرنے کی اہلیت ہو، وہ کہتے ہیں کہ:

''یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ حقیقت نگاری کے اصولوں پر پورا اترے، مگر اتنا ضرور ہونا چاہیے کہ مبالغہ کے باوجود وہ کسی عہد کی ایک یا کئی خصوصیتوں کا مجسمہ بن جائے۔ کبھی کبھی ایسے کردار کی تخلیق بھی ہو سکتی ہے جو انسانی نفسیات کی گتھیوں کی تصویر پیش کرے اور صرف کسی مخصوص دور تک محدود نہ رہ جائے بلکہ اس کی زندگی کا کوئی نہ کوئی پہلو دوسرے سماجی نظاموں اور دوسرے زمانوں میں بھی سچائی کا حامل ہو''

احتشام صاحب کو الطاف حسین حالی کے تصورِ شعر میں یہ بات قابلِ تعریف نظر آتی ہے کہ حالؔی نے بھی مادہ کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور خیال کو اس کا زائیدہ قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

''حالؔی کا صرف ایک جملہ خارجی حالات کی اہمیت کو مان لینے کے لیے کافی ہے۔ مقدمۂ شعرو شاعری میں انھوں نے صاف کہہ دیا ہے کہ خیال مادّہ کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔ شعور، سنگِ بنیاد ہے ان تمام ادبی تعمیرات کا جو ہم غدر کے بعد پاتے ہیں۔ مادّہ کی اہمیت کا اقرار اور خیال کا مادّہ کے نتیجے کے طور پر ادراک 'یہ نئے فلسفۂ حیات کا پتہ دیتا ہے' لیکن حالؔی اس بصیرت کے باوجود مسلمانوں کے جس متوسّط طبقے سے تعلق رکھتے تھے، انھی کی ترجمانی کر سکے۔''

ان تنقیدی رویّوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سیّد احتشام حسین سماجی علوم پر گہری نظر رکھنے اور اپنی تنقید کو عالمانہ سیاق وسباق دینے کے باوجود نظریاتی ادّعائیت اور قطعیت کا اظہار کرتے ہیں اور وہ ادب کو ایک خود مکتفی اسلوبِ بیان اور فنی نمونے سے زیادہ سماجی دستاویز یا عوامی فکر کے آلۂ کار کے طور پر دیکھنا پسند کرتے ہیں۔

سید احتشام حسین کی شخصیت

ساحل اور سمندر میں

● پروفیسر قمر رئیس

احتشام صاحب اُن لوگوں میں ہیں جو چپکے سے ایک حادثہ کی طرح گزر جاتے ہیں لیکن اپنے دوستوں، شناساؤں اور نیاز مندوں کے دلوں میں اسی طرح جا گزیں رہتے ہیں جیسے وہ زندہ ہوں، متانت شائستگی اور نرمی سے باتیں کر رہے ہوں، اس لیے میں ان کو احتشام صاحب ہی لکھوں گا گویا وہ اب بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔

احتشام صاحب کی شخصیت کا ایک روپ وہ ہے جو ان کے تنقیدی مضامین میں نظر آتا ہے یا جو رسمی اور غیر رسمی محفلوں میں ان کی تقریروں اور گفتگو میں دکھائی دیتا ہے یعنی علم و آگہی کا ایک روشن منارہ۔ تہذیب، رواداری، بردباری، نرم گفتاری کا پیکر، جو ظرافت کے موضوع پر بھی نہایت سنجیدہ استدلال سے گفتگو کرتے ہیں۔ اگر کسی برخود غلط یا برے آدمی کا ذکر ہو تو وہ اس کی ذات میں بھی کچھ اعلیٰ انسانی اور اخلاقی خوبیاں تلاش کر کے آپ کو دے دیں گے۔ اگر کوئی مسئلہ الجھا ہوا ہے تو اپنے تجزیہ کی قوت اور افہام و تفہیم کی روشنی سے وہ اسے شفاف صورت میں آپ کے سامنے پیش کر دیں گے۔ ان کی غیر رسمی صحبت میں اگر آپ کچھ دیر بیٹھ کر اٹھیں تو صرف معلومات ہی نہیں فکر انگیز خیالات اور چبھتے ہوئے سوالات اپنے ذہن میں لے کر اٹھیں گے۔ درجنوں کتابوں کے نام آپ کے ذہن نشیں ہو جائیں گے۔ ادب اور زندگی کو دیکھنے کے کچھ نئے زوایے آپ کے ہاتھ آئیں گے۔ یہ سب بجا اور درست لیکن احتشام صاحب کے اس روپ پر ان کی ذاتی اور جذباتی دنیا کا سایہ بھی نہیں پڑے گا۔ ان کی اپنی پریشانیاں، محرومیاں، ناکامیاں، نشاط و انبساط کے تجربے، کشمکش، دوستوں اور عزیزوں سے ملی تلخیاں، عشقِ بلاخیز کی رنگینیاں اور ہجر وصال کی سحر انگیز گھڑیاں۔ ایک تخلیقی فن کار کی حیثیت سے ان کا ذوقِ

جمال۔ دنیا اور فطرت کے لازوال حسن کی کرشمہ سازیاں۔ یہ اور اس قبیل کی دوسری جذباتی اور تخئیلی کیفیات ان کی شخصیت کے کسی گوشہ سے آپ کو جھانکتی نظر نہیں آئیں گی۔ حد یہ ہے کہ ان کا اسلوبِ تحریر اور طرزِ بیان بھی بے رنگی اور بے کیفی کی حد تک سادہ اور پُر وقار ملے گا۔ مزاح تو بڑی بات ہے کوئی شگفتہ جملہ بھی شاذ و نادر ان کی نثر میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کا سبب شاید زندگی اور علم و آگہی کے بارے میں وہ ذہنی اور عقلی رویے ہیں جو زندگی کی کڑی دھوپ میں تپ کر وہ اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ بچپن کی حیرانیاں، نوعمری کی شوخیاں اور جوانی کی امنگیں جیسے آہستہ آہستہ اس کابوس کے نیچے دب کر سو گئیں۔

لیکن ''ساحل اور سمندر'' ایک ایسی تصنیف ہے جس میں ان کی مخفی شخصیت کا یہ دوسرا رخ بھی اپنی تابانیاں بکھیرتا نظر آتا ہے۔ احتشام صاحب کو ذرا فاصلہ سے دیکھنے والوں کے لیے وہ کسی دیوتا کی طرح عزم و ارادہ اور علم کا پیکر تھے۔ لیکن اس سفرنامہ کے ابتدائی ابواب میں وہ ایک کمزور اور معمولی جذباتی انسان نظر آتے ہیں جو راک فلر فاؤنڈیشن کی فیلوشپ کو قبول کرنے اور ہملٹ کے انداز میں TO GO or NOT TO GO کی الجھن میں گرفتار ہے۔ ذہنی سطح پر یہ کشمکش شدید تر ہوتی نظر آتی ہے۔ حالاں کہ انھیں یہ فیلوشپ بغیر کسی شرط کے پیش کی گئی تھی اور انھیں ایک ترقی پسند ادیب کی حیثیت سے پیش کی گئی تھی لیکن کبھی ان کا بیمار بھائی انھیں جانے سے روکتا ہے، کبھی دوسری طرح کے اندیشے دل میں سر اٹھاتے ہیں۔ لیکن اس ساری ڈھلمل یقینی کی کیفیت میں احتشام صاحب ایک عام انسان کے روپ میں نظر آتے ہیں اور ہم ان سے زیادہ قریب، زیادہ مانوس ہو جاتے ہیں۔

تذبذب اور بے دلی کی یہ حالت امریکہ پہنچنے کے بعد اکثر لمحوں میں اکتاہٹ، مایوسی اور بیزاری میں بدل جاتی ہے۔ اعلیٰ درجہ کے ہوٹلوں میں قیام کرنے اور ہر طرح کی سہولتیں حاصل ہونے کے باوجود وہ ایک اعصابی تشنج اور تناؤ میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ اس خیال سے ان کا دم گھٹتا ہے کہ جمہوری آزادیوں کی اس جنت میں ادیب، دانشور اور عام شہری اس شبہ میں پکڑے جا رہے ہیں کہ وہ کمیونسٹ یا ان کے ہمدرد ہیں۔ جب آئن سٹائن اور دوسرے بڑے امریکی سائنسداں اس دارو گیر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں تو انھیں کچھ سکون ملتا ہے۔ وہ اس بات سے بھی سخت ملول ہیں کہ PL480 یا دوسری شکل میں ہندستان کی غریبی پر ترس کھا کر جو امداد دی جا رہی ہے اس کے ساتھ کچھ پابندیاں بھی ہیں۔ پنڈت نہرو جب کمیونسٹوں کے خلاف کوئی سخت قدم اٹھاتے ہیں تو وہاں کے اخبار پسماندہ ملکوں کے بارے میں دوسری منفی خبروں کے ساتھ یہ خبر بھی نمایاں طور پر شائع کرتے ہیں۔ اپنے ایک ہندستانی پروفیسر دوست کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر مزمدار سے کیلی فورنیا یونیورسٹی اسی قسم کا حلفِ وفاداری چاہتی تھی۔ انھوں نے معذرت کر لی کہ میں اپنے ملک کے لیے حلفِ وفاداری اٹھا چکا ہوں اب دوسرے کے لیے کیسے اٹھا سکتا ہوں۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ ''سرخی'' کی تلاش میں ہنگامے برپا نہ ہوتے ہوں۔ کل اقوام متحدہ کے ایک بڑے امریکی افسر نے اسی گھبراہٹ میں خودکشی کر لی۔''

جب امریکی حکومت محض شک کی بنیاد پر روزن برگ جوڑے کو موت کی سزا دیتی ہے تو وہ کرب واذیت سے تلملا اٹھتے ہیں:

''بے رحم سرمایہ داری نے جولیس اور اتھل دونوں کو برقی کرسیوں پر بٹھا کر اپنی درندگی کا ثبوت دیا...... مجھے یہ غم کیوں ذاتی معلوم ہوتا ہے۔ کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دو عزیز دوستوں سے جدائی ہوگئی۔'' (ص۔۳۳۷)

لیکن ان کی بیزاری اور حزن ویاس کے دوسرے اسباب بھی ہیں۔ مثلاً جب محرّم کی پہلی تاریخ آتی ہے تو ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک آتے ہیں، یا جب ان کے والد کی موت کی تاریخ آتی ہے تو بے اختیاری کے ساتھ ان کا دل بھر آتا ہے۔ مجھے یاد ہے مولانا اختر علی تلہری نے ایک مضمون میں اس پر سخت گرفت کی تھی کہ محرّم کی پہلی تاریخ کو ایک اشتراکی سے کیا نسبت؟ شاید یہ آنسو صرف دکھاوے کے ہیں۔ کاش وہ سمجھ سکتے کہ لکھنؤ کی محرم کی مجلسیں اور عزاداریاں مذہبی اہمیت سے کہیں زیادہ تہذیبی معنویت رکھتی ہیں اور ان کا کوئی تعلق سیاسی معتقدات سے نہیں ہوتا۔

''ساحل اور سمندر'' کے اکثر مقامات پر ان کے اندر بیٹھا ہوا فن کار جاگ اٹھتا ہے۔ ان کی قوت مشاہدہ گرد وپیش کے حسین مرقعے تیار کرتی ہے۔ بعض اشخاص کے خاکے وہ ایسی مہارت سے تراشتے ہیں کہ ان کا نقش بھلاتے نہیں بھولتا۔ مثلاً نیویارک کی ہندستانی کونسلیٹ کے اوّل سکریٹری ڈاکٹر راجن، جن سے وہ ایک انگریزی کے ادیب کی حیثیت سے شناسا تھے۔ ان سے پہلی ملاقات کا تاثر دیکھیے: ''اُن سے کوئی گھنٹہ بھر باتیں ہوتی رہیں۔ خوبصورت نوجوان اور پڑھے لکھے ہندستانی ہیں (البتہ) ان کی گفتگو میں ''میں'' کا استعمال ضرورت سے زیادہ تھا۔ باتیں اچھی کرتے ہیں اور انگریزی خوب بولتے ہیں۔ کم آمیز خود پسند اور کسی قدر الجھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ امریکیوں خاص کر نیویارک والوں کو مغرور اور تاجرانہ ذہنیت والا سمجھتے ہیں۔'' (ص۔۹۸)

امریکہ میں وہ نسوانی حسن بھی تلاش کرتے ہیں اور شکایت کرتے ہیں کہ یہاں پُرکشش نسوانی چہرے نظر نہیں آتے۔ ان کے الفاظ میں ''مجھے برابر یہ احساس ہوا کہ یہاں کی عورتوں کے چہروں میں خط وخال، رفتار و گفتار میں وہ دلکشی نہیں ہے جس کی آرزو کی جاتی ہے۔ کبھی بھولے بھٹکے کوئی چہرہ ایسا نظر آجاتا ہے جسے دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہو ورنہ عام طور پر نہ تو وہ معصومیت ہے جو متوجہ کرے، نہ وہ چال جس میں شراب کی مستی ہو۔ نہ آنکھوں میں وہ رس ہے جو انسان کو مدہوش بناتا ہے۔ نہ تبسّم میں وہ دلکشی ہے جو نشتر کا کام دے...... میرا خیال ہے کہ ان کے چہروں میں جنسی کشش کا زمانہ بہت مختصر ہوتا ہے۔'' (ص۔۱۲۱)

یہ صحیح ہے کہ امریکی معاشرہ کے نو بہ نو مظاہر کو انھوں نے اکثر ایک بچے کی طرح تلاش وجستجو کے جذبہ اور حیرانی سے دیکھا لیکن ایسے لمحے بہت کم آئے جب اس سیاحت کے دوران میں انھوں نے حظ ونشاط کی کیفیت محسوس کی ہو۔ ایسا ایک نادر تجربہ انھیں اس وقت ہوا جب وہ نارمٹن میں لڑکیوں کے ایک کالج کے مہمان خانے

میں ٹھہرے، لکھتے ہیں:

''کالج کے ایک مہمان خانے میں ٹھہرا، اساتذہ اور لڑکیوں کے ساتھ ڈنر میں شریک ہوا، باتیں کیں، ہنسا اور یہاں کی منظم فارغ البال دلچسپ زندگی پر رشک کرتا رہا۔ تین دن ایک دلربا اور دلنواز ماحول میں گزارے۔'' (ص۔۱۹۷)

اسی طرح کے کچھ دلکشا لمحے انھیں لندن اور پیرس کے ماحول میں بھی میسّر ہوئے۔ ان شہروں کی تاریخی یادگاروں، پارکوں اور میوزیموں نے انھیں امریکہ کے مقابلہ میں زیادہ متاثر کیا۔ یہاں انھیں وہ اجنبیت اور اکتاہٹ بھی محسوس نہیں ہوئی جو امریکہ کے قیام کا خاصہ تھا۔

روزنامچہ میں وہ روزمرّہ زندگی کے مشاہدات اور تجربات بے کم وکاست لکھتے رہے ہیں۔ کہیں بھی کسی مرعوبیت یا مصلحت کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ امریکی ادیبوں اور اہلِ دانش سے بھی ملے لیکن سوائے لائنل ٹرلنگ Lional Trilling کے کسی ادیب یا ناقد نے انہیں متاثر نہیں کیا۔ پیرس کی ایک خاص شاہراہ کی زیارت کر کے جب وہ واپس آتے ہیں تو لکھتے ہیں:

''یہاں کے کیفے میں بہت دنوں سے دانشور اور فن کار جمع ہوتے ہیں۔ یہیں اس وقت کے وجودیت پسند رات رات بھر بیٹھ کر شرابیں پیتے اور فلسفہ تراشتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ فرانس میں اس کا زوال ہو رہا ہے اور یہاں آ کر معلوم ہوا کہ گزشتہ نومبر میں بہت سے وجودیت پسندوں نے خود اس فلسفے کا جنازہ نکالا۔ خود سارتر کو اس سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی اور وہ امن کی تحریک میں عملی طور پر حصہ لے رہا ہے۔'' (ص۔۳۲۴)

الغرض اس سفرنامہ کے بے شمار صفحات میں احتشام صاحب کی شخصیت کے ایسے جذباتی اور تخلیقی پہلو اجاگر ہوتے ہیں جو ان کی دوسری تحریروں میں کہیں نظر نہیں آتے۔ گوشت پوست کے ایک حقیقی انسان احتشام صاحب کی یہ متحرّک اور جاندار تصویریں ہمیں ان سے اور قریب اور مانوس کر دیتی ہیں۔

لکھنؤ کی انجمن اور احتشام صاحب

● اقبال مجید

بڑی پریشانیوں کے دن تھے وہ۔ کئی دوستوں کو رو دھو کر چار باغ اسٹیشن سے لاہور اور کراچی کے لیے سوار کرا چکے تھے۔ اسلامیہ کالج سے انٹرمیڈیٹ کرنے نکل چکے تھے۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں ۵۳ء میں داخلہ بی اے میں ہو چکا تھا۔ احتشام صاحب امریکہ میں لیکچر وغیرہ دے دلا کر اور انگلستان اور فرانس کا دورہ پورا کر کے ہندوستان آ چکے تھے اور یونیورسٹی میں جلوہ افروز تھے۔ تب یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ ہستی علم و آگہی کے کونسے چراغ روشن کر رہی ہے، کیسی سائنٹفک سوچ اور معروضی فکر کے دریچے وا کر رہی ہے۔ کون سی معاشی، فکری اور ثقافتی استحصال اور جبر کے خلاف ہونے والی عالمی جدوجہد کا ساتھ دے رہی ہے۔

احتشام صاحب نے اپنے عہد کے جن جغادریوں مثلاً عبدالرحمٰن بجنوری، نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری وغیرہ سے لوہا لے کر اردو تنقید کو نئی جلا بخشی اور حیاتِ تازہ سے نوازا اُن سب باتوں کا نہ تو ہمیں اس وقت شعور تھا اور نہ احتشام صاحب ہمیں اُن اوصاف کے سبب عزیز ہی تھے۔ جب سرور صاحب کی کوٹھی نعمت اللہ روڈ پر انجمن ترقی پسند مصنفین کی پندرہ روزہ نشستیں پابندی سے ہوا کرتی تھیں اُس وقت مسیح الحسن رضوی صاحب مرحوم اس کے سکریٹری تھے۔ مسیح صاحب بڑی Down to earth اور بانکی کہانیاں لکھتے تھے۔ روزی روٹی کے لئے ''قومی آواز'' میں سب ایڈیٹر تھے۔ ایک ہفتہ دن میں اور ایک ہفتہ رات میں انھیں اُس اخبار کے کالم بھرنے کا کام کرنا پڑتا تھا۔ انجمن کے جلسوں کی روداد کی رپورٹنگ پابندی سے ہوا کرتی۔ یہ دیکھ کر مسیح صاحب نے مجھے جوائنٹ سکریٹری کے طور پر اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ ان جلسوں میں سرور اور احتشام صاحب کے علاوہ علامہ اختر تلہری، نورالحسن ہاشمی، باقر مہدی، عابد سہیل، محمودالحسن، منظر سلیم، رام لعل، قمر رئیس، شارب ردولوی، احمد جمال پاشا اور رتن سنگھ کے علاوہ لکھنؤ تشریف لانے والے کل ہند شہرت کے اہم ادیب، ڈرامہ نگار اور شاعر بھی مہمان ہوا کرتے تھے۔ اُن جلسوں میں احتشام صاحب کے ارشادات کی

رپورٹنگ کرنا مجھ جیسے ایک معمولی طالب علم کے لیے کس قدر دشوار تھا اسے بیان کرنا مشکل ہے۔ پھر اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ یہ ارشادات اُس ہستی کے ہیں جو 1935ء میں قائم ہونے والی انجمن ترقی پسند مصنفین کا مؤید رہا ہے تب تو میرے پسینے ہی چھوٹ جاتے۔

احتشام صاحب کی تقریر یا گفتگو کے اکثر جملے لکھنے سے اس لیے بھی چھوٹ جایا کرتے تھے کہ ان کی تقریر میں بڑی روانی تھی۔ موضوعات ان کے ذہن میں اس قدر صاف ہوا کرتے کہ کوئی نکتہ ذرا بھی الجھا ہوا نہ رہ جاتا۔ مجھے یاد ہے کہ اُن دنوں اکثر جلسوں میں بار بار ہیئت اور مواد کی بحث چھڑ جایا کرتی تھی۔ احتشام صاحب ہمیشہ اسی نکتے پر زور دیا کرتے تھے کہ تخلیق ایسی ہو جس میں ہیئت اور مواد ایک جان دو قالب ہو کر پہچان میں نہ آسکیں۔ میرے لیے اُن بحثوں کو صحیح صاحب کی طرح سمجھ لینا اور تحریر میں لے آنا ممکن نہ تھا۔ وہ ہمارے لیے ہمارے Mentor کے مانند تھے۔ اس بات کا احساس ہم لوگوں کو اس وقت زیادہ ہوا جب انجمن کی نشستیں احتشام صاحب کے بارود خانے والے گھر میں ہونے لگیں۔

اُس وقت اُن جلسوں میں پولیس کے محکمے میں کام کرنے والے ایک افسر بھی کبھی کبھی آ جایا کرتے تھے۔ انھوں نے ایک کہانی چونّی کے نام سے پڑھی، جس نے حاضرین پر گہرا اثر ڈالا۔ احتشام صاحب بھی موجود تھے (یہ جلسہ سرور صاحب کے گھر پر تھا) اُس کہانی کو لے کر احتشام صاحب نے ادب کا سماج سے کیا رشتہ ہے اور فعّال سماج کے دل کی دھڑکنیں کس طرح ادب پر اثر انداز ہوتی ہیں اس پر اتنی کھل کر تقریر کی کہ میں لکھنے کے بجائے ان کا منہ ہی دیکھتا رہ گیا۔ اُس وقت ان کی ہم لوگوں سے پہلی توقع یہ تھی کہ ہم جو کچھ لکھیں وہ ہمارے سماج کا آئینہ بنے۔ آج پچاس ساٹھ سال گزر جانے کے بعد ہماری تنقید ادب کو صرف اپنے سماج کا آئینہ بنتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتی کیونکہ وہ ادب کو صرف سماج کا طفیلیہ ہی دیکھنا نہیں پسند کرتی۔ آج ایک محرر اور تخلیق کار میں جو فرق تلاش کیا جا رہا ہے اور یہ دلیل دی جا رہی ہے کہ محرّر دنیا کو صرف منعکس کرتے ہیں یعنی آئینہ دکھاتے ہیں اس لیے ادب میں سماج کی محرّری کرنے والے میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ سماج میں کوئی تبدیلی لا سکے۔ تبدیلی وہ ادیب لاتے ہیں جو اُس طاقتور دنیا کو پیش کر سکیں جو ادیب کی قوت متخیلہ کا نتیجہ ہوتی ہے اور وہی ادیب اصل تخلیق کار رہتا ہے نہ کہ محض سماج کو آئینہ دکھانے والا ادیب۔ دراصل ادب کو سماج کے پس منظر میں دیکھنے کا کام حالی کی روایت کو اور آگے بڑھاتے ہوئے اور اس سے زیادہ نئے الفاظ اور فکر دیتے ہوئے ۱۹۳۵ء میں اختر حسین رائے پوری کے اہم مضمون ''ادب اور زندگی'' نے ایک بار پھر تازہ کر دیا تھا جس کی وجہ سے نئی ترقی پسند تنقید مارکسی نظریے کے ساتھ مضبوط انداز میں ادب کے ذریعے زندگی کو آئینہ دکھاتے ہوئے ایک نئے سماجی انقلاب کا ڈسکورس قائم کرنے کے لائق بنی۔ اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ''انگارے'' کے وجود میں آنے پر ملک کے سماجی، مذہبی اور ادبی حلقوں میں ایک طوفان سا اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ یہ زندگی کے آداب سے یگانگت پیدا کرنے کا نتیجہ تھا احتشام صاحب کے خیال میں ادب کی جانب ادیب کا یہ

رویہ اس کو تاریخ اور تہذیب کی نئی ضرورتوں اور بدلتے ہوئے طبقاتی شعور کا علم و عرفان فراہم کرتا ہے۔ ادیب کی قوت متخیلہ پیدا ہوتی ہے اس کے شعور سے اور شعور تاریخی، معاشرتی، طبقاتی اور تہذیبی قوتوں کی کارفرمائیوں کا مطیع ہے۔ یہ بات کون تسلیم نہیں کرے گا کہ شیکسپیئر کا المیہ جولیس سیزر اپنے عہد کی سیاسی غیر مطابقت (Political Disharmony) کا نتیجہ تھا۔ احتشام صاحب کی کتاب ''ادب اور سماج'' میں ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کے موضوع پر فکر انگیز مباحث پڑھنے کو ملتی ہیں۔ یہی نہیں تاریخ کا مادّی جدلیاتی تجزیہ بھی پہلی بار ہماری تنقید میں جگہ پاتا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ترقی پسند ادیب روایت پرستی کے سخت مخالف تھے اور ان کے ادب کو جمالیاتی سرشاری سے بھی کوئی علاقہ نہ تھا لیکن احتشام صاحب کی نگارشات پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہو جائے گا کہ ان کے یہاں صحت مند روایات کا کسقدر احترام تھا اور وہ جدیدیوں کی طرح جمالیات کو کوئی مطلق اور مجرد شئے نہیں تسلیم کرتے تھے کہ جمالیات کا تصور ہمیشہ بدلتا رہا ہے۔

مجھے نہیں یاد کہ بارود خانے کی انجمن کے جلسوں میں ہمارے افسانے سننے کے بعد احتشام صاحب نے ہم کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہو کہ ہم نے اپنے افسانے میں انقلاب اور اشتراکیت کے اصولوں کو سمجھانے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ اس لیے ہمارا افسانہ ترقی پسند نہیں ہے۔ بہ حیثیت ادیب اُس وقت ہمارے لیے ان کی تعلیمات کا لب لباب بس اتنا تھا کہ ادب کو افادی ہونے کے ساتھ ساتھ اس کو فنی خوبیوں کا بھی حامل ہونا ضروری ہے۔ ماوزے تنگ نے بھی یہ کہہ کر ادیبوں کو خبردار کیا تھا کہ انقلابی ادب لکھنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔

احتشام حسین اپنے طبقاتی پس منظر، فکری اور علمی پس منظر وغیرہ کو دیکھتے ہوئے سجاد ظہیر سے مختلف تھے۔ سجاد ظہیر نے کمیونسٹ پارٹی کے لئے عملی طور پر خاصہ کام کیا اور وقت بھی دیا۔ احتشام صاحب بھی اپنے زمانے کے کمیونسٹ موومنٹ سے متاثر تھے اور ان کے دل میں پارٹی کا احترام بھی تھا۔ اس وقت ہمارے دوستوں میں قمر رئیس اور عابد سہیل کمیونسٹ پارٹی سے قریب تھے۔ ہم لوگ جنھوں نے لمبے عرصے احتشام صاحب کی محبت سے فیض اُٹھایا ہے ایسا محسوس کرتے رہے کہ احتشام صاحب نے پارٹی لائن کو اپنے علمی اور فکری رویّے پر کبھی حاوی نہیں ہونے دیا۔ وہ کسی بھی فیصلے کو جلدی قبول نہیں کر لیتے تھے۔ وہ جدیدیت کے رجحانات سے دوسرے ترقی پسندوں کی طرح بدکتے ہوئے نہیں دیکھے گئے۔ سریندر پرکاش کے تجریدی افسانوں کو انھوں نے یکسر مسترد نہیں کیا لیکن بانجھ علامتیت پر انگلی ضرور اُٹھائی۔ بہ حیثیت ایک رجحان اسکے امکانی خطروں سے بھی آگاہ کیا۔ انھوں نے تجربے کا ادب میں احترام کرنے پر زور تو دیا لیکن یہ بھی چاہا کہ اس کا ظہور اس کی ادبی روایت کے بطن سے ہو۔ یعنی تجربہ وہی اصل تجربہ ہے جس میں ماضی کا شعور بھی کارفرما ہو، حال کا درست علم بھی شامل ہو اور مستقبل کی انسانیت نواز آہٹیں بھی سنائی دے رہی ہوں۔

احتشام صاحب کی پیروی کرنے والے اور ان کے اثرات قبول کرنے والوں میں قمر رئیس اور

شارب ردولوی نے بھی احتشام صاحب کی ہی طرح سیاسی کے بجائے فکری سطح پر ترقی پسند نظریات کی تشہیر کی ہے اور فکری سطح پر جدیدیت کے مضر نتائج پر بھی بار بار اظہار خیال کیا ہے۔ احتشام صاحب کی تربیت کے مطابق ہم نے اپنی ادبی سرگرمیوں میں ترقی پسند نظریات اور فکر کا ضرور سہارا لیا مثلاً عابد سہیل پارٹی کے کاموں میں نہ لگ کر ماہنامہ کتاب نکالنے لگے جس نے احتشام صاحب کے افکار کی تبلیغ و تشہیر کا کام انجام دیا۔

ہمارے زمانے کی انجمن کے جلسوں میں بزرگ افسانہ نگار علی عباس حسینی کو چھوڑ کر جلسے میں آنے والے اور اپنے افسانے پڑھنے والوں میں رام لعل، رضیہ سجاد ظہیر، مسیح الحسن رضوی، ستیش بترا، بشیشر پردیپ، عابد سہیل، آغا سہیل، رتن سنگھ اور راقم الحروف وغیرہ تھے۔ ایک نام ویر راجہ کا بھی یاد آیا جن کا بنوش نام کا ایک ریسٹورینٹ حضرت گنج میں مندر کے پاس تھا۔ ان افسانہ نگاروں کے علاوہ قاضی عبدالستار بھی لکھنؤ میں ہمارے جرگے میں شامل تھے لیکن مجھے یہ یاد نہیں آرہا کہ انھوں نے کوئی افسانہ وہاں پڑھا ہو، بہر حال ان میں سے تمام ہی افسانہ نگاروں کے اُن جلسوں میں پڑھے گئے بعض افسانے احتشام صاحب نے بھی سنے۔ وہ ہمیشہ افسانے کی تخلیق کو ایک شعوری عمل مانتے تھے، وہ اسے اظہار کا ایک فنکارانہ وسیلہ سمجھتے تھے اور ان کی نظر میں اس تخلیق کا خالق اپنی تخلیقی خوبیوں اور خامیوں کا ذمہ دار ہوتا تھا کوئی یہ کہہ کر بری الذ مہ نہیں ہوسکتا تھا کہ ہم نے تو لکھ دیا اب قاری سمجھے یا نہ سمجھے۔

بریخت کا کہنا تھا ''میں نہ تو کسی پڑھنے والے کے لیے لکھتا ہوں، نہ عوام کے لیے نہ سوسائٹی کے لیے ۔میں تو بس اپنی ذات کے لیے لکھتا ہوں۔ اگر کوئی کہے کہ جب کوئی پڑھنے والا ہی نہ ہو تو کیا تم اس وقت بھی لکھو گے تو میں جواب دونگا کہ شاید نہ لکھوں لیکن میرا دماغ لکھنا ہر گز بند نہ کرے گا''۔ احتشام صاحب نے اپنے مضمون ''میں کیا لکھتا ہوں'' میں اس کا بڑا مدلّل جواب دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ''پڑھا جانا ہی تو مصنّف اور پڑھنے والے کے درمیان ایک رابطہ ہے اگر وہ قائم نہیں ہوتا تو ادب وجود میں آہی نہیں سکتا۔ جو کچھ ذہن میں گزر رہا ہے وہ ادب نہیں ہے، ادب وہ ہے جو ادیب کے عمل اظہار کا نتیجہ ہے''۔

اُس زمانے میں احتشام صاحب کے علم و فضل سے سب سے زیادہ استفادہ کرنے والوں میں یا ان کے بہترین شاگرد کی حیثیت سے ڈاکٹر محمد حسن کی ایک شخصیت ایسی تھی جو ہم سے اور ہمارے دوستوں سے سب سے زیادہ قریب تھی۔ انھوں نے یہ بات کہیں لکھی بھی ہے کہ احتشام صاحب کے استدلال میں نرمی اور دھیما پن ہوتے ہوئے بھاری بھرکم پن اور ایک رواں دواں دریا کا وقار تھا اور ان کا سب سے بڑا احسان ہماری تنقید پر یہ ہے کہ اس کو احتشام صاحب نے فکر پرور اور فکر انگیز بنا کر ایک ذہن عطا کیا۔

اُس زمانے میں ہمارے جرگے کے ایک ممبر آغا سہیل بھی تھے جنھوں نے احتشام صاحب کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ تقسیم نے ان کو بھی ہم سے جدا کردیا۔ پاکستان میں انھوں نے احتشام صاحب کو ان لفظوں سے یاد کیا ہے ''ان کا ذہن واضح، ان کے نظریات غیر مبہم اور ان کے خوبصورت فقرے مربوط، مرتب

اور منظم ہوتے ہیں'' آغا سہیل نے پیلتا نوف سے بھی احتشام صاحب کا تفصیلی موازنہ کیا ہے۔ افسوس کہ اب آغا سہیل بھی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

احتشام صاحب کی تحریروں سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے دوران افسانے، ڈرامے، نظمیں، غزلیں، تنقیدی مقالات اور علمی مضامین لکھے اور ان کے مطالعہ میں ادب، تاریخ، فلسفہ، سیاست، نفسیات اور جنسیات کے موضوعات وغیرہ رہے۔ احتشام صاحب کو میں نے شعر سناتے ہوئے انجمن کے جلسوں میں نہیں سنا لیکن استاذی آلِ احمد سرور نے احتشام صاحب کی شاعرانہ شخصیت پر ان لفظوں میں تبصرہ فرمایا ہے: ''شعر وہ کم کہتے تھے اور مخصوص صحبتوں میں سناتے تھے۔ ان کے پڑھنے کا انداز دلکش تھا۔ شعر ترنم سے پڑھتے تھے اور ترنم میں گداز تھا''۔ یہاں ان کا ایک شعر جو ہماری نوجوانی کے زمانے میں میرے شاعر دوستوں کی زبان پر چڑھا ہوا تھا وہ پیش کر رہا ہوں۔

روشن نہ سہی صبحِ وطن اے دلِ پُر شوق
بے رونقیِ شامِ غریباں تو نہیں ہے

مجھے نہیں یاد کہ انجمن کے جلسوں میں کبھی کوئی سفرنامہ پڑھا گیا ہو البتہ ایک موقع پر جب لکھنؤ کے مشہور ڈاکٹر فریدی جنھوں نے ایک سیاسی پارٹی بھی بنائی تھی، روس کے دورے پر سے واپس آئے تو انھیں اس سفر کے تاثرات بیان کرنے کے لیے انجمن کے جلسے میں احتشام صاحب کی تحریک پر بلایا گیا تھا۔ انھوں نے فریدی کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنے سفرنامے کے حالات قلمبند کریں۔ احتشام صاحب سفرنامے کی صنف کی افادیت کے قائل تھے اور اس کو دلچسپ اور معلومات بخش بنا کر لکھے جانے کی تلقین کرتے تھے۔ انھوں نے 1952ء میں سفرِ انگلستان کے موقع پر ''ساحل اور سمندر'' کے عنوان سے قابلِ ذکر سفرنامہ لکھا اور اس بات کی طرف خصوصی اشارہ بھی کیا کہ وہ ایک ایسی تحریر لکھ رہے ہیں جس کا تعلق ادب کی اس صنف سے ہے جس کی اردو زبان میں کمی ہے۔ اس کے آگے انھی کے الفاظ میں یہ عبارت یوں ہے: ''اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس اشاعت کے بعد وہ کمی پوری ہو جائے گی بلکہ خیال ہے شاید اسے دیکھ کر دوسرے ادیب اس مفید اور دلچسپ صنف کی جانب متوجہ ہوں اور اس سے بہتر کارنامے وجود میں آئیں''۔ یہ سفر احتشام صاحب نے امریکہ کی راک فلر فاؤنڈیشن کی ترغیب کے تحت کیا تھا اور دورانِ سفر دن رات ان کا ضمیر انھیں کچوکے لگاتا رہا کہ کہیں کسی موقع پر انھیں اپنے اعتقادات اور نظریات کے خلاف کچھ کہنے کے لیے تو مجبور نہیں کیا جائے گا کیونکہ زندگی بھر انھیں اپنے آدرش ہمیشہ بہت عزیز رہے تھے۔ چلتے چلتے احتشام صاحب کی لسانی خدمات کے ایک آدھ پہلو کا ذکر بھی کرتا چلوں۔

اردو زبان کی ابتداء کے بارے میں انھوں نے اپنی کتاب اردو ادب کی تنقیدی تاریخ میں یہ وضاحت کی ہے کہ اردو کی پیدائش کی حقیقت کو سمجھنے کی سعی کرنے والوں کو شورسینی اپ بھرنش کے علاقے میں پیدا ہونے والی جدید آریائی بولیوں کا مطالعہ ضروری ہے۔ دہلی میں ایک طرف ہریانی تھی اور دوسری طرف

کھڑی بولی۔ پچھم میں پنجابی علاقہ اور دکھن میں برج بھاشا۔ کھڑی بولی جو دلّی کے بازار میں رائج تھی، میں عربی اور فارسی کے الفاظ داخل ہوتے رہے جس سے آگے چل کر ہندوستانی زبان وجود میں آئی۔ اس مطالعے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ احتشام صاحب دو باتوں کے انکاری ہیں:

اول: یہ خیال کہ اردو فارسی پر مبنی ہے۔

دوئم: اردو کا ارتقاء سندھی زبان کے ذریعہ ہوا ہے، یہی نہیں بلکہ اس کا دراوڑ زبان سے بھی کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ وہ ہم کو اس اہم نکتے سے بھی باور کراتے ہیں کہ ''اٹھارویں صدی کے خاتمے تک لفظ اردو کا استعمال زبان کے مفہوم میں نہیں ملتا، اس کی جگہ ریختہ یا ہندی کے دو ہی لفظ شاعروں کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔ ریختہ موسیقی کی ایک اصطلاح تھی اس میں راگ رانیاں ملائی جاتی تھیں۔ زیادہ تر یہ لفظ نظم کے لیے کام میں لایا جاتا تھا۔ نثر کے لیے ہندی بولتے اور لکھتے تھے۔

چودھویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے دکن میں اردو رائج ہو چکی تھی۔ اگر چہ یہ مضمون میرے ذاتی تاثرات پر مبنی ہے مگر پھر بھی جی چاہ رہا ہے کہ چند دیگر مشاہیر کی آراء بھی بیان ہو جائیں۔ پاکستان کے مشہور ادیب و شاعر سحر انصاری نے احتشام حسین کو ان لفظوں میں اپنا خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

> ''پروفیسر احتشام حسین ایک کھرے انسان تھے، ان کی شخصیت میں ایک نوع کا توازن اور اعتدال تھا۔ وہ وسیع المطالعہ اور کشادہ نظر ادیب تھے، جس طرح فیض احمد فیضؔ کو ہر طبقہ خیال نے ان کی اپنی نظریاتی وابستگیوں کے باوجود نہ صرف قبول کیا بلکہ انھیں عزیز رکھا اور ان سے محبت کی۔ اسی طرح احتشام حسین کو بھی اپنی ذاتی اور دلنواز خوبیوں کی بنا پر ہمیشہ سراہا گیا اور ان کی شخصیت و فن کبھی متنازعہ نہیں رہے۔ مولانا امتیاز علی عرشی ہوں یا مالک رام، سجاد ظہیر ہوں یا آل احمد سرور احتشام حسین کی شخصیت کے اس سحر کے سب ہی قائل ہیں۔ ایسی شخصیت کی تخلیق و تنقید میں کھرا پن ضرور موجود ہوتا ہے اور اس کے ڈھالے ہوئے سکے کھوٹے نہیں ہوتے''۔

پاکستانی ناقد ڈاکٹر سلیم اختر کے الفاظ میں:

> ''بحیثیت مجموعی احتشام حسین کے تنقیدی سرمائے کا جائزہ لینے پر یہی بات نظر آتی ہے کہ وہ نظریہ ساز نقاد نہ تھے

(بہت کم ہوتے ہیں) لیکن جہاں تک نظریے کی تشریح،
فروغ اور پھر اطلاق کا تعلق ہے تو پھر احتشام حسین منفرد
حیثیت کے حامل نظر آتے ہیں۔''

اگر زندگی میں تبدیلیاں ناگزیر ہیں تو ادب میں بھی اُن تبدیلیوں کی گونج ضرور سنائی دے گی مگر یہ بھی ٹھیک ہے کہ پرانا نہ تو یکا یک پرانا ہوتا ہے اور نہ نیا لمبے دنوں تک نیا رہ پاتا ہے۔ غالباً اسی لیے فاروقی صاحب کو ایک مضمون میں کارل پاپر Karl Pauper یاد آئے تھے جن کا قول ہے ''سائنس اور علم کی دنیا میں تصوّرات کو موقع ملنا چاہیے کہ وہ غلط ثابت ہو سکیں'' احتشام صاحب نے ایک صاحبِ ضمیر اور شریف النفس انسان کی حیثیت سے اپنے عہد کی ادبی سچائیوں کو بڑے ریاض اور عرق ریزی کے ساتھ نئی اردو تنقید میں ڈھال کر اُس صنف کو سرخرو کیا۔

پروفیسر احتشام حسین اردو کے اہم اور عہد ساز نقّاد اس لیے ہیں کہ تنقید ان کے لیے اپنے عہد کے انسان کی مکمّل وجدانی، جذباتی اور ذہنی زندگی کی عقلی اور سائنسی ترجمانی کا وسیلہ بن گئی تھی۔ تاثر پسندی، تقابلی مطالعہ یا لفظی تحقیقات ان کی تنقید کے عناصر نہ تھے بلکہ ان کی نظر میں تنقید خوبصورتی، شیرینی اور حقیقت کی جستجو کا دوسرا نام تھا۔ ''ادب لطیف'' کے مدیر نے ان سے انٹرویو میں سوال کیا تھا کہ ان کے خیال میں تنقید نگاری کا مقصد کیا ہے تو انھوں نے جواب دیا تھا ''تنقید نگاری سے میرا مقصد ادب کی حقیقت اور ماہیّت پر غور کرنا۔ شاعر اور ادیب کو اس کی تخلیقی کاوش پر اور نقّاد کو اس کے صحیح شعور و ادراک پر داد دینا اور ادب کو زندگی کے تہذیبی رشتے سے دیکھنا ہے''۔

احتشام صاحب کے انتقال کو ابھی نصف صدی بھی نہیں ہوئی ہے کہ ہمارے موجودہ ادبی منظرنامے میں کیا کچھ نہیں ہو گیا اور اب بھی ہو رہا ہے جن کی جانب احتشام صاحب کی تحریروں میں واضح اشارے مل جائیں گے۔ جن سے ہم عصر ادب کے کردار کی نوعیت اور غایت کی تفہیم بھی ممکن ہو سکے گی۔

اس میں شبہ نہیں کہ احتشام حسین کی معروضی تنقید نے بحیثیت مجموعی ہمارے عہد کی ادبی فضا کو اس حد تک منقلب کرنے کا کردار ادا کیا کہ جس کے زیر اکثر ہماری نسل کے نوجوانوں کے فنی اور فکری رویّے میں تبدیلی آئی۔ اس لیے احتشام صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اُس نسل کے بے شمار افراد کے جسم میں آج بھی جی رہے ہیں۔ بقول منظر سلیم۔

جی رہا ہوں دوسروں کے جسم میں
موت جینے سے مجھے روکے گی کیا

........☆........

'ماہنامہ کتاب' اور احتشام حسین

عابد سہیل

یادش بخیر، پچاس سال قبل ادبی رسالہ نکالنے کا خیال پیدا ہوا تو سب سے پہلے حیات اللہ صاحب سے مجلس مشاورت میں شامل ہونے کی درخواست کی۔ انھوں نے سر اٹھا کر ایک بار دیکھا اور گردن ہلا دی۔ پھر پوچھا، ''اور کون کون ہے؟'' تو میں نے کہا احتشام صاحب۔ حیات اللہ صاحب مطمئن ہو گئے۔

احتشام صاحب الہ آباد جا چکے تھے لیکن ان کے گھر کے لوگ ابھی بارود خانے کے مکان میں مقیم تھے اور وہ دسویں پندرہویں لکھنؤ کا چکر ضرور لگاتے۔

میں نے ان سے ذکر کیا تو وہ میری صورت دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں حیرت تھی، سوالات تھے۔ بھائی، بہت مشکل کام ہے، معاون کون کون ہے، تم تو 'ہیرالڈ' میں ہو اتنا وقت کہاں سے نکالو گے اور ہاں اخراجات کہاں سے برداشت کرو گے؟

میں نے ان کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا اور بس یہ اصرار کرتا رہا کہ منظوری دے دیجیے۔ آخر تنگ آ کر انھوں نے ''ہاں'' کہہ دیا اور پوچھا۔

''مدیر کون ہوگا، تم تو اپنا نام دے نہیں سکتے؟'' ---میں نے نام اور دوسری تفصیلات بتائیں تو مسکرا دیے۔ تھی بھی بات مسکرانے کی۔

مجوزہ مدیر، جمیل احمد، میرے عزیز دوست عبدالحلیم خاں کے گھر کی ملازمہ کے بیٹے تھے اور انھیں علم و ادب سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

اب احتشام صاحب میرے منصوبے کے بارے میں سنجیدہ ہو گئے اور انھوں نے کہا، ''کوئی ایسا بھی ہونا چاہیے جسے ہم جانتے ہوں'' ---لفظ ''مَیں'' ان کی گفتگو میں ذرا کم ہی استعمال ہوتا تھا، یہی حال خطوط کا بھی تھا۔

مجلسِ مشاورت میں انھوں نے اپنے نام کی شمولیت کی اجازت اس طرح دی تھی اور میرا نام اس طرح ان دونوں کے ناموں کے نیچے ٹنک گیا تھا اور احتشام صاحب کی زندگی کی آخری سانس تک اپنی جگہ قائم رہا۔

اب احتشام صاحب نے جو تھوڑی دیر قبل ادبی ماہنامہ کی راہ کے کانٹوں کا ذکر کر رہے تھے، مضامین کے لیے خطوط لکھنے کا ارادہ خود ہی ظاہر کیا اور لکھے بھی۔ رسالے کے کئی نام زیرِ بحث آئے لیکن پسند انھیں ''کتاب'' ہی آیا۔ ویسے بھی کتاب پبلشرز کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

یہ بات فروری یا مارچ ۱۹۶۲ء کی رہی ہوگی۔ نام کی منظوری آئی، ڈکلریشن داخل کیا اور دسمبر میں پہلا شمارہ شائع ہو گیا۔

ایک بدقسمت واقعہ کے علاوہ حیات اللہ صاحب نے ''کتاب'' کے سلسلے میں کبھی کوئی بات تک نہ کی لیکن قلمی تعاون انھوں نے احتشام صاحب سے زیادہ کیا۔ سبب اس کا یہ تھا کہ احتشام صاحب پر الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی سربراہی اور شعبہ کی سیاست کا بوجھ تو تھا ہی، انھیں رسائل و جرائد کے تقاضوں پر کچھ نہ کچھ لکھنا بھی پڑتا، تقریظیں اس پر مستزاد تھیں۔ بامروّت ایسے تھے کہ مسودہ بس الٹ پلٹ کے دیکھتے اور لکھ دیتے۔ حیات اللہ صاحب کے ساتھ صورت مختلف تھی۔ انھوں نے ''قومی آواز'' کے اداریوں میں کمیونسٹوں کی مخالفت اتنی کی تھی کہ کوئی ان کے ترقی پسند افسانوں کو بھی ترقی پسند ماننے کے لیے تیار نہ ہوتا۔

ترقی پسندی کی لے اگرچہ کمزور ہو گئی تھی لیکن کسی متبادل ادبی نقطۂ نظر کی عدم ترویج و اشاعت کے سبب اس کا دبدبہ اب بھی باقی تھا۔

مجبوری دونوں کی تھی، ''کتاب'' کو اچھا افسانہ مل جاتا اور انھیں افسانہ کو صاف کرنے کی زحمت بھی نہ کرنی پڑتی کیونکہ کسی بھی الجھن میں ان سے رابطہ قائم کیا جا سکتا تھا۔ ان کے افسانے ''سلام کہہ دینا'' کے مسودہ کے دو صفحات میرے پاس موجود ہیں، افسانہ صاف نہیں کیا گیا ہے اور چھوٹی موٹی تبدیلیاں اسی میں کر دی گئی ہیں۔

ابھی پہلے شمارے کی کتابت ہو ہی رہی تھی کہ احتشام صاحب سے ''دانش محل'' میں ملاقات ہو گئی۔ گفتگو کے دوران انھیں اثر لکھنوی کے کئی سال قبل کے ایک مضمون کا خیال آ گیا اور انھوں نے اس کا ذکر کر دیا۔

جوشؔ ملیح آبادی کے پاکستان جانے کے بعد صرف چند ماہ اثرؔ صاحب نے ایک مضمون میں ان کی شاعری میں زبان و بیان کی خامیوں کی نشاندہی کی تھی اور ''آجکل'' نے یہ کہتے ہوئے کہ لوگ کہیں گے ہم نے ان کے خلاف مہم چھیڑ دی ہے مضمون کی اشاعت سے معذرت کر لی تھی۔ چنانچہ مضمون غیر مطبوعہ تھا۔ ممکن ہے اپنا مضمون انھوں نے احتشام صاحب کو سنایا ہو، انھیں اس کا شوق بھی بہت تھا۔

اثرؔ صاحب سے رابطہ قائم کیا تو انھوں نے کہا کہ مضمون احمد جمال پاشا لے گئے تھے، انھی کے پاس ہے، کئی یاد دہانیوں کے باوجود اب تک واپس نہیں کیا ہے۔

احمد جمال پاشا سے مضمون حاصل کر کے میں آثر صاحب کے پاس پہنچا تو مضمون کی دستیابی سے تو وہ بہت خوش ہوئے لیکن اب اسے اپنے نام سے چھپوانے کے لیے تیار نہ تھے۔ میں نے وعدہ کیا کہ مضمون آپ کے نام سے نہیں چھپے گا اور ''ا۔ج'' کے نام سے جنوری ۱۹۶۳ء کے شمارے میں شائع کر دیا۔ اگلے شمارے میں کتابت کی دو ایک غلطیوں کی نشاندہی انھوں نے ''بقول آپ کے ا۔ج'' کے نام سے کی۔

پہلے شمارے کی اشاعت کے بعد احتشام صاحب لکھنؤ آئے تو انھوں نے باتوں باتوں میں یہ بھی کہا کہ چالیس صفحات کے رسالے میں بس تھوڑی سی چیزیں چھاپی جا سکتی ہیں، زیادہ تنوع بھی ممکن نہیں۔ میں نے اگلے شمارے ہی سے آٹھ صفحات کا اضافہ کر دیا۔

جنوری ۱۹۶۴ء میں ''کتاب'' کا افسانہ نمبر شائع ہوا۔ یہ خاص نمبر دراصل ۱۹۶۲ء کے افسانوں کے انتخاب اور وزیر آغا کے ایک مضمون پر مشتمل تھا اور ۲۱۲ صفحات کو محیط۔ یہ کام بنیادی طور سے رام لعل نے کیا تھا اور میرا حصہ بہت کم تھا۔ اس کام میں احتشام صاحب کے مشورے شامل تھے۔ میں نے ان کا وہ خط دیکھا تھا جس میں انھوں نے دو تین افسانہ نگاروں کے متبادل افسانوں کے نام تجویز کیے تھے۔ غالباً حیات اللہ انصاری کا ''سربستہ راز'' اور خدیجہ مستور کا ''ہینڈ پمپ'' انھی کا انتخاب تھا۔

یہ خاص نمبر احتشام صاحب کو بہت پسند آیا اور سچ پوچھیے تو لکھنؤ کے اپنے پروگرام سے مطلع کرنا انھوں نے اسی نمبر کے بعد شروع کیا۔ اردو داں طبقہ بھی ''کتاب'' کو سنجیدگی سے لینے لگا۔ خطوط کے کالم میں اس خاص نمبر کا ذکر خوب ہوا۔

چند ماہ بعد ''کتاب'' نے ''نئی ہندی کہانی نمبر'' شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا خیال دراصل بالکل شروع میں احتشام صاحب کے ایک مشورے ہی کی دین تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں اور خاص طور سے ہندی کے ہم عصر ادب اور رجحانات سے اردو قارئین کو باخبر رکھا جائے تو کیا اچھا ہو۔ انھوں نے کسی بھی قسم کے متشدد رویے سے اجتناب برتنے کا مشورہ بھی دیا تھا۔ ممکن ہے انھوں نے سوچا ہو کہ میں رسالہ کو ''سرخ پرچم'' نہ بنا دوں۔

اب ''کتاب'' کی نامکمل فائل الٹ پلٹ کے دیکھتا ہوں تو خوشی ہوتی ہے کہ ان کے مشورہ سے روگردانی دانستہ طور سے کبھی نہ کی۔

''نئی ہندی کہانی نمبر'' کو ترتیب دینے کے لیے ٹھاکر پرساد سنگھ کا نام احتشام صاحب ہی نے تجویز کیا تھا۔ یہ بات میں نے انھیں بتائی تو ایسا لگا جیسے ان سے خوشی چھپائے نہ چھپ رہی ہو۔

کچھ دنوں بعد انھوں نے افسانہ نگاروں اور کہانیوں کی فہرست احتشام صاحب کو بھیجنے کے لیے مجھے فراہم کر دی اور انھوں نے صرف ایک کہانی کے سامنے سوالیہ نشان لگا کر ایک دوسری کہانی کا نام لکھ دیا تو ٹھاکر پرساد سنگھ نے اپنی پسند تبدیل کر دی۔

اس وقت برسوں بعد کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے جس کا تعلق ''ہندی کہانی نمبر'' یا ''کتاب'' سے براہ راست تو نہیں لیکن کچھ ایسا غیر متعلق بھی نہیں۔

دہلی سے 'نیشنل ہیرالڈ' کی اشاعت کا آغاز بطور ہفت روزہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو ایک دن ایم۔سی۔ نے مجھ سے کہا کہ تمھارا راستہ وہی ہے، کل دفتر آنا تو احتشام صاحب کے یہاں سے ہوتے ہوئے آنا۔ احتشام صاحب کے یہاں گیا تو انھوں نے ایک لفافہ میرے حوالے کیا۔ دفتر آ کر لفافہ ایم۔سی۔ کو دینے کے بعد، شاید اپنی کارکردگی پر ان کی آنکھوں میں تحسین کے نقوش دیکھنے کے لیے، ایک منٹ کو وہیں رک گیا۔ لفافہ میرے سامنے کھولا گیا۔ مضمون کا عنوان تھا Hindi Literature Today ۔ معلوم نہیں کیسے میرا خیال تھا کہ عصری ہندی ادب پر احتشام صاحب کی گرفت اتنی نہیں ہو سکتی کہ رام بلاس شرما وغیرہ کی موجودگی میں اس موضوع پر ان سے مضمون لکھوایا جائے۔ چنانچہ حیرت میری آنکھوں میں اتر آئی جو ایم۔سی۔ نے پڑھ لی اور انھوں نے اپنے مشکل سے سمجھ میں آنے والے لہجہ میں کہا، "The best man to write on contemporary Hindi literature."

ماہنامہ ''کتاب'' کا حلقہ اشاعت بڑھا اور مجلس مشاورت میں احتشام صاحب اور حیات اللہ صاحب کی موجودگی سے اسے وزن و وقار حاصل ہوا تو توقعات میں اضافہ نے مشکلات بھی کھڑی کر دیں۔

اگست ۱۹۶۳ء کے شمارے میں ردولی کی صہبا ثمر صدیقی کا درج ذیل خط شائع ہوا۔ ''مجلس مشاورت میں جناب احتشام حسین رضوی، حیات اللہ انصاری کا نام لکھ دینا ہی کافی نہیں۔ ان حضرات کی تراوش فکر اور ادبی افادیت سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ یہ حضرات اپنے دور کے ادبی تقاضے پورے کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ دور سائنسی اور فلسفی دور ہے۔ اس سے چشم پوشی کرنا ادب کو سو سال پیچھے ڈھکیلنا ہے۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ روسو کی شاعری کی طرح آپ کا ماہنامہ بھی ایک روز شہرت دوام حاصل کر لے گا کیونکہ اس کی شاعری کے عیوب جب منظر عام پر آئے اس کا نام دوامی شہرت حاصل کر چکا تھا۔''

اگلی ملاقات میں احتشام صاحب نے اس خط کا خاص طور سے ذکر کیا تھا۔

احتشام صاحب کی رہنمائی، حیات اللہ صاحب کی قلمی اعانت اور میری بھاگ دوڑ سے ''کتاب'' کی مقبولیت کا سفر جاری تھا کہ اسے فلکِ نا ہنجار کی نظر لگ گئی۔

اکتوبر ۱۹۶۴ء کے شمارے میں کوثر چاند پوری کا افسانہ ''چورراستے'' شائع ہوا۔

افسانہ میں اختری نام کی ایک عورت سوچ رہی ہے کہ جس فیکٹری میں اس کا شوہر ملازم ہے وہ بند ہے اور تنخواہ بھی کئی مہینوں سے نہیں ملی، نویں محرم کو نیاز کیسے دی جا سکے گی۔ شوہر بھی بہت پریشان ہے اور اسی پریشانی کے عالم میں وہ گھر سے نکلتا ہے۔ ایک جگہ واقعۂ کربلا کے المیے کی تمثیل کھیلی جا رہی ہے اور اسے یزید کا پارٹ ادا کرنے کے لیے دس روپے کی پیش کش کی جاتی ہے جو وہ قبول کر لیتا ہے۔ اسٹیج پر شمر اور یزید کو دیکھ کر مجمع بے قابو ہو جاتا ہے اور انھیں لہولہان کر دیتا ہے۔ خیر وہ کسی طرح گھر پہنچتا ہے۔ اسی دوران بیوی نے کہیں سے دس روپے

حاصل کر لیے ہیں۔ وہ کہتا ہے،" کچھ روپے تو میرے پاس ہیں لیکن ان سے نیاز نہیں دی جا سکتی۔۔۔۔۔ پیٹ تو بھرا جا سکے گا، سب کو ملا ایک کر لو۔ رضوی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اختری کو دیکھتے ہوئے کہا۔"

صبح کی روشنی پھیل رہی تھی، ان دونوں کے چہرے نہ تاریک تھے نہ روشن۔ آنکھیں بجھی بجھی سی تھیں، سوچ رہے تھے کہ یہ رات کیسی تھی، کتنی بلا خیز اور اندھیری۔

یہ شمارہ ستمبر کے آخر ہی میں شائع ہو گیا تھا۔

چند روز بعد احتشام صاحب کا خط ملا جس میں انھوں نے لکھتا تھا کہ "چور راستے" سے بعض لوگوں کو تکلیف ہوئی ہے۔ چند الفاظ میں معذرت کر کے معاملہ رفع دفع کیجیے۔"[1]

قبل اس کے کہ اظہار معذرت کیا جاتا لکھنؤ کا ایک ہفت روزہ "چور راستے" کے خلاف ایک سخت اداریہ لکھ چکا تھا۔

ہفت روزہ کے اگلے شمارے میں احتشام صاحب نے کوثر چاند پوری کے دفاع میں ایک خط لکھا جس میں دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا گیا تھا کہ کوثر چاند پوری صاحب نے متعدد شیعہ اطبا پر جنھیں مغلیہ دور میں گوشۂ گمنامی کا شکار بنا دیا گیا تھا، کام کر کے ان کی خدمات کو اجاگر کیا ہے۔ (الفاظ میرے ہیں)

احتشام صاحب کے اس خط سے اخبار کا رویہ نرم تو پڑا لیکن اس نے مجھ سے اور کوثر چاند پوری صاحب سے یہ ضمانت طلب کی کہ وہ آئندہ کوئی ایسی غلطی نہیں کریں گے۔ اب احتشام صاحب کو واقعی غصہ آ گیا اور انھوں نے لکھا کہ مستقبل میں کسی قسم کی غلطی نہ کرنے کی ضمانت کون دے سکتا ہے؟ آپ دے سکتے ہیں، میں دے سکتا ہوں یا کوئی اور دے سکتا ہے؟ (الفاظ میرے ہیں)

اس خط کے بعد ہفت روزہ کا رویہ تبدیل ہو گیا اور اس نے نہ صرف یہ کہ معاملہ ختم کر دیا بلکہ یہ بھی لکھا کہ عابد سہیل صاحب اس طرح کے معاملات سے بلند ہیں۔

انھی دنوں مسعود حسن رضوی صاحب "ادیب" کی مشہور کتاب "ایران کا مقدس ڈراما" نسیم بک ڈپو شائع کرنے والا تھا۔ کتاب تیار تھی لیکن مسعود صاحب کی ہدایت پر اس کی اشاعت روک دی گئی اور وہ کئی ماہ بعد منظر عام پر آ سکی۔

اکتوبر کے شمارے کے اعلان کے مطابق نومبر کا شمارہ "علی عباس حسینی نمبر" ہونا تھا لیکن حسینی صاحب کی خواہش کے مطابق اس کی اشاعت بھی موخر کر دی گئی اور یہ نمبر (دسمبر کا شمارہ) غالباً جنوری میں شائع ہوا۔ اس شمارہ میں احتشام صاحب کے حسب الحکم ماہنامہ کتاب نے اظہار معذرت ان الفاظ میں کیا:

"چور راستے"۔ اردو کے ممتاز افسانہ نگار کوثر چاند پوری کا اسی عنوان کا ایک افسانہ کتاب کے ماہ اکتوبر (کے شمارہ) میں شائع ہوا تھا۔ اس سلسلے میں موصول ہونے والے چند خطوط اور بعض احباب کے متوجہ کرنے پر جب ہم نے اسے دوبارہ پڑھا تو احساس ہوا کہ اس سے پڑھنے

والوں کی دل شکنی بجا ہے۔ ہم ''ادارۂ کتاب، اور کوثر چاند پوری صاحب کی طرف سے اپنے پڑھنے والوں کو یقین دلاتے ہیں کہ اس افسانہ کا منشا کسی فرقہ تو دور کی بات کسی فرد واحد کو تکلیف پہنچانے کا بھی نہ تھا۔ ادارہ کو اس سہو کے لیے افسوس ہے۔

اس افسانہ اور متعلقہ ہفت روزہ کے حوالے سے علی عباس حسینی صاحب نے اپنے ۶ رجنوری ۱۹۶۵ء کے خط میں ''ماہنامہ کتاب'' کو لکھا۔

''غالباً آپ نے سرفراز میں احتشام صاحب کے خط کی خبر سنی ہوگی۔ اس پر بھی ایڈیٹر صاحب نے ایک غیر معقول ایڈیٹوریل لکھ ڈالا۔۔۔ بہر حال اب اس بحث کو ''کتاب'' میں چھیڑنے کی ضرورت نہیں ۔۔۔ انشاء اللہ آپ کی خاموشی سے کوئی خراب اثر نہیں پڑ سکتا۔۔۔ کوثر صاحب کا افسانہ چائے کی پیالی میں طوفان کے مرادف تھا۔ بس اسے اپنی موت مر جانے دیجیے۔ 'کتاب' کے آئندہ نمبر میں ایک لفظ اس کے بارے میں ہرگز نہ لکھیے۔''

اسی دوران کوثر چاند پوری صاحب نے ''قومی آواز''، ''سیاست جدید'' اور دہلی کے اخباروں میں اعلان کر دیا کہ وہ اس افسانے کو اپنی تخلیقات سے خارج کر رہے ہیں۔ ''کتاب'' کے مدیر جمیل احمد کو بھی انھوں نے لکھا، رسالہ پھر ملا ہے۔ احتشام صاحب کا ایک خط چھپا ہے۔ احتشام صاحب نے افسانہ ''چوراستے'' کے متعلق میری تحریر کی بنا پر لکھا ہے کہ میں اسے اپنی تخلیقات سے خارج کردوں گا۔ ان کے اس اعتماد کو میں مجروح نہیں کرنا چاہتا۔ مناسب ہے کہ آپ اعلان کر ہی دیں۔ یہ خط ۳ رجنوری کا ہے اس سے قبل کے خط میں انھوں نے لکھا تھا کہ اس طرح کی کوئی بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ لیکن اس وقت تک علی عباس حسینی نمبر میں معذرت کی جا چکی تھی۔ چنانچہ حسینی صاحب کی ہدایت کے مطابق بعد میں یہ مسئلہ بالکل نہ چھیڑا گیا۔

لیکن ابھی مزید سرگرانی کے اسباب باقی تھے۔

کوثر چاند پوری کے اعلان اور ''ماہنامہ کتاب'' کی معذرت خواہی سے حیات اللہ صاحب بہت کبیدہ خاطر ہوئے اور انھوں نے مجلس مشاورت سے علاحدگی اختیار کرنے کی دھمکی دیتے ہوئے ٹیلی پرنٹر کی خبروں کے کاغذ پر ایک مختصر سا خط مجھے لکھا۔ افسوس اس کا پہلا صفحہ معلوم نہیں کیا ہوا۔ دوسرے صفحہ پر انھوں نے لکھا ہے۔

''یہ واضح رہے کہ اگر اس افسانے کا ماحصل اس کے سوا کچھ نکالنے کی کوشش کی گئی تو ذیل کے یہ دونوں جملے جن پر افسانہ ٹکا ہوا ہے بے جان ہو جائیں گے۔

''لیکن ان سے نیاز نہیں دی جا سکتی۔''

''پیٹ تو بھرا جا سکتا ہے۔''

جب تک یہ دونوں جملے موجود ہیں افسانہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس سے شیعہ عقائد کو بروں سے اور برائی سے بالاتر ظاہر کیا (گیا) ہے اور افسانہ نگار کے دماغ میں ان عقائد کا

احترام ہے۔‘‘

لیکن ’’کتاب‘‘ نے مزید کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا اور احتشام صاحب کی فہم و دانش اور جرأت مندی اور کوثر چاند پوری کی سلامت روی نے ’’۔۔۔ ولے بخیر گذشت‘‘ کی صورت پیدا کر دی۔ حیات اللہ صاحب نے بھی مجلس مشاورت سے علاحدگی پر اصرار نہیں کیا۔

خاص نمبروں کے لیے میری للک اور اچھے مضامین کو فوراً شائع کرنے کے لیے عام شماروں میں بھی صفحات کے اضافے نے ’’کتاب‘‘ کی اشاعت میں بے قاعدگی پیدا کر دی، اگر چہ خاص نمبروں نے دھوم بھی مچائی۔

احتشام صاحب نے اشاعت میں بے قاعدگی کے سلسلے میں زبانی اور نرم الفاظ میں مجھے کئی بار متوجہ کیا لیکن میری حالت ’’بھائی سید تو کچھ دوانے ہیں‘‘ کی ہو رہی تھی اور میں گھر پھونک تماشہ دیکھ رہا تھا۔

قرۃ العین صاحبہ کی ہندوستان واپسی کے بعد مسیح الحسن رضوی صاحب نے ’’عینی کی واپسی‘‘ کے عنوان سے ’’کتاب‘‘ میں ایک مختصر سا مضمون لکھا۔ احتشام صاحب نے اس کی تعریف تو کی لیکن یہ بھی کہا، ’’عینی تو ان کا گھر کا نام ہے۔‘‘ تقریباً دو سال بعد قرۃ العین حیدر صاحبہ نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی دہلی کانفرنس میں جس میں انھوں نے بطور سامع شرکت کی تھی، مجھ سے کہا، ’’سہیل صاحب، مجھے ’عینی‘ کہنے کا حق ہر شخص کو حاصل نہیں۔‘‘ مجھے احتشام صاحب کی بات یاد آئی کہ ’’عینی تو ان کا گھر کا نام ہے۔‘‘

احتشام صاحب حوصلہ بھی بڑھاتے اور غلطیوں پر ٹوکتے بھی۔

مارچ ۱۹۶۷ء میں ’’کتاب‘‘ نے ۲۲۴ صفحات کا خاص نمبر شائع کیا تو احتشام صاحب نے ۱۷ اپریل کے خط میں اس کی تعریف کی لیکن۔۔۔۔

انھوں نے لکھا۔

> ’’سالنامہ بہت اچھا نکلا ہے، خاص کر افسانے بہت دلچسپ ہیں، کچھ نظمیں بھی پسند آئیں۔ نئی شاعری پر سارے مضامین یکجا ہونا چاہیے تھے۔ جس نے نمبر دے کر لکھا وہ آپ کے خیال میں سمپوزیم ہو گیا اور جس نے نمبر نہیں دیے اس نے مضمون لکھ دیا۔ بات ایک ہی تھی!
>
> ’’ترقی پسند کانفرنس (دہلی) کے متعلق رپورٹ بالکل منفی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ لوگ جنھیں ہونا چاہیے تھا نہیں تھے لیکن آج جو انتشار ہے اس میں مکمل ہم آہنگی اور اتفاق رائے کی امید ہی فضول ہے۔۔۔ ادب کو زندگی سے دور رکھنے کی جو تحریک نئی شاعری کے روپ میں ابھر رہی ہے اس سے کم سے کم ان لوگوں کو باخبر رکھنا ضروری ہے جنھیں زندگی بھی عزیز ہے۔‘‘

ہوا یہ تھا کہ لکھنؤ کے ادیبوں نے دہلی کانفرنس کا بائی کاٹ کیا تھا اور گھر کے ایک بھیدی نے ’’کانفرنس کی رپورٹ میں لنکا ڈھا دی تھی۔ لیکن یہ ساری مخالفت اور الزام تراشیاں چند ہی دنوں میں ریت کی عمارت کی

طرح ڈھیر ہوگئیں۔

''شب خون'' کا اجرا ایک عام رسالہ کی طرح ہوا لیکن دھیرے دھیرے اس نے ایک مخصوص رنگ اختیار کرلیا۔ اس رخ کی لے تیز ہوئی اور اس نے تخلیقات اور خاص طور سے افسانے کو آزادیاں فراہم کردیں تو نئے لکھنے والے اس کی طرف زیادہ ملتفت ہونے لگے۔ میں نے یہ سوچ کر کہ نئے لکھنے والوں کو کوئی متبادل پلیٹ فارم نہ ملا تو وہ بالکل ہی ادھر کے ہوکے رہ جائیں گے، داخلے کے دروازے ذرا زیادہ کشادہ کردیے، ممکن ہے مروت یا ناسمجھی میں ضرورت سے زیادہ وسیع القلبی کا مظاہرہ بھی کردیا ہو۔

''۹؍جون ۱۹۶۷ء کے خط میں احتشام صاحب نے لکھا تھا، ''رسالہ کا رنگ آہستہ آہستہ بدلنا چاہیے۔ اگر واضح طور پر کوئی تبدیلی (اعلان کے ساتھ) کی گئی تو مخالفت ہوگی۔ کل NG ملا۔ اس میں محمود ہاشمی کا خط دیکھیے۔

''۔۔۔۔آہستہ آہستہ مضامین اور نظموں کے انتخاب میں اپنا مقصد پیش نظر رکھیے۔۔۔۔ جو خط یہاں تیار کیا تھا وہ بھی چند حضرات کو بھیج کر مضمون منگایئے۔''

احتشام صاحب کو ''کتاب'' کے مالی مسائل کا بھی اندازہ تھا جنھیں حل کرنے کے لیے وہ کچھ نہ کچھ کوشش کرتے رہتے، ایک آدھ جگہ کامیابی بھی ملی لیکن ان لوگوں نے جو خطوں میں لمبے لمبے لکچر دینے کے علاوہ ہر وقت نظریہ کی دہائی دیتے رہتے، کچھ نہ کیا۔ دہلی کانفرنس میں ''کتاب'' کو مالی استحکام فراہم کرنے کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس نے نہ صرف یہ کہ کچھ نہیں کیا بلکہ کمیٹی کے کسی رکن نے سالانہ خریداری تک قبول نہ کی۔

۱۲؍ستمبر ۱۹۷۰ء کے ایک خط میں احتشام صاحب نے لکھا تھا۔

''یہاں ایک ڈاکٹر اقبال ماہر صاحب ہیں، پختہ اور اچھا کہتے ہیں۔ کوئی غزل بھیجی تھی جس کو کئی مہینے ہوئے۔ اب کچھ اور بھیج رہے ہیں۔ انھیں کتاب میں جلد شائع کیجیے۔''

''کتاب'' کے سلسلے میں احتشام صاحب ہمیشہ فکر مند رہتے تھے۔ ایک خط میں انھوں نے لکھا تھا کہ دہلی میں ''کتاب'' کے حالات پر کچھ باتیں ہورہی تھیں۔ اس پر بھی نظر رکھیے۔ ایک دوسرے خط میں ایک جملہ تھا۔ کتاب کو بند نہیں ہونا چاہیے۔ افسوس یہ دونوں خط اس وقت مل نہیں رہے ہیں۔

۳۰؍دسمبر ۱۹۷۰ء کے خط میں احتشام صاحب سال نو کی مبارکباد دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

۱۔ رسالہ کے سلسلے میں ''جیپ'' سے بات ہوئی ہے۔ آپ ایک فارمل قسم کی درخواست انگریزی میں ٹائپ شدہ مع شرح اشتہارات کے

Publicity Officer
Jeep Flashlight
N.Yusuf Road, Allahabad

کے پاس بھیج دیجیے۔ مجھے بھی اطلاع دیجیے۔ امید ہے کام ہوجائے گا۔

۲۔ یعقوب صاحب ابھی نہیں ملے۔ کئی جال بچھائے ہیں، مل جائیں گے۔ ان کا محلہ یا تو میر گنج ہوگا یا میراپور، یہاں میرپور کوئی جگہ نہیں۔ پریس سے پتہ مل جائے گا۔

۳۔ اریب پر مختصراً لکھ دوں گا۔

احتشام صاحب کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''اعتبار نظر'' کتاب پبلشرز نے چھاپا تھا۔ میں نے رائلٹی کا چیک ڈرتے ڈرتے پیش کیا۔ مجھے دیکھتے رہے، پھر بولے، ''یہ رقم 'کتاب' کے لیے رکھ لیجیے۔''

میں نے اصرار کیا، کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ آخر میں نے کہا، ''اس وقت تو چیک رکھ لیجیے، جب بھی ''کتاب'' کو شدید ضرورت ہوگی لے لوں گا۔''

انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں رخصت ہونے کے لیے کرسی پر سے اٹھا تو انھوں نے چیک اٹھا کر میری طرف بڑھایا، کچھ کہے بغیر۔

میں نے چیک میز پر رکھ دیا۔ انھوں نے ہاتھ کو جنبش دی، تو میں نے انھیں روکنے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن اس کی ضرورت نہیں پڑی۔

یہ واقعہ 1- نوراللہ روڈ کا ہے۔

میری چھوٹی بہن کے اچانک انتقال کے بعد احتشام صاحب لکھنؤ آئے تو انھوں نے اپنے پروگرام کی کوئی اطلاع نہ دی۔ دفتر سے واپس آیا تو معلوم ہوا کہ وہ آئے تھے۔ میں ان سے ملنے انصار صاحب کے یہاں گیا۔ انھوں نے تعزیت کا ایک لفظ نہ کہا، شاید مجھے اس سانحہ کی یاد نہیں دلانا چاہتے تھے۔

میں کسی مضمون کے سلسلے میں مذبذب ہوتا تو احتشام صاحب کو بھیج دیتا۔ وہ ایسے مضامین تک کو جن میں انجمن کی نکتہ چینی ہوتی لیکن دہن نہ بگڑا ہوتا عام طور سے مسترد نہ کرتے۔ دو ایک مضامین کے لیے انھوں نے تحفظات ظاہر کیے تو میں نے انھیں شائع نہیں کیا۔

۲۳/ جولائی ۱۹۷۱ء (؟) کے خط میں احتشام صاحب لکھتے ہیں۔

۱۔ ذکا کا مضمون خاصا دلچسپ ہے۔ میرا خیال ہے چھپنا چاہیے۔

۲۔ خطوط پر گول مول دستخط کر دیے ہیں۔ اصل دستخط ایڈیٹر ہی کے ہونے چاہیے، کچھ خطوں پر چند سطریں لکھ دی ہیں، اندازہ ہوجائے گا خط کس کے نام ہے۔ مجتبیٰ کا خط افکار کراچی کے پتہ پر اور ممتاز کا خط اسلامیہ کالج، کراچی، کے پتہ پر جائے گا۔ ممتاز نے کہیں گھر بنا لیا ہے۔ ابھی پتہ نہیں معلوم۔

۳۔ بیوی ایک تعزیت کے سلسلے میں جا رہی تھیں۔ کاغذات جلدی کی وجہ سے بھیج رہا ہوں۔

۴۔ ایڈیٹوریل میرے نام سے نہیں جانا چاہیے۔ کچھ لکھ کر چند دنوں میں بھیج دوں گا۔ بغیر نام کے رہے۔

۵۔ اثر صاحب پر ''نیا دور'' نے سب سے وعدے لے لیے، اب فوری طور پر تو غالباً کوئی بھی نہ لکھ سکے گا۔ جلدی کیوں کیجیے۔ آہستہ آہستہ مضامین یکجا ہوجائیں تو خاص نمبر کی شکل میں نکال دیجیے۔ مضامین

کے لیے اعجاز صاحب سے کہوں گا۔

اگست ۱۹۷۲ء کے خط میں لکھتے ہیں:

آپ نے یہ نہیں لکھا کہ ایڈیٹوریل پہنچا یا نہیں۔ ایک مضمون بھیج رہا ہوں۔ سال بھر تک اب کسی رسالے میں کچھ نہیں لکھوں گا۔

یہ خط انتقال سے تین سوا تین مہینے قبل کا ہے۔ ایڈیٹوریل ان کے انتقال کے بھی بہت بعد ملا۔ ان کے نام کے بغیر چھاپنا اچھا نہ لگا اور ان کے نام سے چھاپنے کو وعدہ خلافی سمجھا۔ آخر، کوئی چالیس سال بعد یہ انکشاف کرتے ہوئے کہ احتشام صاحب نے اپنی زندگی کے آخری ڈیڑھ دو برسوں میں ''کتاب'' کے چند اداریے لکھے تھے، اب سے کوئی سال ڈیڑھ سال قبل یہ اداریہ ''روزنامہ آگ'' میں ان کے نام سے چھپوادیا۔

یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کو احتشام صاحب کا انتقال ہوا تو مجھے لگا کہ رسالہ نے بھی دم توڑ دیا۔ لیکن احتشام صاحب کی یادوں کو زندہ رکھنے کے لیے ''کتاب'' کی اشاعت جاری رکھنا ہے، یہ بھی سوچا۔ ویسے اس خبر پر یقین ہی نہیں آتا تھا۔

۱۹۷۲ء کے خصوصی نمبر کا دوسرا حصہ پریس جانے والا تھا۔ غالباً ولی الحق صاحب نے ''شمع مکتب علم و ادب خاموش'' سے ان کا سال وفات (۱۹۷۲ء) نکالا۔ اسی ''تاریخ وفات'' کے ساتھ پورے صفحہ پر ان کی تصویر چھاپی اور سیاہ حاشیے میں اداریہ جس میں اعلان کیا گیا تھا، ''کتاب'' چند ماہ بعد مرحوم کے شایان شان احتشام حسین نمبر پیش کرے گا جو ان کے فن اور زندگی کو محیط ہوگا۔

لیکن یہ ہو نہ سکا اور اگلے سال سوا سال میں چند شماروں کی اشاعت کے بعد ''کتاب'' تاریخ کا حصہ بن گیا۔

احتشام صاحب ہوتے تو یہ نہ ہونے دیتے۔

........☆........

سید احتشام حسین : کچھ یادیں

● رتن سنگھ

چہرے پر ذہانت کی چمک ایسی کہ جیسے پورنماشی کا چاند چمک رہا ہو۔

کسی نہ کسی سوچ میں غلطاں جیسے کوئی مہارشی فکر کی بلندی پر پہنچا، اسے تامر پتروں پر اُتارنے کے لیے اُتاولا ہو رہا ہو۔ چہرہ گول، رنگ گندمی........!

اپنی عمر سے چھوٹے لوگوں سے ملتے وقت چہرے پر مُسکراہٹ یوں پھیل جاتی ہے جیسے شفقتوں کی بوچھار کر رہے ہوں۔

دور سے آتا ہوا دیکھتے تو لگتا جیسے مجسم شرافت، لکھنوی تہذیب کے جامے میں ڈھل کر چلی آرہی ہے۔

یہ ہے سیّد احتشام حسین کی شخصیت جس کا عکس میرے اندر دمکتا ہوا، مجھ سے اکثر کہتا رہتا ہے:

''کوئی کہانی لکھی؟''

اور مُجھے کوئی کوئی نہ کہانی لکھنی پڑ جاتی ہے۔

اب تک میں نے جیسا لکھا، جو کچھ لکھا سب احتشام صاحب کو سنانے کے لیے لکھا۔

تن کر وہ کہتے ہیں:

''ابھی ایک آنچ کی کمی ہے!''

''اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اور لکھتا ہوں۔

خدا کرے آنچ کی کمی کا احساس دلاتے رہیں۔

اور میں آخری سانس تک لکھتا رہوں۔

اس کمی کو دور کرنے کی کوشش سے ہی فن میں نکھار آتا ہے۔

اس کمی کو دُور کرنے کی کوشش ہی مزید لکھوا رہی ہے اور لکھواتی رہے گی۔ اور یہ حالت صرف میری نہیں۔ اُس پوری نسل کی ہے، جو ساٹھ کی دہائی میں احتشام حسین کی نگرانی میں ادب کی دُنیا میں داخل ہوئی اور پھر

دیکھتے ہی دیکھتے برِصغیر کے ادبی آسمان پر چمکتی کہکشاں کا حصّہ بن گئی۔

کِس کِس ستارے کا نام لوں: ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس، رضیہ سجاد ظہیر، رام لعل، مسیح الحسن رضوی، قاضی عبدالستار، قیصر تمکین، اقبال مجید، عابد سہیل، آغا سہیل، بشیشر پردیپ، احمد جمال پاشا، سبط اختر، حسن عابد۔ ان ناموں میں اظافہ کیجیے: مرحوم نجم الحسن کا جو انگریزی کے صحافی تھے۔ پروفیسر رضوان حسین جو علی گڑھ یونی ورسٹی کے انگریزی کے صدر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

ان سب ستاروں نے سیّد احتشام حسین جیسے چاند کے ارد گرد گھوم کر روشنی پائی ہے۔

پروفیسر احتشام حسین صاحب کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے، میں آپ کے سامنے پھر سے خود کو وہی سیالکوٹ کے ایک گاؤں سے لکھنؤ آیا ہوا اُجڈ دیہاتی محسوس کر رہا ہوں جو لکھنؤ کے ادبی ماحول کی چکا چوند کو دیکھ کر بوکھلایا، گھبرایا سا رہتا تھا۔

میری دوسری کہانی تھی شاید۔

پروفیسر آل احمد سرور کے ہاں ادبی جلسے میں پڑھنے کے لیے پہنچا۔

صدارت احتشام صاحب کی تھی۔

جلسے میں پچیس کے قریب حاضرین۔

میں نے کہانی کا عنوان بولا۔ ''جنگ نہیں ہوگی کم بختو!''

جیسے خراب یا غلط شعر پڑھنے پر ہوٹنگ ہو۔ زبردست۔

کچھ اسی قسم کی احتجاجی آوازیں، آگ کی لکیر بن کر میرے وجود میں اُتر گئی۔

''کہانی کا نام ہی 'غیر ادبی' ہے تو کہانی کیسی ہوگی؟''

میرے پسینے چھوٹ گئے۔

لکھنؤ کے لب و لہجے میں کہوں تو ''اِتّی سِتّی'' گم۔

ایسے میں احتشام حسین صاحب نے بڑی مہربان نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہا ''آپ کہانی سُنائیں''

میں نے کہانی سُنائی۔ سُنائی کیا؟ بس خود ہی خود کو نہیں سُن رہا تھا۔ اس لیے دوسروں نے سُنی یا نہیں۔ کچھ پتہ نہیں۔

کسی نے کیا کہا؟

کچھ پتہ نہیں۔

میرے لیے جیسے تیسے جلسہ ختم ہوا۔

باہر آیا تو سب کے منع کرنے کے باوجود میں نے کہانی پھاڑی اور نالی میں پھینک دی۔

کہانی پھینک دی تھی۔

لیکن احتشام صاحب کی شفقت آج بھی دل میں سنبھالے ہوئے ہوں۔

احتشام صاحب کسی نہ کسی افسانہ نگار کو یونیورسٹی کے طلبا کو کہانی سُنانے کے لیے بلایا کرتے تھے۔

میں نے بھی سنائی تھی ایک کہانی بی۔ اے۔، ایم۔ اے۔ کے طلبا کو۔

اس کے بعد ایک روز کافی ہاؤس میں بیٹھا تھا کہ ایک طالب علم میرے پاس آیا اور پوچھا:

''سر، آپ ایم اے ہیں؟ اُردو میں''

''نہیں بھیا، میں صرف دسواں پاس ہوں'' میرا جواب تھا۔

طالب علم غالباً حیران کہ صرف دسویں پاس اور کہانی کار؟

اس بات چیت کو ساتھ والی میز پر بیٹھے انگریزی کے اُستاد، ہندی کے نقاد کرشن نارائن ککڑ سُن رہے تھے۔ وہ میری کہانیوں کو خود ہی ہندی میں ترجمہ کروا کر اپنے میگزین میں شایع کر کے مجھے دس روپے معاوضے کے طور پر دیا کرتے تھے تاکہ ایک شرنارتھی کی کچھ مالی مدد ہو جائے۔

اُس لڑکے کے جانے کے بعد اُنھوں نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلوایا، اور کہا:

میں اگلے سال تمھیں بی اے میں اپنے کالج میں داخل کر رہا ہوں۔ تم پاس کیسے کرتے ہو؟ یہ تمھاری ذمّے داری ہے۔

میں نے بی اے پارٹ وَن (پہلے سال) کا امتحان دیا تو اتفاق دیکھیے کہ اُس سال نمبروں کا چارٹ بنانے کا کام یونیورسٹی نے احتشام صاحب کو سونپ دیا۔ میں نے ۱۹۴۵ میں میٹرک کیا تھا۔ اب تیرہ سال بعد بی اے کا امتحان دیا، تو نتیجہ جاننے کی بے قراری......!

اب کے ڈاکٹر محمود الحسن رضوی تب کے ''بحری قزاق''، ہم لوگوں کا واحد ذریعہ تھے احتشام صاحب تک پہنچنے کا۔ ان کے قریبی رشتے دار ہونے کی حیثیت سے وہ انھی کے یہاں رہتے تھے۔ لیکن نار دمُنی کی اتنی ہمّت کہاں کہ برہما جی سے کہے کہ ایسا کردو۔

وہ کوشش ناکام ہوئی تو اُنھی کے ہمّت بندھانے پر میں خود ہی حاضر ہو گیا۔ ایک دن۔

ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں عرضِ مدّعا کیا۔ ڈرتے ڈرتے۔

'مجھ سے زیادہ ڈرتے ڈرتے احتشام حسین یوں اٹھ کر گئے، جیسے کسی پاکباز کو کوئی گناہ کرنے کے لیے زبردستی دھکیل رہا ہے۔

جو بات پوشیدہ ہے پوشیدہ ہے۔ پوشیدہ رہنی چاہیے۔ اُسے ایک راست باز ظاہر کیسے کرے؟

اپنی اُوپری منزل سے احتشام صاحب ایسے لوٹے جیسے ممنوعہ پھل کھانے کی پاداش میں حضرت آدم کو

آسمان سے زمین پر بھیج دیا گیا ہو۔
چہرے پر گناہ کا احساس!
آنکھوں میں میرے پاس ہونے کی خوشی!!
لیکن احتشام صاحب جیسا ذہین آدمی۔
وہ منہ سے کچھ نہیں بولے۔
اُن کی آنکھوں کی چمک نے ہی مجھے وہ خوشی دے دی جو میں حاصل کرنے گیا تھا۔
مُورکھ مورکھتا نہ کرے تو وہ مُورکھ کیسے کہلائے؟ میرے تجسّس نے ایک اور سوال کر دیا۔ نمبر سیکنڈ ڈویژن کے ہیں یا نہیں۔
گناہ کے بعد مزید گناہ!
احتشام حسین صاحب اِس امتحان کو بھی پاس کر گئے۔ اُن کی آنکھوں کی چمک نے میری خوشی میں اضافہ کر دیا۔
یہ خوشی صرف اُس لمحے بھر کی تھی۔
اُن کے گھر سے باہر آ کر، مجھے اس خوشی کے موقع پر بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر پایا۔
آج تک نہیں معاف کر پایا۔
وہ لمحہ یاد آتا ہے تو شرمندگی سی محسوس ہوتی ہے۔
شیطان بن کر، کیوں ایک شریف انسان کو گناہ کا مرتکب کیا۔

●

بی اے کرنے کے بعد، ریڈیو کی نوکری حاصل کرنے کے لیے میں نے کل ہند تحریری مقابلہ پاس کر لیا۔ اب صرف انٹرویو کا مسئلہ تھا۔
اپنی زندگی کا رخ بدلنے کے لیے میرے لیے یہ آخری موقع تھا۔
میں احتشام صاحب کے پاس گیا۔ چاہتا تھا کہ وہ کسی سے میری سفارش کر دیں۔ فرمانے لگے:
"میرے کہنے سے اگر تم لے بھی لیے گئے تو تمھیں ساری عمر احساسِ کمتری رہے گا کہ سفارش سے آیا ہوں۔ اپنے آپ پر بھروسہ نہیں پیدا کر پاؤ گے۔ مجھے تمھاری قابلیت پر پورا بھروسہ ہے۔"
اور پھر اُنھوں نے میرے لیے ایک سرٹیفکیٹ لکھا جس میں درج تھا کہ یہ ایک ہوشیار کہانی کار ہے۔ میری نیک خواہشات ان کے ساتھ ہیں۔
یہ سرٹفکیٹ دکھانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

مجھے چُن لیا گیا۔

اُس بڑے انسان نے میرے اندر بھروسہ پیدا کر کے، میری ترقی کی راہیں روشن کر دیں۔ میرے اندر بھروسہ پیدا کرنے والے اُن کے الفاظ میرا قیمتی سرمایہ ہیں۔

بات اُن دنوں کی ہے جب احتشام صاحب پروفیسر ہو کر الٰہ آباد جا چکے تھے۔ وہ کسی وقت لکھنؤ تشریف لائے تو میں اور عثمان غنی ملنے گئے۔ میں نے گزارش کی کہ افسانے کے تعلق سے آپ سے کچھ تفصیلی بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔

فرمانے لگے۔ کل دانش محل اتنے بجے پہنچ جاؤ۔ جہاں آپ لوگ کہو گے وہیں بیٹھ لیں گے۔ اس مقصد کے لیے احمد جمال پاشا سے بات کی تو وہ اپنے گھر پر نشست کے لیے تیار ہو گئے۔ وقتِ مقرّرہ پر ہم جمال صاحب کے ہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ حضرت دوستانہ حرکت کر گئے ہیں اور گھر سے غائب ہیں۔

اب کیا کریں؟

ایسے میں 'عثمان غنی ہی 'مشکل کُشا' ہے۔

ہم لوگ احتشام صاحب کو لے کر اُن کے گھر پہنچے۔

اُن کی بوڑھی والدہ نے خندہ پیشانی سے احتشام صاحب کا استقبال کیا۔

کافی دیر تک افسانے پر بات ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا جب کہانی پر اَ کہانی پے در پے حملے کر رہی تھی نئے نظریے کی دُھند میں کچھ سجھائی نہیں پڑتا تھا۔

میں اس راہ کا نیا مسافر۔

ایسے میں احتشام صاحب کی باتوں کی روشنی میں اس راہ پر بھٹکنے سے بچ گیا۔

آج پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو کہانی ہنستی کھیلتی، اپنی خوشبو پھیلاتی آگے بڑھتی دِکھائی دیتی ہے۔

اور اَ کہانی اُس کا تو ٹھنٹھ بھی دِکھائی نہیں دیتا۔

●

احتشام صاحب سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔

اس کے بعد.....

اس کے بعد وہ، اُن کا نظریۂ ادب، نظریۂ حیات، اُن کی ساری شخصیت، اُن سب لوگوں کی تحریروں میں زندہ ہے، جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔

یا وہ لوگ جو اُن کی ذات سے فیض یاب ہوئے۔

........☆........

ذاتِ والد کے بعض نمایاں گوشے

● ڈاکٹر جعفر عسکری

میں نے جب سے ہوش سنبھالا، والد کی جس صفت نے مجھے شدت سے متاثر کیا وہ تھی ان میں پوشیدہ صفتِ اعتدال، جس کی درخشانی ان کے پورے وجود کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیرِ مادر کے علاوہ شاید ان کی شریانوں میں ایک دوسرا حیات بخش حیاتین بھی جاری وساری تھا (جسے عرقِ اعتدال کا نام دیا جا سکتا ہے)، جس کے اثر ونفوذ نے تمام زندگی انھیں ادب وزندگی کے محاذوں پر ہمیشہ سُرخ رُو اور سربلند رکھا۔ لباس میں، رفتار میں، گفتار میں، اطوار میں اور خصوصیت سے کردار میں اُن کے جوہرِ اعتدال نے وہ بلندی حاصل کر لی تھی جہاں سے بال برابر بھی نشیب میں جانے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

درحقیقت والد کے متوازن ومعتدل مزاج ہونے کی سب سے روشن مثال یہ ہے کہ جس زمانے میں چرخِ زرّیں پر ترقی پسند ادبی تحریک کا آفتاب اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ افروز تھا، تو اس وقت کے چلن کے مطابق مذکورہ تحریک میں شامل اچھے خاصے شاعروں اور ادیبوں میں زلفیں دراز رکھنے، بادہ گساری سے شب وروز لُطف اندوز ہونے، پہروں چائے خانوں اور ہوٹلوں میں بیٹھ کر مُلکی وبین الاقوامی ادبی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل پر تبادلۂ خیالات اور بحث وتکرار نے گویا وبائی شکل اختیار کر لی تھی، تو ایسے ہنگامہ خیز اور انقلاب انگیز حالات میں بھی ایسی تمام مروجہ رسموں اور علتوں سے بے نیاز ہو کر والد نے سنجیدگی، تن دہی اور بیدار مغزی کے ساتھ مضمون نگاری کا عمل جاری رکھا اور اپنے تنقیدی مضامین کے ذریعے مارکسی اور سائنسی نقطۂ نظر سے شعروادب کی تشریح وتوضیح فرماتے رہے نیز ادب وزندگی کے باہمی روابط کے حوالے سے مدلّل ومنطقی خیالات کا اظہار فرماتے رہے۔ اس تفصیل کا اجمال یہ ہے کہ ترقی پسندی کے عہدِ تابناک سے جدیدیت کے غلغلے تک والد

نے ادراک، احتیاط اور اعتدال کا پرچم کبھی سرنگوں نہ ہونے دیا، بلکہ ہمیشہ اسے سربلند رکھا!

والد کی اعتدال پسند اور متوازن طبیعت اور شخصیت کی مثالیں ان کی زندگی میں یوں رچی بسی ہیں کہ انھیں فراموش کر کے اُن کی شخصیت کا حقیقی ادراک ممکن نہیں ہے۔ سماجی اور پیشہ ورانہ زندگی سے صرف نظر کرتے ہوئے اگر محض ادب کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ ترقی پسند ناقدین میں شاید والد وہ واحد ترقی پسند تنقید نگار ہیں جنھیں اختلاف کرنے والے قدامت پسندوں، رجعت پسندوں اور جدیدیوں کے قہر وغضب کا خصوصیت سے نشانہ بننا پڑا۔ لیکن ہر نوع کے مخالف کو ہمیشہ والد نے علمی استدلال، تہذیبی شائستگی اور فطری اعتدال سے جواب دیا۔ تمام ادبی زندگی میں والد کو جن معترضین سے نبرد آزما رہنا پڑا ان میں اختر علی تلہری، کلیم الدین احمد، وہاب اشرفی، عبدالمغنی، حامدی کاشمیری، خلیل الرحمٰن اعظمی، وارث علوی، ظہیر صدیقی، اور یہاں تک کہ عمیقؔ حنفی جیسے جدید شاعر نے بھی والد کے ادبی نظریات اور ترقی پسندانہ افکار کے علاوہ ان کی ذات پر رکیک جارحانہ اور متعصبانہ حملے کیے، لیکن والد کے ہاتھ سے اعتدال کا دامن کبھی نہ چھوٹا۔ غالباً عمیقؔ حنفی وہ واحد جدید شاعر ہیں جس نے نظریاتی اختلاف ظاہر کرنے میں پاس ولحاظ کی تمام حدیں پار کر دی تھیں۔ مندرجہ ذیل مثالیں ہی ان کے ذہنی دیوالیہ پن کو بے نقاب کر رہی ہیں:

- ''احتشام حسین روایتی تنقید نگار ہیں اور فریقِ ثانی کے جُملوں کو سیاق وسباق سے نوچ کر نئے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔''
- ''احتشام حسین قدامت پسند اور رجعت پسند ہیں۔''
- ''احتشام حسین فن کار سے اس کی آزادیِ خیال کو سلب کر لینا چاہتے ہیں......''

مذکورہ بالا مثالیں جدید فکر ونظر کے ترجمان ''شب خون'' سے اخذ کی گئی ہیں۔ مذکورہ مثالیں پیش کرنے کا بنیادی مقصد محض یہ باور کرانا ہے کہ بے بنیاد اور مخاصمانہ الزام تراشیوں کا جواب دینے میں بھی والد نے عالمانہ شان اور اعتدال پسندی کا راستہ کبھی نہیں چھوڑا۔ چنانچہ عمیقؔ حنفی کی بہتان تراشیوں کا مندرجہ ذیل جواب ہی دراصل اُن کی معتدل اور متوازن فکر کا ترجمان ہے:

> ''......... میں ایسی ادبی بحثوں کو نامناسب اور غیر مفید سمجھتا ہوں جو صرف دو شخصیتوں کے لیے مباحثے کی شکل اختیار کر لیں اور اصول سے ہٹ کر ذاتیات تک پہنچ جائیں لیکن اپنی طرف سے اسے ختم کرنے کے لیے چند سطریں لکھتا ہوں۔ گفتگو سنجیدہ، علمی اور مدلّل ہو تو بحث گوارہ بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ عمیقؔ حنفی صاحب کے اس خط کا کیا جواب ہو سکتا ہے جو کہ تجتی پر مبنی

ہے کہ میں کہتا ہوں کہ جدید شاعری ہی جدید شاعری ہے اور
صرف وہی جدید شاعر ہے جسے موصوف کی دی ہوئی سند
حاصل ہو۔"

اعتدال کے علاوہ والد کی شخصیت میں سرشتِ مروّت کا بھی بڑا خصوصی مقام ہے۔ اعتدال ہی کی طرح خوے مروّت بھی ان کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھی۔ اس وصفِ خاص کے تذکرے کے بغیر بھی والد کی کتابِ حیات کبھی مکمل نہیں ہو سکتی ہے۔ دراصل والد کی اس جبلّت نے بڑھ کر ایک علّت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ لاکھ کوشش کے باوجود وہ کبھی اپنی اس فیاضانہ و کریمانہ خصلت سے خود کو آزاد نہ کرا سکے۔ بلکہ اگر گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ تمام عمر وہ اپنی اس شریفانہ سرشت کی وجہ سے تقریباً خسارے میں رہے۔ والد کی مروّت کے حوالے سے اُن کے دیرینہ رفیق پروفیسر آلِ احمد سرور اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

"وہ بڑے بامروّت آدمی تھے۔ ہم لوگ اکثر ان کے
دیباچوں اور مقدموں کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اس لیے کہ
اس معاملے میں ان کی فیاضی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔
وہ انکار کر ہی نہیں سکتے تھے۔"

ماخوذ از "کچھ یادیں کچھ تصویریں" مطبوعہ "ایوانِ اردو" (جولائی ۲۰۱۲ء)

اس سلسلے میں والد کے عزیز شاگرد پروفیسر محمد حسن نے بھی ہمدردانہ اظہارِ خیال فرمایا ہے:

"اُن سے ملنے آنے والوں کی عجیب عجیب قسمیں ہیں۔ ان میں شاید سب سے زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جو اپنی کتابوں پر دیباچہ لکھانے آتے ہیں۔ میں نے خود ایک سے زیادہ مرتبہ ان سے اس "مقدمہ بازی" کی شکایت کی ہے۔ انھوں نے ایسے ادیبوں کے مجموعوں پر بھی دیباچے لکھے جو اس کے مستحق نہیں تھے۔ کسی نے دہلی میں مجھ سے کہا کہ انجینیئرنگ کی ایک ابتدائی کتاب پر احتشام صاحب نے دیباچہ لکھا۔ میں نے آ کر ان سے فریاد کی کہنے لگے:

"لوگ یہ تو پڑھ لیتے ہیں کہ احتشام صاحب نے دیباچہ لکھا ہے لیکن یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ احتشام صاحب نے کیا لکھا ہے۔ لوگ آتے ہیں، جو کچھ اُلٹا سیدھا سمجھ میں آتا ہے لکھ دیتا ہوں۔"

اور اس کی گواہی خود میں دے سکتا ہوں کہ ایسی ہی گھٹیا کتاب کے دیباچہ کے لیے جوشؔ ملیح آبادی سے لے کر ان کے ایک عزیز تک کے خطوط موصول ہوتے دیکھے ہیں۔"

(ماخوذ از "احتشام صاحب" مطبوعہ "ایوانِ اردو" دہلی، احتشام حسین نمبر جولائی ۲۰۱۲ء)

اس میں شک نہیں کہ اپنی خوے مروّت کی وجہ سے تمام عمر وہ مختلف قسم کی پریشانیوں سے دوچار رہے۔ لیکن وہ اپنی اس عادت سے مجبور تھے۔ ان میں پوشیدہ بے لوث انسانیت، موروثی شرافت اور مشرقیت کو

سمجھے بغیر اُن کی اس عادت اور فیاضی کا سُراغ حاصل کرنا نہایت مشکل ہے۔ اس کے علاوہ ان کے سینے میں پنہاں اس دلِ دردمند کا حقیقی عرفان حاصل کیے بنا، جو آبگینوں کو ٹھیس پہنچانے کا روادار نہیں تھا، والد کی سرشتِ مروت و رحم دلی کو نہیں سمجھا جا سکتا۔

بہر حال مروّت اُن کی ذات میں یوں حُلول کر گئی تھی کہ اس سے الگ اُن کی شخصیت کا تصوّر بھی محال ہے۔ بعض حضرات اُن کی اس کمزوری کا فائدہ اُٹھا کر ناجائز طریقے سے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں اس مقام تک پہنچ گئے جس کے کہ وہ اہل نہیں تھے۔

والد کو طبعِ سادہ سے وہی تعلق تھا جو عبد کو معبود سے اور ناخن کو گوشت سے ہوتا ہے۔ سادگی ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۵۲ء میں جب وہ ''راک فیلر فاؤنڈیشن'' (امریکہ کا تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی ادارہ) کی جانب سے یک سالہ امریکی دورے پر روانہ ہو رہے تھے اس وقت جا کے کہیں انھوں نے کوٹ، پتلون اور شرٹ اور ٹائی زیبِ تن کرنے کا آغاز کیا تھا ورنہ چوڑی مُہری کا پائجامہ اور شیروانی ان کے محبوب ترین ملبوسات میں شامل تھے۔ وہ امریکہ اور یورپ سے لوٹنے کے بعد تک لکھنؤ یونی ورسٹی سائیکل سے جاتے تھے۔ بعد میں رکشے سے جانے لگے تھے۔ یہی حال لکھنے پڑھنے کا تھا۔ انھوں نے اپنے بیش تر مضامین چار پائی پر ترچھے ہو کر لیٹ کر، یا بستر پر بیٹھ کر تحریر کیے ہیں۔ میز کرسی کا استعمال انھوں نے شاذ و نادر ہی کیا تھا۔ اکثر والد رسائل و کُتب کا مطالعہ بھی چار پائی پر لیٹ کر یا بیٹھ کے فرماتے تھے۔ کھانے پینے میں بھی انھوں نے ہمیشہ سادہ کھانے کو ترجیح دی اور مرغّن غذاؤں سے پرہیز کیا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ وہ پیچش کے پرانے مریض تھے۔

درحقیقت ان کی سادگیِ طبع میں اُس مشرقی اور قصباتی رنگ کو بھی بڑا دخل تھا جس کی گرد میں کھیل کر وہ جوان ہوئے تھے۔ ان کی طبعِ سادہ کا دائرہ نہایت وسیع تھا جس نے پھیل کر اُن کی پوری شخصیت کو مقناطیسی بنا دیا تھا۔ بقول فراق گورکھپوری:

> ''احتشام صاحب کے مزاج میں سادگی بڑی پاکیزہ صورت اختیار کر گئی تھی۔ ہر طرح کے تکلف اور تصنّع سے بَری، رَچی اور گھلاوٹ سے بھری ہوئی شخصیت دوسروں کو جیت لینے کی صفت رکھتی تھی۔ ان کا انکسار دوسروں کو احساسِ کمتری کا شکار کر دیتا تھا۔
>
> میں بھی احتشام کے سامنے احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا تھا۔ حالاں کہ آج وہ یہ بات مجھ سے سُنتے تو مجھ پر بگڑ جاتے۔ کتنا پیارا تھا میرا شاگرد''

(ماخوذ از "خلوصِ سراپا"۔ مطبوعہ "شاہکار"۔ نومبر، دسمبر ۱۹۷۳ء، احتشام نمبر ص ۴۷)

مذکورہ بالا خصائل وصفات کے علاوہ اگر ان کی شخصیت میں سے حُزنیہ پہلو کو نظر انداز کر دیا جائے تو شاید یہ اُن کی شخصیت کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی ہوگی۔ غم کی ایک ناشگفتہ لہر تھی جو سر سے پا تک اُن کی ذات کا محاصرہ کیے ہوئے تھی۔ خود والد نے اپنی بعض تحریروں میں اس کی نشاندہی کی ہے۔ اس نوع کی سب سے واضح مثال اُن کے سفرنامے "ساحل اور سمندر" سے پیش کی جاسکتی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

"امریکہ کا سفر! اور وہ بھی اس طرح کہ اس کے لیے بہت سی آسانیاں فراہم ہو جائیں، بادی النظر میں بے حد دل خوش کُن موقع ہے لیکن میں اپنی افتادِ طبع کو کیا کہوں، میرے لیے نہیں ہے۔ رنج مجھے بیحد رنجیدہ کر دیتا ہے اور خوشیاں زیادہ خوش نہیں کرتیں۔ میں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں اور جن اقتصادی مشکلات میں تعلیم حاصل کی تھی، پھر ایک ملازمت ملتے ہی اس سے جس طرح چمٹ گیا تھا، اس میں کبھی اس بات کا خیال بھی نہیں آتا تھا کہ تحصیلِ علم کے لیے باہر جاسکوں گا......."

(ماخوذ از "کشمکش اور سمجھوتہ"۔ مطبوعہ "ساحل اور سمندر"۔ ص۔ ۹)

لیکن اگر ان کی پیشہ ورانہ زندگی میں درپیش بعض واقعات اور زیادتیوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو والد کی زندگی کا غم انگیز پہلو زیادہ حقیقی شکل میں نمایاں ہوتا ہے۔ لکھنؤ یونی ورسٹی میں جہاں وہ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۶۱ء تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے وہاں پہلا حادثہ ۱۹۴۶ء میں یہ پیش آیا کہ ان کو ریڈر نہ بنا کر ایک نووارد کو ریڈر بنایا گیا۔ اس کے لیے خود والد نے کبھی کوئی شکوہ یا احتجاج تو بہر حال نہیں کیا، لیکن وہ متاثر ضرور ہوئے تھے۔ دوسری حقیقت اس سے بھی زیادہ المناک ہے کہ جب تک والد لکھنؤ یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ رہے، پروفیسر نہیں ہو سکے۔ اس سازش کا تذکرہ تفصیل سے راقم اپنے بعض مضامین میں کر چکا ہے۔ جس روز والد الہ آباد یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر اور صدرِ شعبہ ہوئے اس کے کچھ عرصے کے بعد ہی شعبۂ اردو لکھنؤ یونی ورسٹی میں پروفیسر شپ آگئی۔ کیا ان حوادث سے والد کے قلب و ذہن مجروح نہ ہوئے ہوں گے۔ الہ آباد یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں بھی بالکل آخری زمانے میں، دو اساتذہ نے ان کو ایک ریسرچ ایسوسی ایٹ کے تقرر کو لے کر کافی دنوں تک مسلسل اور بلا ناغہ ذہنی اذیتوں میں مبتلا رکھا جس کے وہ مزاجاً عادی نہیں تھے۔ اس واقعے کی تفصیل میرے دیگر مضامین میں پیش کی گئی ہے۔

........☆........

پروفیسر احتشام حسین سے مصاحبہ

● ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

ہرگانوی : اصولِ نقد کے اعتبار سے نقاد کتنے قسم کے ہوتے ہیں؟

احتشام حسین : جہاں تک اصولِ نقد یا اظہارِ نقد یا اظہارِ خیال کا تعلق ہے، عام طور سے ہمیں تین قسم کے نقاد ملتے ہیں۔ ایک وہ جو چند اچھے اچھے نقادوں کے قابلِ لحاظ اقوال اور تصورات کو اپنے ذہن میں یکجا کر لیتے ہیں اور خوش ذوقی کے ساتھ انھی کے سہارے تنقیدی خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح ان کے ادبی ذوق کی نشوونما ہو جاتی ہے۔ لیکن انھیں اس بات کی جستجو نہیں ہوتی کہ وہ ان نقادوں کے نقطۂ نظر یا فلسفۂ خیال کا بھی علم حاصل کریں جن کے بیان سے انھوں نے اپنا سرمایۂ فکر اکٹھا کیا ہے۔ دوسری قسم ان نقادوں کی ہے جو تنقید کے مختلف نقطہ ہائے نظر میں کسی ایک کو سب سے زیادہ مناسب اور درست سمجھ کر منتخب کر لیتے ہیں اور اسی کے استعمال میں اپنی ذہانت اور سوجھ بوجھ کا ثبوت دیتے ہیں۔ اگر ان کا یہ انتخاب فلسفیانہ بصیرت اور وسیع مطالعہ کا نتیجہ ہوتا ہے تو وہ اوریجنل نہ ہونے کے باوجود مطالعۂ ادب اور اظہارِ مطالب کا ایک ایسا اطمینان بخش طریقہ پیش کرتے ہیں جس میں تخلیقی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور جس پر نگاہ رکھنے سے ادب فہمی کی منزل میں بہتوں کی رہنمائی ہوتی ہے۔ تیسری قسم کے نقاد وہ ہیں جو کسی خاص انداز کے فلسفۂ ادب اور اصولِ نقد کے خالق قرار دیے جا سکتے ہیں۔ یہ نقاد جرأت کر کے مطالعۂ ادب اور ماہیتِ ادب کے متعلق ایسے خیالات کا اظہار کرتے ہیں جو چاہے مکمل طور پر آسودگی بخش نہ ہوں لیکن اپنی انفرادیت، ندرت اور فلسفیانہ گہرائی کی وجہ سے دنیائے فکر میں اپنا مقام پیدا کر لیتے ہیں۔ نقادوں کی یہ تیسری قسم بہت کمیاب ہے۔ یہ لوگ حقیقتاً فلسفی اور مفکر ہوتے ہیں اور انھی کے ہاتھوں تنقید فلسفہ کے دائرے میں داخل ہوتی ہے اور ایک بلند اور آزاد ادبی مقام حاصل کرتی ہے۔

ہرگانوی: کیا تنقید منطق کی طرح ہر علم وفن کی تشکیل اور تعمیر میں شریک ہے؟ اصولِ نقد کا مطالعہ کرتے ہوئے کس علم کی ضرورت پڑے گی؟

احتشام حسین: تنقید منطق کی طرح ہر علم وفن کی تشکیل اور تعمیر میں شریک ہے بلکہ وجدان اور جمال کے جن گوشوں تک منطق کی رسائی نہیں ہے تنقید وہاں پہنچتی ہے۔ رنگ وبُو اور کیف وکم کے غیر متعیّن دائرہ میں صرف قدم ہی نہیں رکھتی بلکہ ابہام میں توضیح کا جلوہ اور بے یقینی میں تعیّن کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ اس طرح تنقید کے سلسلہ میں جب اُصول کی گفتگو کی جائے تو طبعی اور اکتسابی علوم کے علاوہ ایک اور ایسے علم سے کام لینے کی ضرورت پڑے گی جو ان علوم کے منافی نہ ہوتے ہوئے بھی ان سب کے علاوہ کوئی بات ایسی بتا سکے جس سے فیصلہ میں مدد ملے۔ ممکن ہے وہ کئی علوم کے امتزاج کا نتیجہ ہو اور ممکن ہے کسی علم کے ساز کا کوئی ایسا تار ہو جس پر جستجوے حقیقت کے بحرانی اضطراب میں اچانک کسی نقاد کی اُنگلی پڑ گئی ہو۔ ایسی حالت میں نقّاد کے الفاظ اور اس کا فیصلہ بالکل عجیب نظر آئیں گے۔ لیکن حقیقتاً وہ زمان ومکان میں پیدا ہونے والی تغیر پذیر حقیقت ہی کا پرتو ہوں گے۔ اس طرح ادبی اور فنّی کارناموں کے متعلق کبھی کبھی اتنے متضاد، متخالف اور مختلف فیصلے نظر آتے ہیں جن سے تنقید کی قدریں بالکل مشکوک ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس وقت یہی خیال ہوتا ہے کہ اصول وغیرہ کچھ نہیں۔ اپنے ذوق اور اپنی پسند کی بات ہے اور اگر ذوق یا پسند کے لیے سانچے بنائے گئے تو وجدان، شعور اور لاشعور کی اس دنیا میں جانا پڑے گا جہاں ناپ تول کے معمولی سانچے کام نہیں آسکتے۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ جب کسی ادیب، شاعر، فن کار یا کسی ادبی اور فنّی کارنامے کے متعلق رایوں میں اختلاف ہوتا ہے تو مختلف رائیں دینے والے اسے انفرادی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا مسئلہ سمجھ کر خاموش نہیں رہ پاتے بلکہ ایک دوسرے پر حملے کرتے ہیں اور ''اصولی'' بحثیں شروع ہو جاتی ہیں۔ فیصلے انفرادیت کے تابع نہیں رہ جاتے بلکہ ان میں بعض ایسی مشترک قدروں کی تلاش ہوتی ہے جن پر اگر تمام لوگ نہیں تو کچھ ہی متفق ہو جائیں۔

ہرگانوی: کیا اصولِ نقد متعین کرنے والے ایک ہی مقصد کی جانب گامزن ہوتے ہیں یا بہت سی انفرادی، سماجی اور دوسری وجہوں سے ان کے ذہن میں نتیجہ پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ بعد میں صرف دلیلیں فراہم کی جاتی ہیں؟

احتشام حسین: اصول اگر ہَوا میں بنتے ہوتے تو کوئی دُشواری نہ ہوتی۔ اگر ان کے بنانے والے سماجی زندگی سے بے نیاز ہوتے تو مشکلوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ادب زندگی کی کشمکش کے اظہار کے طور پر پیدا ہوتا ہے اسی طرح تنقید بھی صرف ادب پیدا کرنے والوں کے احساسات اور تجربات کی توضیح کی پابند نہیں ہوتی بلکہ اسی کے ساتھ خود تنقید کرنے والے کے سماجی ماحول اور ذہنی افتاد کی مظہر ہوتی ہے۔ نقّاد کو فکر کے دو کرّوں میں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ وہ کرّہ جس کی تخلیق ادیب نے کی تھی اور وہ کرّہ جس نے نقاد کی نظر بنائی ہے۔ ان دونوں کرّوں کی زندگی رنگ وروپ اور آب وہوا میں مماثلت بھی ہو سکتی ہے اور مخالفت بھی، بُعدِ زمانی

بھی ہوسکتا ہے اور بُعدِ مکانی بھی۔ نقّاد کا دونوں سے واقف ہونا ضروری ہے تا کہ اس کا فیصلہ یک طرفہ اور غلط نہ ہو۔ اصولِ نقد بناتے وقت اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔

ہرگانوی : نقاد کی ضرورت ہے بھی یا نہیں؟ اور اگر ہے تو نقاد کا کام کیا ہے؟

احتشام حسین: اچھے ادیب اور اچھے نقاد کم سہی لیکن ہیں دونوں۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دونوں کا وجود ضروری ہی نہیں لازم وملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر کوئی لکھنے والا اس لیے لکھتا ہے کہ لوگ اسے پڑھیں، اس سے لذّت حاصل کریں یا فائدہ اٹھائیں تو پھر پڑھنے والوں میں سے کسی نہ کسی کو یہ کہنے کا حق بھی پہنچتا ہے کہ مصنّف اپنے مقصد میں کامیاب ہوا یا ناکام —— ایک لحاظ سے نقاد کا کام مصنف سے زیادہ مشکل ہوتا ہے کیوں کہ اس کی ذمہ داری، رایوں اور تنقیدوں کے اس انبار کو دیکھتے ہوئے بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے جو ہر تصنیف کے گرد جمع ہوجاتے ہیں۔ ایک اچھا نقاد نہ تو انھیں نظر انداز کرسکتا اور نہ انھیں کی بنیاد پر فیصلہ کرسکتا ہے۔ اس لیے جب وہ اصولِ نقد معیّن کرنے کی کوشش کرے گا تو جہاں اس کے لیے ادب اور ادیب کو اچھی طرح جاننا اور سمجھنا ضروری ہوگا وہیں ہر عہد میں ادب کے متعلق جو رائیں پیش کی گئی ہیں ان کا سمجھنا بھی ضروری قرار پائے گا۔ اس کا کام اس حیثیت سے تجریدی شکل اختیار کرنے کے بجائے، بہت سے متعلقات اور روابط کے پیچیدہ اور دشوار راستوں سے گزرے گا اور ان روابط کی حیثیت عام طور سے سماجی ہوگی جس میں انفرادی نفسیات سے لے کر اجتماعی نفسیات اور سماجی علوم تک شامل ہوں گے۔

ہرگانوی : تنقید نگاری سے آپ کا مقصد ادب کی تاریخ مرتب کرنا ہے یا ہمعصر ادب پر اثر انداز ہونا؟

احتشام حسین : تنقید نگاری سے میرا مقصد ادب کی حقیقت اور ماہیت پر غور کرنا، شاعر اور ادیب کو اس کی نرم تخلیقی کاوش پر، نقاد کو اس کے صحیح شعور اور ادراک پر داد دینا اور ادب کو زندگی کے تہذیبی رشتے میں دیکھنا ہے۔ اس سلسلے میں تاریخِ ادب کے بعض پہلو بھی واضح ہوجاتے ہیں اور ہمعصر ادب کے بارے میں بعض خیالات کا اظہار بھی اس طرح ہوجاتا ہے کہ سنجیدہ مطالعہ کرنے والے ان سے متاثر بھی ہوسکیں۔ میری یہ خواہش ضرور ہے کہ اگر میرے تنقیدی خیالات مدلّل اور مُفید معلوم ہوں تو میرے عہد کے ادیب ان پر نگاہ رکھیں۔ میں اپنے خیالات کو صحیح سمجھتا ہوں، اسی لیے پیش کرتا ہوں لیکن میرا یہ اصرار نہیں کہ آپ بھی اس طرح انھیں صحیح مان لیں جیسے میں مانتا ہوں۔

ہرگانوی : تنقید کی نوعیت کا مسئلہ پیچیدگی اختیار کرلیتا ہے؟

احتشام حسین : میں نے آج تک کسی شاعر یا ادیب کو اس تنقید کی مخالفت کرتے نہیں دیکھا جس میں اس کی یا اس کی تخلیق کی تعریف وتحسین کی گئی ہو، چاہے وہ کتنی ہی سطحی ہو یا کتنے ہی پیچ در پیچ دلائل کے ساتھ کی گئی ہو۔ مخالفت اسی کی طرف سے ہوتی ہے، جس کی تعریف مبالغہ کے ساتھ نہیں ہوتی (ان چند انصاف پسندوں کی بات نہیں جن کی بات دوسروں کو عجیب معلوم ہوتی ہے)۔ مجھے اس صاف گوئی کے لیے معاف کیا جائے۔ لیکن یہ بات سو فی صدی میرے مشاہدے میں آتی رہی ہے۔ میں یہی دیکھتا ہوں اور برابر یہ سوچتا رہا ہوں کہ غلطی کہاں اور کس کی ہے؟

کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید دونوں قسم کے لوگ مجبور ہیں۔ لکھنے والا اپنی تخلیق کو اچھی اور بے عیب چیز سمجھنے پر اور پڑھنے والا مطالعہ کے بعد اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا اظہار کرنے پر۔ اگر یہ اظہار محض تاثراتی ہوگا جب بھی، سخن گسترانہ، پہلو اور مقام جنبشِ ابرو نکل ہی آئیں گے۔

ہوگانوی : کیا کوئی ایسی تنقید ہو سکتی ہے جسے فنِ تنقید سے دلچسپی رکھنے والے، تخلیقی فن کار اور عام قاری یکساں طور پر اطمینان بخش پائیں؟

احتشام حسین : میرا جواب نفی میں ہے۔ اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہر نقاد اپنی ہر تحریر کو ایسی سطح پر نہیں رکھ سکتا جس سے ہر ناقد، ہر قاری اور ہر ادیب مطمئن ہو سکے۔ نقاد کو یہ سمجھ کر لکھنا چاہیے کہ وہ کسی کو کچھ سکھا رہا ہے، کسی کی رہنمائی کر رہا ہے، کسی کو ادبی رموز و نکات کے سمجھنے میں مدد دے رہا ہے، کسی کے سامنے اپنا سوچا سمجھا نقطۂ نظر پیش کر رہا ہے۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اسے تمام لوگ پڑھیں گے، متفق ہوں گے یا پسند کریں گے۔ وہی پڑھیں گے اور وہی اس سے سیکھنے کی کوشش کریں گے جنھیں اس کی ضرورت محسوس ہوگی، جن کی آنکھوں میں وہ عینک ٹھیک اُترے گی اور جو اس کے استعمال سے واقف ہوں گے۔

ہرگانوی : اگر سارے اہم تخلیقی اور تنقیدی ادب کو بہ غور دیکھا جائے تو ادیب اور نقاد میں طرزِ اظہار اور مواد دونوں کے متعلق اختلافات ملتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

احتشام حسین: اہم اختلافات زیادہ تر اس حقیقت سے متعلق ہوں گے جس کا اظہار کیا گیا ہے۔ ہاں، اس نقاد سے یقیناً ادیب اور شاعر کو ناخوش ہونے کا حق حاصل ہے جو بغیر سوچے سمجھے یا محض اپنی انفرادی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کی بنا پر عام انسانی تجربات اور محسوسات کو نظر انداز کر کے شعر و ادب کے متعلق رائے دیتا ہے۔ ایسے ہی نقادوں کے خلاف ہمیشہ شاعروں اور ادیبوں نے آواز بلند کی ہے۔ لیکن صورتِ حال اگر اس کے برعکس ہو تو نقاد کو بھی فن کار سے اختلاف کا حق حاصل ہوتا ہے۔ جہاں ادراکِ حقیقت اور حُسنِ اظہار میں ہم آہنگی ہوگی وہاں ادیب اور نقاد کا اختلاف ختم ہو جائے گا یا اگر ہوگا بھی تو بہت معمولی ہوگا۔ پھر بھی یہ مطالعہ کی چیز ہے کہ ادیب اور نقاد کے اختلافات کی اہمیت کیا ہوتی ہے۔ چیخوف نے کہا ہے کہ نقاد وہ مکھی ہے جو گھوڑے کو ہل چلانے سے روکتی ہے۔ ٹینی سَن نے سے ادبیات کے گیسوؤں میں جوؤں سے تشبیہ دی ہے۔ فلابیر نے تنقید کو ادب کے جسم پر کوڑھ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ تو بڑے بڑے فن کار ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹا ادیب اور شاعر بھی نقاد کو گالیاں دے لیتا ہے۔ اس لیے اس اختلاف کی بنیاد کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ لیکن اس کو محض معمولی، نفسیاتی یا طبعی اختلافات تک محدود رکھنا اس مسئلہ کی اہمیت کو کم کرنا ہوگا۔

ہرگانوی : تنقید کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے بعض اوقات ''تخلیقی تنقید'' کی ترکیب استعمال کی جاتی ہے اور اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ تاثراتی یا جمالیاتی تنقید کو تخلیقی تنقید کا مرتبہ دیا جانا چاہیے۔ اس کا مطلب کیا؟

احتشام حسین: اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ چوں کہ ایسی تنقید، فکر کے خارجی پہلوؤں سے دامن بچا کر کسی ادب

پارے کے متعلق محض جمالیاتی تاثرات کا اظہار کرتی ہے اس لیے اس کی حیثیت تخلیقی ہوئی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر ایسی تنقید کو تخلیقی کہا جا سکتا ہے جس میں تنقید نگار کی بصیرت، حقیقت کو سمجھنے کی لگن یا غور و فکر کی روح شامل ہو۔ اس مفہوم میں کوئی تنقید تخلیقی نہیں کہی جا سکتی جس مفہوم میں ہم تخیلی شاعری، ڈراما، ناول یا افسانے کو تخلیقی ادب کہتے ہیں۔ اس لیے تنقید کو سرسری مفہوم میں تخلیقی کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا، امریکی نقادوں نے ''تنقید کے سلسلے میں 'تخلیقی' کے لفظ کو جس مفہوم میں استعمال کیا ہے اسے تاثراتی تنقید کی ایک شکل کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔

ہرگانوی: بعض نقادوں کا خیال ہے کہ تنقید نگار کا کام ادب کے متعلق فیصلہ کن انداز میں رائے دینا نہیں ہے بلکہ ان کیفیات کو دُہرا دینا ہے جو ادیب پر تخلیق کے وقت طاری ہوئی تھیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

احتشام حسین: اس گروہ کی نمائندگی کسی نہ کسی شکل میں وہ تمام نقاد کرتے ہیں جنھیں تاثر پسند کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کی سب سے زیادہ پُرجوش حمایت اور دلچسپ وضاحت امریکہ کے ایک نقاد اسپنگارن نے کی ہے اور اپنے نقطۂ نظر کا نام ''تنقیدِ جدید'' اور ''تخلیقی تنقید'' رکھا ہے۔ اُردو میں بھی شعوری اور غیر شعوری طور پر اس نقطۂ نظر کے حامی، پیرو اور ترجمان موجود ہیں۔ اس لیے اس پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ تاثراتی تنقید کا نظریہ مختصر لفظوں میں یہ ہے کہ ادب تاثر ہے اور اس کی تنقید بھی محض ان تاثرات کا مجموعہ ہے جو کسی تصنیف کے پڑھتے وقت پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ ان ادبی نتائج و افکار کو سماجی اقدار کی روشنی میں پرکھا جائے۔ اسپنگارن نے انھیں ذرا فلسفیانہ انداز میں پیش کر کے اس کا نام تخلیقی تنقید رکھ دیا۔ یہیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شعور کا معیار بدلنے سے الفاظ کے معنی کس طرح بدل جاتے ہیں۔ تنقید کے لیے تخلیق کی صفت اس طرح استعمال کرنا خود تخلیق کے مفہوم کے متعلق اُلجھن پیدا کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کسی کتاب کو پڑھنا اور اس سے لطف حاصل کرنا ہی اصل تنقید ہے۔ اسی پُرلطف اثر پذیری کو تنقید کہنا چاہیے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ایک کتاب پڑھ کر کوئی اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہے کہ اس کا اس پر کیا اثر ہوا۔ گویا تنقید کا اصل کام ان کیفیات کی باز آفرینی ہے جو کسی شاعر یا ادیب پر گزری تھیں۔ اسی تنقید اور تشریح میں کیفیات کی باز آفرینی بھی تو نہیں ہو سکتی کیوں کہ کسی اور پر گزرے ہوئے اثرات کو پوری طرح اپنے اوپر طاری کرنا ناممکن ہے اس لیے کہ جذبات خاص قسم کے محرکات اور پیچیدہ حالات کے تحت پیدا ہوتے ہیں۔ اسی لیے تنقید کا یہ نظریہ، فیصلہ اور رائے زنی سے بچنے اور ادب کو سماجی ذمہ داری سے بچانے کا ایک ذریعہ ہے، تنقید نہیں ہے۔

ہرگانوی: ایسی تنقید کو اسپنگارن نے تخلیقی کیوں کہا؟

احتشام حسین: یہ بھی بہت دلچسپ اور پُرلطف بحث ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اگر ہم لوگ تاثرات کے معاملہ میں حساس ہوں اور ان کے اظہار کرنے پر بھی قادر ہوں تو ہم میں سے ہر شخص ایک ایسی نئی کتاب کی تخلیق کرے گا جو اس کتاب کی جگہ لے لے گی جس کے مطالعہ سے ہم نے وہ تاثرات حاصل کیے تھے۔ فن کار کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار اسپنگارن کے خیال میں تخلیقی عمل ہے۔ وہ صاف یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ ادب یا تنقید کا یہ کام نہیں ہے کہ

وہ کسی اخلاقی یا سماجی مقصد کا اظہار کرے یا اسے آگے بڑھائے۔

ہرگانوی: ادب کی تخلیقی تنقید کا مقصد کیا ہوتا ہے؟

احتشام حسین: ادب کی تخلیقی تنقید کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ نقاد بھی ادیب کے خیالات کی بنیاد کو ڈھونڈ کر اس کی ادبی کاوشوں پر اعلیٰ ادبی رنگ میں اظہارِ خیال کرے اور ادیب کے سماجی شعور کا جائزہ لے، فن کی نزاکتوں پر نگاہ ڈالے اور عام پڑھنے والوں کی رہنمائی کرے۔ اگر کوئی نقاد اس سے بچتا ہے تو وہ تنقید کا حق ادا نہیں کرتا۔

ہرگانوی: کچھ نقاد تقابلی مطالعہ کو سب سے اچھا تنقیدی مطالعہ قرار دیتے ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

احتشام حسین: تقابلی مطالعہ ہمیشہ ناقص ہوتا ہے۔ کیوں کہ تقابل کے تمام عناصر کو پیشِ نظر رکھنا تقریباً ناممکن ہے۔ اور اگر ایک یا کئی اہم پہلو نظر انداز ہو جاتے ہیں تو نتائج بالکل غلط ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح کچھ نقاد موضوعات کے اعتبار سے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں، کچھ سارے ادب کو کلاسیکی اور رومانی میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ اور ہر شاعر اور ادیب کو اس چوکھٹے میں بٹھانا ضروری سمجھتے ہیں۔ کچھ تحقیقی میلان رکھتے ہیں اور صرف لفظی مطالعہ کو اہم جانتے ہیں۔ ان کی ساری قوت اس پر صرف ہوتی ہے کہ مختلف نسخوں میں کسی خاص لفظ کی کیا کیا شکلیں ملتی ہیں۔ اس ضمن میں بہت سی کام کی باتیں بھی نکل آتی ہیں۔ لیکن انھیں تنقید سے کوئی خاص واسطہ نہیں ہوتا کیوں کہ اس میں بھی ادب کے اندر پیش کی جانے والی سماجی اور طبقاتی کشمکش پر غور کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔

ہرگانوی: کیا آپ کی دانست میں آپ کی تنقید سے ہمعصر ادب کو کوئی فائدہ پہنچا ہے اور کیا ہمعصر لکھنے والوں نے کسی طور پر آپ کی تنقیدی فکر سے کوئی اثر قبول کیا ہے؟

احتشام حسین: یہ سوال کہ میری تنقید نگاری سے ہمعصر ادب کو کوئی فائدہ پہنچا ہے یا نہیں یا کسی ادیب نے میرا اثر قبول کیا ہے یا نہیں۔ مجھ سے پوچھنے کا نہیں ہے۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ایسا اثر کبھی بہت واضح نہیں ہوتا۔ ہمارے ادیب اتنے فراخ دل بھی نہیں ہیں کہ وہ اس کا اعتراف کریں۔ میں اپنی باتیں اسی اُمید پر کہتا رہا ہوں کہ کچھ لوگوں کو اس سے ادب کے مسائل کو سمجھنے اور اچھے بُرے ادب کے پرکھنے میں مدد ملے گی۔ میں لوگوں کی کمزوریوں، حماقتوں یا تعصبات سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا بلکہ ان کے ذہن اور علم کو کریدتا ہوں۔

ہرگانوی: آپ گزشتہ ادب کے بارے میں کیوں لکھتے ہیں؟

احتشام حسین: میں گزشتہ ادب کے بارے میں اس لیے لکھتا ہوں کہ حال کے ادب کی طرح وہ بھی ادب ہے، وہ بھی پڑھایا جاتا ہے اور اسے بھی پڑھایا جانا چاہیے۔ میں بھی اسے پڑھتا ہوں۔ اس کو سمجھنا اور اس سے لُطف لینا چاہتا ہوں۔ میں ہر اچھے ادب کی طرح اسے بھی زندگی کی دستاویز سمجھ کر پڑھتا ہوں۔ اس کی مدد سے اس عہد کے مزاج، ذہن، کردار، عقائد، خیالات کی کشمکش اور زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر کبھی جذباتی یا جمالیاتی حظ نہیں حاصل ہوتا تو ذہنی حظ حاصل ہو جاتا ہے۔ ماضی کے اچھے ادب نے مجھے کبھی مایوس نہیں کیا ہے۔ جب

اس کی دنیا سے لوٹا ہوں دامن بھرا ہوا تھا۔ اس کے متعلق اظہار خیال کیوں نہ کروں؟ میرا یہ بھی خیال ہے کہ گزشتہ ادب کے مطالعہ کے بغیر جدید ادب کو سمجھنا بھی ممکن نہیں ہے کیوں کہ ادب، تہذیب کی طرح ایک نا قابلِ شکست تسلسل ہے۔

ہرگانوی: ہم عصروں پر لکھنے میں کبھی جھجک محسوس ہوئی ہے۔ ہوئی ہے تو کیوں؟

احتشام حسین: جی ہاں ہمعصروں پر لکھنے میں اکثر جھجک محسوس ہوئی ہے۔ ممکن ہے یہ میری فطری کمزوری ہو۔ مجھے آبگینوں کو ٹھیس لگانے میں لطف نہیں آتا۔ جہاں تک ہوسکتا ہے اس سے بچتا ہوں۔ نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کسی کا دل دُکھے۔ کوشش کرتا ہوں کہ ہم عصروں کی تخلیقات کے زیادہ سے زیادہ اچھے پہلوؤں کا ذکر کروں۔ انھیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتا ہوں۔ اور کمزوریوں پر ہمدردانہ نگاہ ڈلتا ہوں۔ اگر مجبوراً ایسی باتوں کا ذکر کرنا ہی پڑتا ہے جو مجھے درست نہیں معلوم ہوتیں تو ان کا اظہار بھی دل آزاری کے انداز میں نہیں کرتا۔ اب اسے کیا کروں کہ ایک کی تعریف دوسرے کو ناگوار ہوتی ہے۔ ویسے انسان ہی ہوں۔ ممکن ہے کبھی کبھی طنز کے پیرایہ میں کوئی سخت بات قلم سے نکل گئی ہو۔ احتیاط ضرور کرتا ہوں۔ ہمعصروں میں کچھ ایسے ہیں جن کی 'آزردگی بے سبب' کا علاج میرے پاس نہیں۔ ورنہ غالباً کوئی شخص مجھ سے اس پر ناخوش نہیں ہوگا کہ میں نے اس کے متعلق لکھتے ہوئے کینہ جوئی یا حسد پروری سے کام لیا ہے۔ میری تحریروں کی کم مائیگی، خیالوں کی نارسائی اور ناپسندیدہ استدلالی روش سے کچھ لوگ ناآسودہ ہوں تو یہ دوسری بات ہے۔ اب رہا یہ کہ ہم عصروں پر لکھتے ہوئے جھجک محسوس ہونا چاہیے یا نہیں، تو میرا خیال ہے کہ اگر نہ ہو تو بہت اچھا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ ہمیں ایک دوسرے کے خلاف گندگی اُچھالنے یا بھٹیاروں کی طرح کوسنے کاٹنے کا حق حاصل ہے۔ علمی حدوں کے اندر رہ کر یہ جھجک کم سے کم بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن چونکہ بہت سے دوست کسی جادو کے ذریعہ فوراً نیت کا پتہ بھی لگا لیتے ہیں۔ گروہ بندی کا مجرم بھی ٹھہرا دیتے ہیں اس لیے جھجکنا پڑتا ہی ہے۔ لاعلمی، کند ذہنی اور کم بینی کا الزام اتنا تکلیف دہ نہیں ہوتا جتنا بد نیتی یا اندھی جانبداری کا۔ اس لیے میں احتیاط کرتا ہوں۔ مجھ میں زمانہ سازی کی زیادہ طاقت ہے نہ لڑنے کی۔ وہ پیمبرانہ مزاج بھی نہیں ہے کہ اپنے کو خلقِ خدا کی اصلاح پر مامور سمجھ کر چھیڑ چھاڑ کر سب کو راہِ راست پر لانے کی فکر کرتا رہوں۔ پھر بھی غالباً میں نے ہمعصروں کے متعلق ہمدردانہ بہت کچھ لکھا ہے۔

ہرگانوی: اگر تقسیم کے بعد اُردو میں تنقید نہ لکھی جاتی تو اس سے ہمارے ادب کی تاریخ میں کیا فرق پڑتا؟

احتشام حسین: ''جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟'' ہر طبع آزمائی محض ذہنی ورزش ہے۔ یہ بتانا ناممکن ہے کہ اگر تقسیم کے بعد تنقید نہ لکھی جاتی تو ہمارے ادب کی تاریخ میں کیا فرق پڑتا۔ یہ سوال تنقید ہی نہیں ہر صنفِ ادب کے متعلق پوچھا جاسکتا ہے۔ اگر ناول، افسانے، داستانیں، مثنویاں، قصیدے نہ لکھے گئے ہوتے تو کیا ہوتا؟ معلوم نہیں کیا ہوتا۔ آج کل جو کچھ ادب کے نام پر لکھا جارہا ہے اس سے کیا ہورہا ہے اور کیا ہونا چاہیے؟ کچھ لوگوں کے لیے بہت کچھ ہورہا ہے۔ کچھ کے نزدیک ادب کی تخلیق سے ''گردشِ ہفت آسماں'' میں کوئی فرق نہیں پڑ رہا ہے۔ ایسے سوالوں پر

علمی حیثیت سے غور کرنا وقت ضائع کرنا ہے۔ دوستوں میں بیٹھ کر تھوڑی دیر کے لیے پہیلیاں بوجھنے کے انداز میں قیاس آرائی کرتے رہنا، دلچسپی کا مشغلہ ہوسکتا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتا ہوں کہ اگر تنقید نہ لکھی گئی ہوتی تو آپ یہ سوال ہی نہ پوچھتے! تقسیم کے بعد تنقید تو سخت افراتفری کا شکار رہی ہے۔ اس کے اثر یا بے اثری کا کیا سوال! یہ سوچیے کہ اگر ارسطو نہ ہوتا، شیکسپیئر نہ ہوتا، گوئٹے نہ ہوتا، ٹالسٹائی نہ ہوتا، فردوسی نہ ہوتا، بادلیئر نہ ہوتا، کافکا، سارتر نہ ہوتے تو کیا ہوتا؟ میں سمجھتا ہوں، اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔ کچھ عقلی گدّے لگائے جاسکتے ہیں اور کچھ چٹکلا بازی ہوسکتی ہے، جسے تنقید سے کوئی واسطہ نہیں۔

ہرگانوی: آپ ادب کو قاری کی حیثیت سے پڑھتے ہیں یا نقاد کی حیثیت سے؟

احتشام حسین: نقاد الگ کوئی مخلوق نہیں ہے، وہ بھی قاری ہے۔ شاید کچھ زیادہ باعلم اور ہوشمند۔ عام قاری کے مقابلے میں اس کا ذہن بے ترتیبی میں ترتیب اور انتشار میں وحدت تلاش کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ اس فرق کے باوجود نقاد بھی قاری ہی رہتا ہے۔ اور اگر وہ قاری نہ ہو تو نقاد کیسے ہوگا؟

ہرگانوی: تنقید لکھتے ہوئے آپ کا مخاطب ادب کا قاری ہوتا ہے یا ادیب؟

احتشام حسین: تنقید لکھتے وقت میں خود اپنے آپ سے بھی مخاطب ہوتا ہوں، قاری سے بھی، ادیب سے بھی اور دوسرے تنقید نگاروں سے بھی۔ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ بیک وقت سب سے مخاطب ہوں۔ اس کی توضیح کئی مضامین میں کرچکا ہوں۔ مختصراً پھر عرض کرتا ہوں۔ باقاعدہ حد بندی نہ ہونے کی کیا وجہ ہے؟ معمولی رائے زنی، تبصرہ نویسی، تشریح، اچھے بُرے ادب کی پرکھ، اصول سازی، ساری باتیں تنقید ہی کے دائرے میں آجاتی ہیں اس لیے گفتگو کی سطح ہر جگہ یکساں نہیں ہوسکتی۔ سیدھی سادی وقتی رائے زنی تاثراتی ہوتی ہے۔ تبصرہ میں قاری کو کسی کتاب سے روشناس کرانا مقصد ہوتا ہے۔ اس میں ضمناً ادیب سے بھی تخاطب ہوجاتا ہے۔ تشریح صرف قاری کے لیے ہوتی ہے۔ شعر و ادب کی ماہیت، تخلیقی عمل کے منازل، موضوع اور ہیئت کے رشتہ، ادبی حُسن وقبح کی پرکھ کے اُصول، فنونِ لطیفہ کے باہمی ربط، ادب اور انسانی تہذیب کے باہمی تعلق کا تذکرہ کرتے وقت زیادہ تر ادب کے فلسفی اور نقاد نگاہ کے سامنے ہوتے ہیں۔ اس پردے میں ادیبوں اور شاعروں سے بھی باتیں ہوجاتی ہیں۔ عام قاری سے گفتگو کی سطح دوسری ہوتی ہے۔

ہرگانوی: شکریہ۔

احتشام حسین: شکریہ۔

[بہ شکریہ: احتشام حسین نمبر۔ 'فروغِ اردو'، لکھنؤ، مطبوعہ ۱۹۷۳ء]

……☆……

احتشام حسین کی مکتوب نگاری

● ڈاکٹر اکبر مہدی مظفر

مکتوب نگاری کا عام مزاج یہ ہوتا ہے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ حقیقی اطلاعات مکتوب الیہ کو بیک وقت فراہم کردی جائیں۔ احتشام حسین نے اپنے مکتوبات میں اس روایت کا لفظ بہ لفظ خیال رکھتے ہوئے خطوط کی فضا کو ابر آلود ہونے سے بچانے کی حتی الامکان کوشش کی۔ انھوں نے مکتوب الیہ کے حسب فرمائش ہی خطوط کا جواب لکھنے اور اس کے ہر سوال کا جواب دینے کی پوری کوشش کی تاکہ مکتوب الیہ مطمئن ہو سکے۔ احتشام حسین کی زندگی کا منبع و مقصد انسان دوستی اور خدا ترسی بھی تھا اپنی پوری زندگی میں انھوں نے شاید ہی کبھی کسی سے تلخ کلامی یا اونچی آواز میں گفتگو کی ہو اور یہی وصف ان کے مکاتیب میں بھی نظر آتا ہے۔ ان کے نزدیک کسی کی دل شکنی کرنا گناہ عظیم کے مترادف ہے۔ کوئی انجان شخص بھی اگر ان سے کسی مدد کا طالب ہوا تو انھوں نے مدد سے کبھی گریز نہیں کیا حتیٰ کہ وہ انجان شخص ہی کیوں نہ ہو یا وہ کسی تیسرے شخص کی سفارش سے ہی مدد کا طالب کیوں نہ ہو۔ اس سلسلہ میں شارب ردولوی نے لکھا ہے:

> ''ان کے لغت میں 'نا' کا لفظ نہیں تھا اس کی وجہ سے اکثر وہ پریشان بھی ہوتے تھے لیکن کیا کریں کہ انکار کرنا ان کی فطرت میں نہیں تھا۔ ہر شخص ان کے پاس اپنا مجموعہ کلام یا جو کچھ بھی لکھا ہے لے کر آجاتا کہ اس پر پیش لفظ لکھ دیجیے اور وہ لکھ دیتے۔'' (1)

اس بابت احتشام حسین نے اپنا نظریہ بھی واضح کرتے ہوئے کہا تھا:

> ''یہ صحیح ہے کہ میں ہر ایک کی کتاب پر لکھ دیتا ہوں۔ ان کی ہمت افزائی کے جملے لکھنا غلط بات نہیں ہے اگر میں یہ نہیں کروں گا تو نئی نسل اپنی توانائی کا اظہار کس طرح کرے گی اور ادب کا یہ کاروان کن کے قلم کے سہارے آگے بڑھے گا۔'' (2)

احتشام حسین کا یہی نظریہ ان کے مکاتیبی سلسلہ میں بھی عیاں ہے اور غالباً اسی جذبے کے تحت انھوں نے ہر خط کا جواب دینا اپنے ذمے لازم سمجھ لیا تھا چاہے وہ خط کسی اجنبی نے ان کو کسی مدد کے سلسلہ میں تحریر کیا ہو یا ان کے کسی شناسا نے از راہ التفات لکھا ہو۔ اپنے کسی شناسا کو خط لکھنے میں کسی قسم کے تکلف سے کام نہیں لیتے اور نہ کسی مصنوعی لقب سے یاد کرتے ہیں جس سے Formality کا شائبہ ہو۔ اپنے شاگردوں کو بھی عزیزم سے مخاطب کرتے ہیں اور دوستوں سے ایک حد تک ہی بے تکلفی کا اظہار کرتے ہیں تا کہ احباب کے آبگینوں کو ٹھیس نہ پہنچے۔ ایسے خطوط کی شان دیکھنا ہو تو ان کے دوست سلام مچھلی شہری کے نام لکھا گیا ایک خط ملاحظہ کیجئے:

۱۰/دسمبر ۱۹۴۱ء، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

مجی سلام صاحب

''حسین گرفتاری'' مبارک ہو۔ بعض مجبوریوں کی بنا پر حاضر نہ ہو سکا، لیکن مسرت میں شریک ہوں۔ ادھر میں بیمار ہو گیا تھا، پھر میرا بچہ بیمار ہوا۔ ابھی تک ٹھیک نہیں اس لیے جواب دینے میں تاخیر ہو گئی۔ شادی کے بارے میں مَیں اب تک کوئی رائے قائم نہیں کر سکا ہوں۔ اگر دعا کا قائل ہوتا تو ضرور یہ دعا کرتا کہ انجام بخیر ہو۔ ہندستان میں شادی کا معاملہ یہ ہے جیسے کوئی اندھیرے میں تیر چلائے۔ کامیابی اور ناکامی اتفاق پر مبنی ہیں۔ آپ بہت حساس ہیں اس لیے آپ کے لیے شادی اور اہم مسئلہ کی صورت میں آئی ہوگی مگر بھائی میں نے کسی سے سنا تھا کہ یہ شادی سچ مچ شادی ہی ہے گرفتاری ہے نہیں پریم بندھن ہے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

ریڈیو کا مشاعرہ مختصر ہونے کی وجہ سے کم لوگوں کو دعوت دے سکا۔ مجھے اُس میں صرف ایک پارٹ ادا کرنا تھا، اس کے منتظموں میں نہیں تھا۔

مخلص: احتشام حسین (3)

مذکورہ مکتوب میں سید احتشام حسین نے شادی کے سلسلہ میں اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے زیرلب تبسم کی فضا پیدا ہوتی ہے اور اس کا بھی احساس ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے اس عظیم مرحلہ کو کس شوخی اور چُہل سے سمجھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ شادی کو 'حسین گرفتاری' کی ترکیب کے طور پر پیش کرنے کا ہنر غالباً اس کا پتہ دیتا ہے کہ وہ زندگی میں مزاح کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔ سلام مچھلی شہری نے جب احتشام حسین کو پہلا خط لکھ کر ملاقات کی خواہش کی تھی تو احتشام حسین نے ان کو خط لکھ کر حوصلہ بخشا تھا کہ وہ ان سے ناآشنا نہیں ہیں بلکہ ان کو مختلف ادبی رسالوں میں پڑھتے رہے ہیں۔ وہ خط بھی ملاحظہ ہو جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ احتشام حسین نے کبھی کسی کو مایوس نہیں کیا اور نہ ہی کسی دل شکنی کا سبب بنے:

۱۴/مارچ ۱۹۴۱ء، بارودخانہ۔ لکھنؤ

محترمی تسلیم

آپ کا مختصر کارڈ ملا۔ اگر کسی سے ملنے کا جی چاہے تو پھر تعارف کی ضرورت کیا ہے۔ آپ تو اکثر لکھنؤ آتے رہتے ہیں۔ اب جب آپ تشریف لائیں تو ضرور ملاقات کروں گا بشرطیکہ مجھے آپ کے ناتے کا علم ہو جائے۔ مجھ سے ملنے کی خواہش شاید اس لئے ہوگی کہ آپ ہر اُس نوجوان میں جسے علم وادب کے نئے رجحانات سے دلچسپی ہے کوئی ذوق مشترک پاتے ہوں گے اور ممکن ہے کہ آپ مجھے بھی ایسا ہی سمجھتے ہوں۔ ویسے تو آپ سے تعارف نہیں لیکن آپ کی نظمیں نیا ادب، اضطراب، ادبی دنیا میں دیکھتا رہتا ہوں اور ایک ادبیات سے دلچسپی لینے والے کی حیثیت سے غائر نظر سے دیکھتا ہوں۔

آپ کی مختصر تحریر میں جو اضطراب ہے اس نے مجھے قہقہہ لگانے پر نہیں بلکہ سوچنے پر مجبور کیا۔ مجھے سوشلزم سے دلچسپی ضرور ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ سوشلسٹ مفکر ہوں بھی یا نہیں۔ بہر حال سوشلزم ہی کو صحیح راستہ جانتا ہوں۔

مخلص: احتشام (4)

احتشام حسین کے بعض خطوط ایسے بھی ہیں جن سے ان کے مزاج کی سنجیدگی اور متانت کا علم ہوتا ہے۔ وہ بہت کم گو تھے لیکن جہاں ضرورت ہوتی تھی وہاں اپنی رائے بے دھڑک رکھتے تھے اور اس پر قائم بھی رہتے تھے۔ ذاتی خطوط میں سنجیدگی اور متانت کی گنجائش اسی وقت ہوتی ہے جب کوئی بہت اہم مسئلہ درپیش ہو۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کو بھی خطوط لکھے تو اس سے بے انتہا مروّت جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے اس سلسلہ میں ان کے شاگرد عزیز محمد حسن کو لکھے گئے خط کو پیش کیا جاسکتا ہے:

انھوں نے اپنے شاگردوں کو بھی عزیزم سے خطاب کر کے ثابت کیا ہے کہ شاگردوں کی حوصلہ افزائی سے استاد کی ادبی شناخت متعین ہوتی ہے اور اس کی مثال خود ڈاکٹر محمد حسن ہیں جنھوں نے تا زندگی احتشام حسین کی شاگردی اور ان کی سرپرستی کا ذکر کیا۔

احتشام حسین کی دیگر ادبی مصروفیات میں مختلف یونیورسٹیوں کے امتحانات لینا (پی ایچ ڈی مقالہ کے ممتحن کے طور پر) بھی شامل تھا جس میں شامل ہونے کے لیے وہ مصیبتیں بھی اٹھا لیتے تھے اور عدیم الفرصتی کے باوجود بلائے جانے پر پہنچتے ضرور تھے اور سفر میں پیش آنے والے مسائل اور پریشانیوں کا مقابلہ بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ اٹھاتے نظر آتے تھے لیکن دبی زبان سے بھی اس کی شکایت نہیں کرتے تھے۔ اس زمانے کے حیران کن سفر کے بابت ان کو مختلف مواقع پر جسمانی تکالیف کا بھی سامنا کرنا پڑا لیکن ان کا ادبی سفر کبھی رکتا نہیں تھا اور وہ اپنے دوستوں کو بھی اس بات کی تلقین کرتے تھے کہ جب کوئی یونیورسٹی آپ سے کوئی ادبی کام سرانجام دینے کی گزارش کرے تو اس کو بغیر کسی جبر کے قبول کیجئے۔ آپ کے اس طریق کار سے اردو زبان وادب کو فروغ ہی ملے

گا۔ان کی ادبی مصروفیات سے متعلق مندرجہ ذیل تین مزید خطوط ملاحظہ ہوں جنھیں کلام حیدری کے نام تحریر کیا گیا ہے:

۱۵/مئی ۱۹۶۳ء لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

عزیزم تسلیم

ابھی آپ کا خط ملا۔ مجھے شرمندگی ہے کہ اس سے پہلے نہ لکھ سکا۔اُس دن آپ سے رخصت ہوکر پٹنہ پہنچا تو اسٹیشن پر سہیل صاحب اور رمن صاحب مل گئے۔ میں سیدھے اختر صاحب کے یہاں چلا گیا۔ساڑھے پانچ بجے جلسہ گاہ میں پہنچا۔گورنر صاحب نے افتتاح کیا، پھرڈاکٹر بدیشور پرشاد نے ایک مضمون لکھ کر بحث کا آغاز کیا تین چار آدمیوں نے تقریریں کیں،ان میں میں بھی تھا۔میں نے اس پر زور دیا کہ اس وقت ادیبوں کو اپنے اختلافات نظر انداز کر کے ان باتوں پر مشترک ہونا چاہیے جن سے امن اور ترقی کی طاقتوں کو تقویت پہنچ سکتی ہے۔ہندی کے جیندر کمار نے کسی قدر بے تکی اور انفرادیت پسندانہ تقریر کی۔حکومت پر اعتراضات کئے وغیرہ۔دوسرے دن صبح کے جلسہ میں اس پر بحثیں ہوئیں،میں نے ایک تقریر اور کی،سہ پہر کو میں نے صدارت کی۔بہر حال دلچسپ بحثیں رہیں اگر چہ مجمع کم تھا، لوگ کم تھے۔اردو دانوں میں جیلانی بانو،انور معظم،تسنیم سلیم چھتاری باہر سے اور چند حضرات وہاں سے شریک تھے۔میں ۱۱/مئی کو واپس آگیا۔آپ بھی پٹنہ میں ہوتے تو اچھا تھا۔

اب علگڈھ یونیورسٹی سے اطلاع آئی ہے کہ میٹنگ ۱۸/مئی یعنی سنیچر کو،۱۱ بجے دن کو ہے۔ابھی تک طے نہیں کر سکا کہ آؤں گا یا نہیں،اختر اور بنوی صاحب سے طے ہوا تھا کہ میٹنگ ۲۲/کو ہو تو اچھا ہے معلوم نہیں انھوں نے اس سلسلہ میں خط و کتابت کی یا نہیں۔کہیں ایسا نہ ہو،میں آجاؤں اور پھر تنہا رہوں اور میٹنگ نہ ہو۔بہر حال ۱۸/کو نو بجے کے قریب انتظار کر لیجئے گا۔ابھی تک وہاں سے ٹی اے کا چک نہیں پہنچا،غالباً آتا ہوگا۔مرثئے ابھی تک پڑھ نہیں سکا۔ضرور لکھوں گا،اختر پیامی کی نظم بھی دیکھوں گا اور جلد تفصیل سے لکھوں گا۔عزیزہ شاہدہ حیدری کو دعا،رینا کو پیار

خیر طلب:احتشام(5)

۲۶/نومبر ۱۹۵۶ء لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

برادرم کلام حیدری صاحب تسلیم

محبت ناموں نے ممنون بنادیا۔آپ کے گزشتہ خط کا جواب دینے ہی والا تھا کہ آج آپ کا دوسرا خط مل گیا ساتھ ہی اردو مجلس کے اراکین کے خطوط بھی ملے۔میرا خود

جی چاہتا ہے کہ ہے حاضر ہوں اور آپ لوگوں سے ملوں ۔آپ کے بارے میں نہ جانے کیوں خیال تھا کہ آپ پورنیہ میں ہیں۔اس اتفاق نے اور خوشی دی کہ آپ سے کئی سال پہلے جو ملاقات پٹنہ میں ہوئی تھی اس کی تجدید ہوگی۔ادارہ سال میں بھی میں حاضری دوں گا۔

۲/دسمبر کو الہ آباد میں ہندوستانی اکیڈمی کی ایک میٹنگ ہے،اگر اس میں گیا تو وہیں سے براہ راست آؤں گا۔بہر حال ۳/کو صبح کے وقت وہاں پہونچ جاؤں گا۔اس دن کالج کی خدمت میں حاضر رہوں گا۔۴/کو گیا دیکھوں گا اور کسی ایسی گاڑی سے چلوں گا کہ ۵/کی صبح کو لکھنؤ پہنچ جاؤں ۔آج رات ٹائم ٹیبل دیکھ کر اردو مجلس کے سکریٹری صاحب کو مطلع کروں گا۔

آپ کا احتشام حسین (6)

۸/دسمبر ۱۹۵۶ء لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

عزیز من تسلیم

میں ۵/کو ڈھائی بجے لکھنؤ پہنچ گیا۔تار کچھ ایسا جلد نہیں آیا۔دوسرے دن ساڑھے گیارہ بجے ملا تھا۔راستہ میں کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی لیکن تھکن کا احساس گھر پہونچ کر ضرور رہوا۔میں آپ لوگوں کی مہمان نوازی کے لئے بے حد شکر گزار ہوں بلا تکلف کہتا ہوں کہ گھر سے زیادہ آرام ملا۔جتنا وقت بھی وہاں گذرا اچھا گذرا۔ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر ابوالخیر مرحوم) کی خدمت میں تسلیم کہئے گا اور میری جانب سے مزاج پرسی کیجئے گا ۔بیگم شاہدہ حیدری کو تسلیم۔ادریس صاحب سے بھی تسلیم کہئے گا۔

خیر اندیش:احتشام حسین (7)

متذکرہ بالا تینوں خطوط کی اطلاعات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ احتشام صاحب کو کلام حیدری اور ان کے بہار سے انھیں کتنی والہانہ محبت تھی اور ہر بلاوے پر دوستوں سے ملاقات کے شائق بھی رہتے تھے۔ادبی جلسوں میں ان کی شرکت اس بات کی غماز ہے کہ ادب کی سمت و رفتار کے تعین میں ان کی خصوصی دلچسپی رہتی تھی۔ان ادبی جلسوں میں احتشام صاحب اپنے مخالفین کو بھی بڑے غور سے سنتے تھے اور جہاں ان کو اعتراض ہوتا اس کو اپنی تقریر کے دوران انتہائی خوبصورتی سے معترضین کو دلنشین جواب دیتے تھے۔ادبی جلسوں کی رپورٹیں بھی مختلف خطوں کے ذریعہ مختلف دوستوں کے گوش گزار ہوئی ہیں۔

منکسر المزاج احتشام حسین خودنمائی و خود پرستی سے دور کا بھی علاقہ نہیں رکھتے تھے۔وہ جس شہرت اور مقبولیت کے حامل تھے اس میں خودنمائی کا کیڑا لگ جانا فطری بات معلوم ہوتی ہے لیکن یہ ان کی ذاتی شرافت اور نجابت کا خاصہ ہے کہ وہ ہمیشہ اس مہلک بیماری سے بچتے رہے۔

دورِ حاضر میں آج کوئی طالب علم کسی بھاری بھرکم نام نہاد دانشور سے اگر طالبِ مشورہ ہو کہ وہ اسی عظیم شخصیت پر تحقیق کرنا چاہتا ہے تو آنجناب اس طالب علم کی اول تو خود ہی رہنمائی کر دیتے اور اس بات سے بلیّوں اچھلتے کہ ان پر تحقیقی کام ہو رہا ہے (بعض حضرات تو باقاعدہ اس کی تحریک چلا رہے ہیں کہ ان کی ادبی خدمات پر کام کیوں نہیں ہوتا اور وہ باقاعدہ طالب علموں کو اپنی خدمات کے سلسلہ میں خودساختہ مجوزہ خاکہ Synopsis لئے پھرتے ہیں)۔ احتشام حسین کی شرافت دیکھئے کہ انھوں نے اس طالب علم کے خط کا جواب دینے میں بھی تاخیر کی اور جب جواب مرحمت فرمایا تو بنیادی اصول تحقیق بھی بیان کر دیے۔

''میری ان سے پہلی ملاقات جلگاؤں اسٹیشن پر ہوئی تھی جب وہ بمبئی اردو ادیبوں کی کانفرنس میں شرکت کے لئے جا رہے تھے۔ اس مختصر سی ملاقات میں ان کی پرخلوص مشفقانہ اور ہمت افزا باتوں نے دل پر ایسا اثر کیا کہ آج ان کی یاد آتی ہے تو آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔ اس سے قبل مرحوم سے خط و کتابت تھی۔ راقم الحروف ان کی شخصیت اور فن پر تحقیقی مقالہ لکھ رہا تھا جب بھی کوئی بات دریافت کرنے کی نوبت آتی خط لکھ دیتا اور جواب فوری طور پر بھیج دیتے تھے۔ خط کے ایک ایک لفظ سے خلوص، محبت اور شفقت ٹپکتی تھی۔ تکبر، خودنمائی، بے جا بڑائی کا نام و نشان تک نہ ہوتا۔'' (8)

یہ بات بھی کسی سے چھپی نہیں ہے کہ وہ اپنے شاگردوں سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور ان کی رہنمائی اور سرپرستی کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اپنے عزیز ترین شاگرد محمد حسن کی ذہنی پرداخت میں ان کی تحریروں نے بیش بہا اثرات مرتب کئے ہیں۔ محمد حسن کو احتشام حسین نے جتنے بھی خطوط لکھے زیادہ تر میں انھیں 'عزیزم' سے مخاطب کیا ہے جس سے احتشام حسین کی دوراندیشی اور مستقبل شناسی کا جوہر بھی کھلتا ہے کہ وہ باصلاحیت طالب علموں کو بغیر کسی دقت کے پہچان لیتے تھے۔ محمد حسن کو انھوں نے ہمیشہ دل و دماغ کے قریب رکھا اور اسی ذہنی قربت کا نتیجہ تھا کہ محمد حسن نے اپنے تنقیدی نظریات سے ایک زمانے کو متاثر کیا۔ مندرجہ ذیل خط سے اس قلبی قربت کا اندازہ ہو جائے گا:

۲/اپریل ۱۹۵۳ء، لندن

عزیزم، دعائیں

۲۷/مارچ کو لندن پہنچا تو آپ کا خط ملا۔ میں ۲۱/مارچ کو امریکہ سے کوئن الزبتھ نامی جہاز میں بحری سفر کر کے ۲۶/کو ساؤتھمپٹن پہنچا اور ۲۷/کو لندن۔ واٹرلو کے اسٹیشن ہی پر آل حسن، ان کی بیوی اور بہن مل گئے اور ایسی مانوس فضا پیدا ہو گئی کہ میں حیرت سے لندن کو دیکھ بھی نہ سکا۔ اب تک یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو رہا بہت کم باہر نکلا ہوں گویا اپنے خیال میں تھکن مٹا رہا ہوں! آپ اپنی صحت کے متعلق لکھتے ہیں تو مجھے بڑا دکھ ہوتا

ہے، مجھے اب یہ احساس ہے کہ آپ اس کی طرف سے غافل نہیں، جب ایسے جسم اور ایسی صحت سے سابقہ ہو تو آپ غافل رہ بھی کیسے سکتے ہیں۔ بہر حال جہاں تک ہو سکے جسم اور دماغ کو آرام کا موقع دیجئے۔ دہلی کانفرنس کے متعلق بہت کچھ جاننے کو جی چاہتا ہے، اب یہ واپسی ہی پر ہو سکے گا۔ پرسوں اتفاق سے ایک دکان پر Indian Hit کا وہ نمبر مل گیا جس میں زبان کے مسئلہ پر ڈرافٹ اور جعفری کا مضمون ہے۔ ڈرافٹ تو اتنا برا ہے کہ میں اس سے زیادہ غلط، مبہم اور شر انگیز اور الجھے ہوئے ڈرافٹ کا تصور کر ہی نہیں سکتا لیکن جعفری کے مضمون سے میں زیادہ تر متفق ہوں۔ میری رائے میں ابھی تک تو کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے، مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں یہ دو زبانیں ایک ہوں گی اور لسانیاتی ارتقا کے فطری عمل سے...... غالباً موجودہ ہندی کی تعلیم وغیرہ بھی اس پر اثر انداز ہوگی۔ اور اردو ایک طرح کی ہندستانی بن کر نیا چولا بدلے گی...... زبان اور رسم خط کے تعلق کے متعلق بھی میری رائے وہی ہے جو پہلے تھی لیکن تقدیر کی تبدیلی کی کیا شکل اور ذرائع ہوں گے، ابھی نہیں کہہ سکتا۔ اردو کے معاملہ میں کچھ ایسی مایوسی کا شکار رہا ہوں کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونا چاہئے۔ سب الجھ گئے ہیں۔

جذبی مجھ سے خوش کب تھے جو اب خفا ہیں۔ بعض دوستوں کی ناخوشی آج تک میری سمجھ میں نہیں آتی۔ غالباً ناخوشی کا سبب 'فروزاں' کا ریویو ہوگا یا سرور کی شاعری پر مضمون ......اور تو کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ پھر یہ آزردگی بے سبب بھی تو ہو سکتی ہے۔ یہی حال سلام کا رہتا ہے۔ مجھے کبھی کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کب اور کیوں خوش ہیں یا ناخوش ہیں۔

داد دیجئے کہ میں نے امریکہ میں Love in Machine Age ڈھونڈھ نکالی۔ اچھی خاصی جستجو کے بعد ایک کاپی مل گئی جو کسی قدر Soild معلوم ہوتی ہے۔ میں نے بوجھ کے خیال ساری کتابیں امریکہ ہی میں راک فیلر فاؤنڈیشن کے حوالے کر دی ہیں کہ وہ بھجوا دیں غالباً میرے ساتھ ہی پہنچیں گی۔ انگریزی مضامین کے متعلق میں آ کر باتیں کروں گا لیکن اس درمیان میں آپ ذرا 'امریکی پبلک' کے نقطہ نظر سے معلوماتی مضامین لکھ ڈالیے۔ افسانوں کے ترجمے اجازت لے کر کر ڈالئے۔ مجھے لکھیے کہ کوئی مضمون یا افسانہ بھیجنے کے لیے تیار ہے یا نہیں تو میں پتہ لکھوں اور خط بھی لکھ دوں۔ آؤں گا تو اس سلسلہ میں زیادہ تعمیری اور مفید باتیں ہوں گی۔

لندن میں ملنے والے تو بہت ہیں لیکن ابھی تک ملاقات دو تین ہی سے ہوئی ہے۔ فیروز کو میں نے ٹیلی فون کیا اور پھر ان کے دفتر انڈیا ہاؤس بھی گیا، آج پھر ملنے کا وعدہ ہے۔ تمہیں پوچھ رہی تھیں، غوث وغیرہ بھی ابھی ملاقات نہیں ہوئی بعض میرے پرانے

جاننے والے یہاں ہیں جنھیں آپ نہ جانتے ہوں گے، آہستہ آہستہ ہر ایک سے ملوں گا، کافی وقت پڑا ہوا ہے۔ میں یہاں گھبرا تو نہیں رہا ہوں لیکن اب جی چاہتا ہے کہ واپس آؤں اور اسی فضا میں گھریلو زندگی کی انھیں الجھنوں میں کھو جاؤں جو زندگی کا جز بن چکی ہیں۔

صفیہ اختر کے مرنے کی خبر مجھے نیویارک ہی میں کسی خط سے مل گئی ہے۔ اختر کا پتہ مجھے معلوم نہیں اس لیے تعزیت کی دو سطریں بھی نہ لکھ سکا۔ یہاں ان کی وہ نظم بھی دیکھی جو انھوں نے لکھی ہے۔ میں نے سنا تھا کہ مجاز، بہن سے بہت مانوس ہیں اگر ان پر اثر ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ میں اب ان رشتوں کی طاقت اور تقدس کا قائل ہوں۔ سردار کو بھی آج ہی کل میں خط لکھوں گا۔

ادھر مسعود صاحب اور سرور صاحب کے خطوط بھی ملے۔ سرور صاحب کے خط سے یونیورسٹی کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ کلب کا حال ملا اور انھوں نے اپنی ایک بہت اچھی غزل بھیجی۔ اردو پر انھوں نے جو نظم لکھی تھی وہ مجھے پہلے بھیج چکے ہیں، بہت اچھی ہے۔ انھوں نے خود اس خطرے کا اظہار کیا ہے کہ کہیں شاعری اور کاموں کی راہ میں حائل نہ ہو جائے۔ میں نے کل ہی مسعود صاحب کو اور سرور صاحب کو خطوط لکھے ہیں۔ تین دن کے اندر میں نے قریب قریب بیس خط، مفصل اور طویل، لکھے ہیں، اب چند خطوں کے جواب اور باقی رہ گئے ہیں۔ گھر کے خطوں سے آپ کے خبر لیتے رہنے کا حال معلوم ہوتا رہتا ہے۔ میری کتاب کے خوبصورت چھپنے کا حال کئی ذرائع سے معلوم ہوا، آج میں نے اس کے اور دوست صبا کے لیے خط لکھا ہے۔ دیکھوں کب تک آتی ہیں۔ آل حسن اچھے ہیں۔ کبھی کبھی مستقبل کی باتیں کرتے ہیں، یعنی اگلے سال جب یہاں کا معاہدہ ختم ہوگا تو پھر اس کی تجدید کرانا چاہیے یا ہندستان واپس جانا چاہیے، ان کی بیوی اچھی ہیں۔ اپنے Law کے امتحان کی تیاری کر رہی ہیں۔ میری طرف سے سب جاننے والوں کو تسلیم کہیے۔ مجاز، کمال، سلام اور دوسرے دوستوں سے بھی سلام کہیے۔

خیر طلب: احتشام حسین (9)

پروفیسر سید احتشام حسین کا خاصا وقت خط لکھنے اور خط کا جواب دینے میں صرف ہو جاتا۔ اس کے علاوہ ان کے ذمے امور خانہ داری سے متعلق بھی کچھ کام رہا کرتے تھے جس کے سبب ان کی مصروفیت اتنی بڑھ جاتی کہ خط کا جواب دینے میں تاخیر بھی ہو جاتی اور اس تاخیر کے سبب ان کو شرمندگی کا بھی احساس ہوتا جیسا کہ مذکورہ پیش خطوط میں اس کا اظہار بھی انھوں نے مکتوب الیہ سے کیا ہے۔ ادبی کاموں کے علاوہ سماجی ذمہ داریاں میں بھی ان کی زندگی کا ایک اہم حصہ تھیں۔ باقر مہدی کے نام ان کا ایک دلگداز خط ملاحظہ کیجئے۔ اس خط سے احتشام حسین کی اس شدید الجھن کا انداز بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ گھریلو ذمہ داریوں اور ادبی کاموں کے درمیان تواز

ن برقرار رکھنا کتنا مشکل کام ہے:

ادب برائے زندگی کا نظریہ احتشام حسین کی تحریروں کا جوہر ذاتی ہے۔ ادب کو پرکھنے کا ان کا یہ نظریہ زندگی کو ہی نہیں، ادب کو بھی با مقصد بناتا ہے۔ اپنے خیالات کے اظہار میں کسی قسم کا تکلف نہیں برتتے اور قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ کلیم الدین احمد اپنے ایک مضمون 'سید احتشام حسین: تضاد کے شکار' میں اس سچائی کے برخلاف اعتراضات پیش کرتے ہیں۔ کلیم الدین احمد کا اعتراض ہے کہ ''سید احتشام حسین ادب اور اخلاق پر روشنی ڈالتے ہیں لیکن اسے بھی اندھیرے میں چھوڑ دیتے ہیں۔'' احتشام حسین کی مقصدیت کو سمجھنے میں کلیم الدین احمد سے کہیں لغزش ہوگئی ہے جس کے سبب ان کو احتشام حسین کا وہ ادبی رویہ سمجھ میں نہیں آیا جس کے وہ پیرو کار تھے کیونکہ کلیم الدین احمد کی آنکھوں پر مغربی چشمہ چڑھا ہوا ہے اس چشمہ سے ان کو وہی چیزیں نظر آتی ہیں جو مغرب انھیں دکھانا چاہتا ہے [؟] جب کہ احتشام حسین اپنے منبع تحریر وقلم کی سریت کی یوں عقدہ کشائی کرتے ہیں:

''میں کیوں لکھتا ہوں، اپنی جذباتی آسودگی اور روحانی تسکین کے لیے...... میں کیوں لکھتا ہوں، کوئی اندرونی لگن، کوئی پراسرار قوت، کوئی نامعلوم طاقت، کوئی بے نام سی تخلیقی صلاحیت، کوئی وجدانی کیفیت میرے ہاتھ میں قلم دی دیتی ہے اور میں لکھ دیتا ہوں...... میں اپنے علم کی روشنی دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہوں۔'' (10)

حواشی:

(1) احتشام صاحب: کچھ یادیں کچھ باتیں/ پروفیسر شارب ردولوی (ماہنامہ آج کل نئی دہلی جولائی ۲۰۱۲ /ص ۷)

(2) احتشام صاحب: کچھ یادیں کچھ باتیں/ پروفیسر شارب ردولوی (ماہنامہ آج کل نئی دہلی جولائی ۲۰۱۲ /ص ۷،۸)

(3) ماہنامہ آہنگ احتشام نمبر، گیا (بہار) ۱۹۷۳ء/ص ۴۹

(4) ماہنامہ آہنگ احتشام نمبر، گیا (بہار) ۱۹۷۳ء/ص ۴۸

(5) ماہنامہ آہنگ احتشام نمبر، گیا (بہار) ۱۹۷۳ء/ص ۲۳۹،۲۴۰

(6) ماہنامہ آہنگ احتشام نمبر، گیا (بہار) ۱۹۷۳ء/ص ۲۳۸

(7) ماہنامہ آہنگ احتشام نمبر، گیا (بہار) ۱۹۷۳ء/ص ۲۳۹

(8) احتشام حسین: ایک شفیق استاد/ اکبر رحمانی جلگانوی (ماہنامہ آج کل نئی دہلی اپریل ۱۹۷۳ء)

(9) ماہنامہ فروغ اردو، لکھنؤ، احتشام نمبر ۱۹۷۴ء/ص ۵۳۵،۵۳۶

(10) سید احتشام حسین: ایک تاثر/ پروفیسر سید محمد عقیل (ماہنامہ آج کل نئی دہلی جولائی ۲۰۱۲/ص ۱۰)

......☆☆......

شہرِ غزل

پیش رَو غزلیں

سیّد امین اشرف / کرشن کمار طور / صبا اکرام / مدحت الاختر / قوس صدیقی

دس خاص غزلیں

عبدالرحیم نشتر

ہم عصر غزلیں

سلیمان خمار / راشد طراز / رمنان بجنوری / ڈاکٹر ذکی طارق / راشد جمال فاروقی /
معراج احمد معراج / سہیل اختر / ڈاکٹر ظفر مرادآبادی / حنیف ساحل / ڈاکٹر علی عباس امید /
ڈاکٹر نثار جیراجپوری / عقیل گیاوی / طارق متین / قربان آتش / تفضیل احمد / حسن اقبال /
نوشاد احمد کریمی / اصغر شمیم

سوغات غزلیں

غالب عرفان / افتخار راغب

پیش رَو غزلیں

● **سیّد امین اشرف**

نظر تھی روئے گُل پر اور ہوتا تھا گماں یہ بھی
خمارِ دید ہے یا گرمیِ مہرِ بُتاں یہ بھی

خیال آتا ہے اِس نظارۂ سروِ گلستاں سے
کہ رفتہ رفتہ بن جائے نہ زنجیرِ گراں یہ بھی

ہَوس افسانۂ جاناں، جنوں امکانِ بے پایاں
نوائے عاشقاں وہ بھی، نوائے عاشقاں یہ بھی

اَلَم تو خیر اَلَم ہے، گریۂ برگِ خزانی ہے
خوشی ہو نخلِ پائندہ تو ہے آزارِ جاں یہ بھی

یہ دنیا سُوئے مقتل جا رہی ہے کیا قیامت ہے
تماشا دیکھتا رہتا ہوں زیرِ آسماں یہ بھی

گدائے بے نوا کا رزق اس سے کم نہیں ہوتا
دلآزاری کہ ہے منجملۂ شورِ سگاں یہ بھی

امین اشرف دل و دنیا میں قدرِ مشترک بھی ہے
سرائے میہماں وہ بھی، سرائے میہماں یہ بھی

فسوں طرازیِ فردوسِ آرزو کے سوا
خیال و خواب ہیں کیا خاکِ بے نمو کے سوا

میانِ ارض و سَما بادِ تند خُو بھی ہے
مشامِ جاں کے سوا، ماہِ مشکبو کے سوا

ہَوا نے ہاتھ نکالے تھے موتیوں کے لیے
درونِ بحر نہ تھا کچھ بھی دشتِ ہُو کے سوا

تمام انجم و مہتاب سر جھکائے ہوئے
کوئی شریک نہ تھا شامِ حیلہ جُو کے سوا

دماغ عرشِ معطّر تو دل خزینۂ گُم
کچھ اور لالہ و گل میں ہے رنگ و بُو کے سوا

عزیز تھی مری تشنہ لبی مجھے یارو
طلب کسی کی نہ تھی تیغِ بَرگلو کے سوا

تلاشِ امن بھی بازی گری ہے لفظوں کی
مآلِ کار ہے کیا جشنِ گفتگو کے سوا

ہے ماورائے سخن بھی میانِ حرفِ سخن
غزل کچھ اور بھی ہے ذکرِ لالہ رُو کے سوا

● کرشن کمار طُور

قبولِ عام سے رنگِ فسانہ ہوگیا ہوں
ہے راہ کون سی جس پر روانہ ہوگیا ہوں

مجھے ملے گا بھلا کیا کسی تصادم سے
یہی میں سوچ کے فردِ زمانہ ہوگیا ہوں

عجب سی خوشبو سے مہکا ہوا ہے سارا وجود
یہ واقعہ ہے کہ اس کا نشانہ ہو گیا ہوں

پہنچ پایا نہ پہنچنا تو میرے بس میں نہیں
تری گلی کی طرف ہاں روانہ ہوگیا ہوں

وہ کیا ہے جو مرے اندر بہت صف آرا ہے
یہاں کسی سے کہیں میں جدا نہ ہوگیا ہوں

بہت ہی عام سا میں آدمی تھا لیکن اب
اک اس کے وصل سے کتنا یگانہ ہوگیا ہوں

تمام عمر رہیں گی یہ میرے ساتھ اے طُور
جن آرزوؤں کا اب میں ٹھکانہ ہوگیا ہوں

● صبا اکرام [پاکستان]

دریا تو مصروف بہت تھا ساری رات جگانے میں
لوگوں نے ہی دیر لگا دی گھر کو چھوڑ کے جانے میں

اک لمحے میں ہاں کہہ دی اور بستی سے وہ چلا گیا
پھر تو جیسے صدیاں گزریں اس کے لوٹ کے آنے میں

اپنے گاؤں میں پیڑ تلے بھی ہم کو نیند آ جاتی ہے
یوں لگتا تھا، تھپک رہی ہے ماں بیٹھی سرہانے میں

کیسے کیسے لوگ ملے اس جیون میں اور بچھڑ گئے
کیا کیا ہیرے موتی آئے، میرے یاد خزانے میں

مٹی رستہ روک رہی تھی آخری لمحے تک اکرام
ہم نے شاید جلدی کر دی ہاتھ چھڑا کر آنے میں

مدحت الاختر

موم کی مورتیاں دھوپ میں رکھی ہوئی ہیں
میری سانسیں اسی آزار میں اٹکی ہوئی ہیں

جس پہ چلنے کی بزرگوں نے نصیحت کی تھی
خواہشیں ہیں کہ اسی راہ سے بھٹکی ہوئی ہیں

تو ذرا ہونٹ ہلادے تو بکھر جائیں ابھی
ساری آوازیں تری چپ نے سمیٹی ہوئی ہیں

ساری چیزیں مرے گھربار کی معمولی تھیں
آن کر تو نے چھوا ہے تو اچھوتی ہوئی ہیں

اپنے باطن میں سمیٹا تھا بڑی مشکل سے
ہڈیاں کیوں مرے اجداد کی بکھری ہوئی ہیں

سپرد اس کے نہ کی میں نے کیوں اَنا اپنی
بہت دنوں میں اجاگر ہوئی خطا اپنی

جدا ہوا ہے وہ ایسا کہ اب ملے گا نہیں
اسی قصور پہ ہے زندگی خفا اپنی

جو گیت ہم نے سنایا اسی کا جادو ہے
یہ چاروں اُور بکھرتی ہوئی صدا اپنی

چلے ہیں ایک ہی جانب مگر یہ ممکن ہے
کہ موڑ آتے بدل جائے گی دِشا اپنی

اثر دکھائے گا کل شہرزاد کا جادو
ہزار راتیں سہانی گنوا چکا اپنی

یہ آسمان سے نازل نہیں ہوا کرتی
سب اپنے ساتھ لیے پھرتے ہیں بلا اپنی

• قوس صدیقی

گردِ آوارہ، جبینِ وقت پر غازہ مثال
ساعتِ ناہید، شامِ چمپئی تازہ مثال
رنگِ تصویرِ طلب مشکوک خال وخد میں گم
ہر گمانِ سرمئی، شبناک اندازہ مثال
تارِ شبنم محویت میں گل پہ گم کردے وجود
ٹوٹ کر بکھرا ہوا ملتا ہے شیرازہ مثال
ایک مخلص دوست کو حاصل ہے یہ فیضِ لطیف
جو حصارِ درد میں روشن ہے خمیازہ مثال
اب کہاں آنکھوں سے کوئی سُرخ لشکر کا گزر
چشمِ غیرت، بند کھڑکی، بند دروازہ مثال
زرد احساسات میں جب ڈوب جاتا ہے کوئی
لگنے لگتی ہے ہر اک آہٹ بھی آوازہ مثال
فکرِ نم جب شعلۂ تر سے گزر جاتی ہے قوس
روشنی دیتی ہے دھڑکن شہرِ غمازہ مثال

دھوپ شبنم پھول چہرے پر سفر سائی ہوئی
ایک غم تبریز کی وارفتگی اچ ّمی ہوئی
مصلحت کی الگنی پر سوکھ جاتی ہے حیات
ایک دیوانے کی چادر درد میں بھیگی ہوئی
شہر کے ہر موڑ پر روشن ہے مینارِ قرار
جس کے نیچے زندگی، مجبور کی بیٹی ہوئی
چاند کی بُڑھیا اتر کر روز ہر دہلیز پر
دیکھتی رہتی ہے رقصِ بے کسی بیٹھی ہوئی
ایک چہرہ سینکڑوں چہرے میں کیسے کھل اٹھا
آئینے کو چھیڑ کر پتھر کو حیرانی ہوئی
وقت کی تقدیر لکھنے بیٹھ جانا شرط ہے
ساعتِ لبریز بھی گزرے گی تو سہمی ہوئی
لذتِ تلخ‌ویش کی تعریف بس اتنی سی قوس
گھر کے بٹوارے پہ لوگوں کی ہنسی جیسی ہوئی

دس خاص غزلیں

● عبدالرحیم نشتر

آمدِ صبحِ تمنا سے کنارا کرلیں
اب اسی شب کی سیاہی کو گوارا کرلیں
دم بدم گل ہوئی جاتی ہے چراغوں کی قطار
اپنی بجھتی ہوئی آنکھوں کو ستارا کرلیں
ہو کوئی گوشۂ تسکیں تو کریں زخم شمار
ورنہ نیزوں سی ہواؤں کو سہارا کرلیں
ہاں کسی طور تو مائل بہ کرم ہوں اغیار
سوچتے ہیں کہ خطاؤں کو دوبارا کرلیں
اپنی ہی چھاؤں سے محروم ہوئے ہیں اشجار
دھوپ کے شہر میں دوروز گزارا کرلیں
تن شرابور ہوئے جاتے ہیں کیسی ہے پھوار
سوندھی مٹّی کو بھی یہ لوگ نہ گارا کرلیں

پڑی ٹھوکر تو پھر تیور بھی نکلا
مرے سر سے فتورِ سر بھی نکلا
چلو اچھا ہوا برسات آئی
پڑا تھا جو، وہ سب بہہ کر بھی نکلا
عبث ہم آسماں کو تک رہے تھے
ستارا تو ہتھیلی پر بھی نکلا
یہی مضموں، یہی فرسودگی تھی
ہرے موسم سے میں ہو کر بھی نکلا
تمھارے دم سے رونق تھی مکاں میں
مکاں سے تم گئے تو گھر بھی نکلا
وراثت کام اپنا کر گئی ہے
گری دیوار، کوئی دَر بھی نکلا

• عبدالرحیم نشتر

نہ اپنی سُدھ ہے، نہ تیرا خیال رکھا ہے
مجھے یہ کیسے وساوس میں ڈال رکھا ہے
کسی کو دے دی ہدایت کی روشنی تو نے
کسی کو وادیِ ظلمت میں ڈال رکھا ہے
میں تجھ کو ڈھونڈنے نکلا تو ہوں مگر تو نے
کہیں جمال کہیں پُرجلال رکھا ہے
جلو میں آپ ہمیں لیں نہ لیں، خدا معلوم
جلوس آپ کا ہم نے نکال رکھا ہے
خدا کے سامنے یہ ہاتھ کیوں نہیں کھلتے
یہ کس مزار پہ دستِ سوال رکھا ہے
ادھر ہَواؤں نے باندھا ہے مورچہ اپنا
ادھر چراغ نے لَو کو سنبھال رکھا ہے

وصال و ہجر کے قصّے تو سب تمام ہوئے
امورِ عشق بھی آسان اور عام ہوئے
پرند رک کے نکیلی چٹان تکتے تھے
اسی خطا پہ بچارے اسیرِ دام ہوئے
یہ بے کلی مجھے لیکر کہاں چلی آئی
جو بجھ رہے تھے وہ چہرے چراغِ شام ہوئے
کہیں ببول کی شاخوں میں چاند اٹکا ہے
کہیں گلاب کٹورے بھی خالی جام ہوئے
بھرو اُڑان، ابھی آسمان روشن ہے
پرند اڑتے ہوئے مجھ سے ہمکلام ہوئے
طبیعتوں میں پڑا ہے وہ رَن، کہ نشتر جی
خود اپنے واسطے شمشیرِ بے نیام ہوئے

عبدالرحیم نشتر

اسے تو ہر اک سانس بھاری لگے
جسے موت ہی سب سے پیاری لگے
بہت جی لیے، بس اے عمرِ رواں
کہیں دور چلنے کی باری لگے
گزر جائیں دنیا سے چپ چاپ ہم
کسی کو خبر نہ ہماری لگے
خزاں میں اُگے ہیں تو بے باک ہیں
بدن سے نہ بادِ بہاری لگے
بچے گا بھلا اب، کوئی جانور
ہیں چاروں طرف سے شکاری لگے
وہی زرد کہسار ہے سامنے
لہو کی جسے راہداری لگے

نئی زندگی کی دعا چاہتا ہوں
پرانا مکاں ہوں، گرا چاہتا ہوں
سُبک ہورہا ہوں ہَوا کی طرح میں
پہاڑوں سے اونچا اُٹھا چاہتا ہوں
مرے پنکھ ٹوٹے، مری آس چھوٹی
تو سمجھو کہ اب میں اُڑا چاہتا ہوں
بصارت تو دی ہے، بصیرت بھی دے دے
میں چہرہ نہیں، آئینہ چاہتا ہوں
سنی بادِ مسموم کی لَن ترانی
شگوفہ ہوں، دم میں کھلا چاہتا ہوں
وہی زرد چہرے، وہی سرخ شعلے
میں ہر سمت موسم ہرا چاہتا ہوں

• عبدالرحیم نشتر

تازہ قصّے تو بیاں ہوتے ہیں
جھوٹ کے پاؤں کہاں ہوتے ہیں
جانے کب، کوئی خبر بن جاؤں
حادثے روز یہاں ہوتے ہیں
ختم ہوتی ہے کہانی میری
اب مرے بچّے جواں ہوتے ہیں
جن میں، گھر جیسی کوئی بات نہ ہو
ہائے ایسے بھی مکاں ہوتے ہیں
جان پہ روٹھ کے جینے والے
گیلی لکڑی کا دھواں ہوتے ہیں
منہ نہ کھلوایئے نشتر صاحب
سب کہاں اہلِ زباں ہوتے ہیں

عنایت تو ہے یہ سرکار بھاری
کہ سر چھوٹا سا ہے، دستار بھاری
جو سوچو تو وہیں ٹھہرے ہوئے ہیں
جو دیکھا جائے تو رفتار بھاری
زمیں سوکھی تھی، سوکھی ہی پڑی ہے
نئے موسم کی ہے بوچھار بھاری
ہَوا اور روشنی کا کیا بھروسہ
اٹھا رکّھی تو ہے دیوار بھاری
تو کیا ہم سب درندے ہوگئے ہیں
کوئی ہم سے بھی ہے خونخوار بھاری
کوئی تو صاحب کردار ہوتا
نظر آتے ہیں سب فن کار بھاری

عبدالرحیم نشتر

پڑ رہی ہے پھُوار سی کچھ کچھ
جل رہی ہے بہار سی کچھ کچھ
دھیرے دھیرے ابھرتی جاتی ہے
اک شبِ انتظار سی کچھ کچھ
دھندلی دھندلی دکھائی دیتی ہے
صورتِ اعتبار سی کچھ کچھ
جیسے مجھ میں بھی بجھتی جاتی ہے
آتشِ اختیار سی کچھ کچھ
برق سی کوندتی نظر آئے
کوئی شے بے قرار سی کچھ کچھ
اب یہ شوقِ فضول ٹھہری ہے
شاعری ہے بخار سی کچھ کچھ

کیا حَرم اور دیر کی مٹّی
قبر بنتی ہے پیر کی مٹّی
اپنے ہی غم سے ہے نجات کسے
کون چھانے گا، غیر کی مٹّی
پاؤں تو دھولیے مگر دل سے
چھوٹتی بھی ہے سَیر کی مٹّی
کس کو اپنا رفیق پاؤ گے
بھر کے آنکھوں میں بیر کی مٹّی
ہر طرف دھول اڑ رہی ہے یہاں
کس کو ملتی ہے خیر کی مٹّی
جھاڑ لوں اور پھر نکل جاؤں
اب تو دنیا ہے پیر کی مٹّی

ہم عصر غزلیں

● سلیمان خمار

جشن اِس طرح جدائی کا مناتا ہوا میں
رات بھر درد کی محفل کو سجاتا ہوا میں

دشتِ دِل میں تری یادوں کے لگا کر میلے
روز تنہائی کے لشکر کو ہراتا ہوا میں

بات کرتا ہوا جنگل میں غزالوں سے کبھی
گھنے صحرا میں کبھی خاک اُڑاتا ہوا میں

دھوپ کی فصل ہر اک سمت اُگاتا ہوا تو،
چھاؤں کے پیڑ ہر اک گام لگاتا ہوا میں

تو بھی یوں بھول نہ پائے گی مجھے اے دُنیا
ظلم سہہ کر بھی ترے ناز اُٹھاتا ہوا میں

اپنی سوچوں کو بہر حال ہری رکھتا ہوں
زرد موسم کے کبھی ہاتھ نہ آتا ہوا میں

واقعہ یہ ہے کہ تقدیر کا مارا ہوا میں
یعنی جنت سے زمیں پر ہوں اُتارا ہوا میں

کتنے خانوں میں ہوں تقسیم میں اِس دُنیا میں
اپنے ہی آپ میں ہر لحہ خسارہ ہوا میں

کیا ڈرائیں گے بھلا ہجر کے سائے مجھ کو
دشتِ تنہائی میں اک عمر گزارا ہوا میں

ہر طرف ظُلم کی پھیلی ہیں یہاں مملکتیں
صلح کس کس سے کروں وقت کا مارا ہوا میں

جب کسی بات پہ ہمزاد کو دیتا ہوں شکست
خود کو جیتا ہوا پاتا ہوں نہ ہارا ہوا میں

جھوٹ جب تک کہا ہر شخص کی چاہت میں رہا
سچ کہا جب تو کسی کو نہ گوارا ہوا میں

● راشد طراز

غبارِ راہ کو جس کا رواں نے دیکھا ہے
اسی کو جھک کے یہاں آسماں نے دیکھا ہے
ادا کیا ہے سخن روح کی صلابت سے
ہمارا زورِ بیاں داستاں نے دیکھا ہے
غرور کرتے ہیں ہم پر حرم کے پتھر بھی
ہمارا ذوقِ سجود آستاں نے دیکھا ہے
ہمارے رشتے منور رہے ہیں دنیا میں
بڑے قریب سے ان کو مکاں نے دیکھا ہے
زوال دیکھنے والے تجھے یہ یاد رہے
مرا عروج بھی سارے جہاں نے دیکھا ہے
ہر ایک فرض نبھاتے ہوئے خموشی سے
طرازؔ مجھ کو مرے مہرباں نے دیکھا ہے

جو زخم ہے جگر پہ عیاں کس طرح کریں
ہم وارداتِ غم کو بیاں کس طرح کریں
ہم جانتے ہیں تجھ کو گراں لگ رہا ہے شغل
پنہاں تری نظر سے دھواں کس طرح کریں
محفوظ اپنی آنکھوں میں تصویر جس کی ہے
اہلِ نظر سے اس کو نہاں کس طرح کریں
ہم لوگ ہیں مسافرِ ظلماتِ جستجو
صحرا میں روشنی کو مکاں کس طرح کریں
شوریدگی ہی آخری منزل ہے شوق کی
اس شور کو زبانِ دلاں کس طرح کریں
راشدؔ جنوں بھی کر گئے جیسے شعور سے
اس وضع کو طریقِ جہاں کس طرح کریں

● منّان بجنوری

گھٹن ملال الم شوق مسکرانے کا
مری غزل میں ہے سب کچھ مرے زمانے کا

کس اہتمام سے اڑتے ہیں مل کے لاکھوں طیور
سلیقہ چاہیے اپنی ڈگر بنانے کا

ہَوس سے پاک ہے شہرِ گراں میں عشقِ غریب
کہ اچھا خاصا کرایہ ہے وصل خانے کا

ہیں اقتدار کے خواہاں یہ ماہرینِ فساد
بہانہ ڈھونڈ تے رہتے ہیں وَرغلانے کا

وہی ہے خصلتِ انساں وہی وتیرۂ شر
جدید عہد نیا عکس ہے پُرانے کا

دکانِ تزکیۂ قلب قفل خواہ ہوئی
سبب ہے مال نہ بکنا دکاں بڑھانے کا

سینکڑوں اسبابِ غم اور سب ہیں آلِ آرزو
جس کے دل میں اتنے کاشانے ہوں پالے آرزو

ایسی بے چینی کہ ممکن ہی نہیں جس کا شمار
بے کلی در بے کلی اکثر مآلِ آرزو

فارغ البالی سے ہے پُر نور راہِ خواہشات
پیٹ خالی ہو تو پھیکا ہے جمالِ آرزو

عمر بھر کی کوششیں ہو جائیں جس کی رائگاں
اس سے پوچھا جائے کیا ہوتا ہے حالِ آرزو

تھی کبھی دریا صفت منّان موجِ اشتیاق
کشتِ حاجت لے اُڑی آبِ جمالِ آرزو

ڈاکٹر ذکی طارق

اُجالا گھر میں خفیف سا ہے
اندھیرا بھی کچھ نحیف سا ہے
نہ کوئی بادل نہ صاف منظر
مگر یہ موسم لطیف سا ہے
جو ایک لمحہ تھا خوشبوؤں کا
مجھے لگا کچھ کثیف سا ہے
گناہ کرنے سے باز رہیے
ہوس کا موسم شریف سا ہے
اُٹھا رہا ہے جو بوجھ گھر کا
وہ بچّہ گویا ضعیف سا ہے
جسے میں اپنا سمجھ رہا ہوں
ذکی وہ میرے حریف سا ہے

خاموشی میں قصداً بولا
گھر سونا تھا جبراً بولا
میری اَنا نے پھول کھلائے
وہ مجھ سے مجبوراً بولا
سایہ بھی اب ساتھ نہ دے گا
دھوپ بھرا دن طنزاً بولا
رشتے ناطے کام نہ دیں گے
میرا دُشمن رسماً بولا
سارے مَوسم ایک نہیں ہیں
میں خود سے تاکیداً بولا
آوارہ سے لمحے جاگے
سنّاٹا تقریباً بولا
آپ ذکی کیا سوچ کے خوش ہیں
وہ تو بس تفریحاً بولا

راشد جمال فاروقی

کچھ سنانے کو نہ ہو اور سنانے لگ جائیں
کچھ ہُوا بھی نہ ہو اور شور مچانے لگ جائیں
کس طرح زخموں کو سہلاتے ہیں بہلاتے ہیں
اک ذرا پیار سے پوچھو تو بتانے لگ جائیں
چند لمحوں کا سفر آگ پہ چلنے کا جو تھا
اب اگر سوچنے بیٹھیں تو زمانے لگ جائیں
کہیں ایسا نہ ہو تم پُرسشِ حالات کرو
کہیں ایسا نہ ہو ہم اشک بہانے لگ جائیں
اپنے آنے کی خبر دو، ہمیں کچھ کام ملے
اور پھر ہم در و دیوار سجانے لگ جائیں
بند آنکھوں سے جو کترا کے گزر جاتے ہیں
جاگتی آنکھوں کو وہ خواب دِکھانے لگ جائیں
اب تو اس ذوقِ خود آرائی کو چھوڑو راشد
آؤ صحرا کو چلیں خاک اڑانے لگ جائیں

معراج احمد معراج

میں پتھروں کے بیچ پڑا ہوں اس آس میں
آ جاؤں گا نگاہِ زمرّد شناس میں
صحرا میں تھا تو کچھ نہ تھا احساسِ تشنگی
دیکھی ندی تو آ گئی شدّت بھی پیاس میں
دنیا ہے مبتلائے عذابِ برہنگی
عریاں ہیں جو وہی ہیں مہذّب لباس میں
اے شہر! تو نے چھین لیا مجھ سے کس لیے
لطفِ خرام گاؤں کی سرسبز گھاس میں
محفل میں، میں نے شعر سنائے تو یوں لگا
بچّے خموش بیٹھے ہوں جیسے کلاس میں
معراج اک نظر میں پرکھ لیں گے دیدہ ور
تیزاب ہے کہ آب ہے میرے گلاس میں

سہیل اختر

زینتِ رونقِ بازار کبھی تھا ہی نہیں
میرا فن آپ کا معیار کبھی تھا ہی نہیں

نیک تو وہ بھی نہ تھے جن سے تھی خلقت مرعوب
میں گنہ گار ریاکار کبھی تھا ہی نہیں

میں نہ قائل تھا نہ قابل کہ نبھاتا رشتے
میں تو افسوس اداکار کبھی تھا ہی نہیں

یہ الگ بات ضمیر اپنا نہیں تھا مردہ
میرا بے داغ بھی کردار کبھی تھا ہی نہیں

یہ نہ پوچھو سندِ فن ہے وہی کیوں آخر
ایسا اک شخص جو فن کار کبھی تھا ہی نہیں

اتنی حق تلفی ہوئی ہے مری کہ سوچتا ہوں
اپنے بھی حق کا میں حقدار کبھی تھا ہی نہیں

پھر بھلا کیوں مجھے ہموار کیا جاتا ہے
میں کسی راہ میں دیوار کبھی تھا ہی نہیں

اپنے کمال ہوتے بھلا معتبر بھی کیا
ہم اہلِ حاشیہ ہیں ہمارا ہنر بھی کیا

سب کچھ نظر میں رکھ کے بھی رہتے ہیں ہم خموش
ہم ٹھہرے کم نظر تو ہماری نظر بھی کیا

سازش ہے، ہم اندھیرے میں رہ جائیں ساری عمر
چاہیں نہ وہ تو ہوگی نہ اپنی سحر بھی کیا

سب کچھ گنوا کے بھی وہی سر ہے وہی جنوں
سر ہی کے ساتھ جائے گا یہ دردِ سر بھی کیا

وہ وقت ہے کہ سب کو ہے اپنی پڑی ہوئی
ایسے میں کوئی لے گا ہماری خبر بھی کیا

ہم بھی غزل میں خاک ہوئے خاک چھانتے
یہ وحشی صنف کرتی ہے کارِ دگر بھی کیا

ہم خاک اڑانے والوں کی کیا جستجو سہیل
ہے مختلف ڈگر تو ہماری ڈگر بھی کیا

● ڈاکٹر ظفر مرادآبادی

شمس و قمر کا اور کبھی کہکشاں کا بوجھ
دن رات اپنے سر پہ رہا آسماں کا بوجھ
جب تو نہیں، تو غم ہو ترا ساتھ کس لیے
کیوں تیر کے بغیر، اٹھاؤں کماں کا بوجھ
دو وزن کیوں اٹھایئے، اک دھوپ کے لیے
احسان بھی جتائے جہاں سائباں کا بوجھ
کچھ اس لیے بھی تیز ہوا لے اڑی اُسے
کشتی ہی کیوں اٹھائے پھرے بادباں کا بوجھ
ایسا نہ ہو ظفر کہ سپر ڈالنی پڑے
بڑھتا ہی جارہا ہے جو عمرِ رواں کا بوجھ!!

دھوپ کی شدت سے، جو بھیگے ہیں کپڑے، سوکھتے
کچھ ہوا چلتی تو جسموں کے پسینے سوکھتے
اک طراوت کا رگ و پے میں بنا رہتا قیام
دیکھتے تجھ کو، تو کیوں لوگوں کے چہرے سوکھتے
تو ہمیشہ ہی رہا سیلاب بن کر آنکھ میں
بھولتے تجھ کو تو خوابوں کے جزیرے سوکھتے
کیسا سورج تھا ہماری روح میں اُترا ہوا
ہم نے دیکھے اپنے ہی پیکر کے سائے سوکھتے
اے ظفر عنقا ہوا جب شربتِ دیدار بھی،
زخم خوردہ پھر لبوں پر کیوں نہ لہجے سوکھتے!!

حنیف ساحل

صدائے بحروبر آئے نہ آئے
مجھے اذنِ سفر آئے نہ آئے
ہَوا کا ہاتھ تھامے جارہا ہوں
کوئی بہرِ سفر آئے نہ آئے
سمیٹوں اپنے آنچل میں یہ لمحے
یہ خوشبو پھر ادھر آئے نہ آئے
ہوائیں سرد ہوتی جارہی ہیں
پرندہ لوٹ کر آئے نہ آئے
عذابوں کا سمندر بہہ رہا ہے
دعاؤں میں اثر آئے نہ آئے
کیا ہے اس نے پھر ملنے کا وعدہ
یقیں تو ہے مگر آئے نہ آئے
غزل گوئی رہے تابندہ ساحل
کوئی دادِ ہنر آئے نہ آئے

راستوں میں گم رہی اچھی لگی
یہ تلاشِ بے خودی اچھی لگی
میں نے دیکھا ہے اسے بس ایک بار
ایک لڑکی اجنبی اچھی لگی
سارا دن تو شور رہتا ہے یہاں
شام ہوتے ہی گلی اچھی لگی
غم سے گہرا کوئی بھی دشمن نہیں
غم سے اپنی دوستی اچھی لگی
غم کدے میں تیرگی جب بڑھ گئی
خونِ دل کی روشنی اچھی لگی
ایک بس تیری کمی کھلتی رہی
ورنہ ہم کو زندگی اچھی لگی
شاعری سے کیا ملا تم کو حنیف
ہاں مگر یہ سرخوشی اچھی لگی

ڈاکٹر علی عبّاس اُمید

وہ میرے ساتھ چلا تھا مگر تکان میں تھا
یہی تو فرق میرے اس کے درمیان میں تھا
اُداس نسلیں اسی سوچ میں بکھرتی رہیں
نصیب اُن کا کہیں دور آسمان میں تھا
تمام رشتے وہی ہیں، تمام رسمیں بھی
بس اک خلوص نہیں ہے جو پاندان میں تھا
اسی کی یاد میں جیتے ہیں آج تک سب لوگ
وہ ایک شخص یگانہ جو خاندان میں تھا
تمام شہر تھا خوابوں کی تیز بارش میں
میں اپنی ذات کے جلتے ہوئے مکان میں تھا
حقیقتوں کو پلٹ کر وہ دیکھتا کیسے
کہ لمحہ لمحہ بکھرنا تو آن بان میں تھا
بتاتا رہتا تھا موسم کا کاروبار ہمیں
چھپا ہوا وہ پرندہ جو سائبان میں تھا

تمھارے نام کے آگے ہیں ڈگریاں کتنی
ذرا بتاؤ ملیں ان سے رُوٹیاں کتنی
ہمارا گھر ہوا جب راکھ تو سمجھ پائے
سیاہیوں سے بھی بجتی ہیں سُرخیاں کتنی
نہ خاندان، نہ رِشتے، نہ آشنا چہرے
دبائے پھرتے ہیں یادوں کی سسکیاں کتنی
یہ نقش کیسے بنے ہوں گے سوچیے پہلے
نہ دیکھیے کہ ہیں چہرے پہ جھرّیاں کتنی
معاہدے پہ انگوٹھا لگانے والے نے
خریدلی ہیں ادیبوں کی اُنگلیاں کتنی
نکلنے والے نے بستی سے یہ نہیں سوچا
کرے گا بھوک پہ وعدے کی کھیتیاں کتنی
دُعائیں مانگی تھیں امید ہم نے بارش کی
چمک رہی ہیں مگر غم کی بجلیاں کتنی

● ڈاکٹر نثار جیراجپوری

میں بیٹھا ہوں سرِ گرداب دریا
تو آ، کر دے مجھے غرقاب دریا
ترے آئینے میں ٹک جھانکتا ہے
ردائے ابر سے مہتاب دریا
ترا غوّاص ہوں، کچھ تو عطا کر
مجھے بھی گوہرِ نایاب دریا
میں تیری راہ کی تشنہ زمیں ہوں
تو آ، کردے مجھے سیراب دریا
وہ جن کے حسن سے روشن تھی دنیا
کہاں وہ اُڑگئے سرخاب دریا
میں اک تنکا سرِ گرداب، آخر
کہاں لے جائے گا یہ آب دریا
رہائی چاہتا ہے اے نثارؔ! اب
گہن کا مارا یہ مہتاب دریا

شب کی پلکوں پہ خواب چاہت کے
لمس دینے لگے محبت کے
قینچیاں طنز کی لپکنے لگیں
پر نکلنے لگے ہیں شہرت کے
اُن کے اک لفظ بول دینے سے
ابر چھٹنے لگے کدورت کے
جن درختوں کو خوں سے سینچا تھا
ہوگئے اب وہ میری قامت کے
دل کے اوراق پہ جو لکھّے تھے
لفظ وہ مِٹ گئے محبت کے
وقتِ نو کی نئی عبارت سے
لفظ مٹنے لگے شرافت کے
اب بھی کانوں میں گونجتے ہیں نثارؔ
چند الفاظ وہ لطافت کے

طارق متین

میری منزل کے لیے راہ گزر کھولتا ہے
کوئی تو ہے جو درِ فتح و ظفر کھولتا ہے
میرے تاریک مکاں میں وہ مرا ربِّ کریم
روزنِ تابشِ خورشید و قمر کھولتا ہے
جب بھی وہ کھولتا ہے بندِ قبائے روشن
ایسا لگتا ہے کوئی بابِ سحر کھولتا ہے
اسے مل جاتا ہے جب بھی کوئی موضوعِ سخن
نیا دروازۂ اندازِ نظر کھولتا ہے
طائرِ فکر کی پرواز نہ پوچھو طارق
دم نہیں لیتا ہے پَر اپنے اگر کھولتا ہے

گھر کو ہمارے راہ گزر کہہ دیا گیا
دیوار و در کو نقشِ سفر کہہ دیا گیا
میں رو رہا تھا اپنی تباہی کو دیکھ کر
اشکوں کو آبشارِ نظر کہہ دیا گیا
دنیا نے مجھ کو دادِ جراحت بھی خوب دی
زخموں کو میرے لعل و گہر کہہ دیا گیا
ہم مصلحانِ وقت کو توقیر یہ ملی
آوارگاں و خاک بسر کہہ دیا گیا
کہنے کو کیا بچا ہے کہ اب ہم بھی کچھ کہیں
جذبوں کو جب فسادِ جگر کہہ دیا گیا
طارق اب اس سے بڑھ کے بھی ہوگا مذاق کیا
تیرہ شبی کو نورِ سحر کہہ دیا گیا

● قربان آتش

کیا شہرِ نو سے موسمِ سفاک کم ہوئے
اچھا ہوا کہ کچھ خس و خاشاک کم ہوئے

ہر لمحہ سینہ تانے کھڑے راستے میں ہیں
میرے سفر کے خار بھی کیا خاک کم ہوئے

شام و سحر تو اک ہی فضا کرتی ہے طواف
آنکھوں سے کب نظارۂ غم ناک کم ہوئے

آواز میں اُٹھاتا ہوں ہر ظلم کے خلاف
میری طرح زمانے میں بے باک کم ہوئے

یہ سب کرشمے آج انھی موسموں کے ہیں
جن کے اثر سے جذبۂ نمناک کم ہوئے

اب بھی رواج و رسم وہی ہیں مگر کہاں
عریانیت کے بردۂ پوشاک کم ہوئے

آتش یہی بہار کی سوغات کم نہیں
اِس بار گل کے دامنِ صد چاک کم ہوئے

جب غم کے کینوس پر ہوگا نزول چہرہ
آنکھیں بھی ہوں گی پُرنم روئے گا پھول چہرہ

اتنا خیال رکھنا ہر لمحہ اے مسافر
موسم نہیں بنادے قدموں کی دھول چہرہ

تم سے نہیں منوّر ہونے کو تیرگی ہے
لے کر چلے بھی جاؤ اپنا فضول چہرہ

اک اک ادا میں اُن کی سازش رَچی ہوئی ہے
یہ صبحِ نو نہ کردے میرا ملول چہرہ

کوئی کرے کہاں تک اُس پر یقین آخر
ہر پل بدل رہا ہے اپنا اصول چہرہ

خوش رنگ گلستاں کا نقشہ بدل گیا ہے
ہر شاخ پر اُگا ہے کیسا ببول چہرہ

تفضیل احمد

ہوائیں دب کے لہو بن گئیں وَریدوں میں
میں جس لہو پہ شمارا گیا شہیدوں میں
ملی تھی لانے کو پاتال سے زرِ قاروں
وہ اک کلید بھی گم ہوگئی کلیدوں میں
سرِ فرات کماں بھی اٹھائی چھاگل بھی
رہے حسینی نہ پوچھے گئے یزیدوں میں
ہوا عموم تو ہجرت بھی رائگاں ٹھہری
نہ لوحِ خاک نہ روداد ہے جریدوں میں
امیرِ شہر میں کچھ خوبیاں رہی ہونگی
رقم ہوئے ہیں سبھی مرثیے قصیدوں میں
جدید شہروں کی تہذیب کا تعارف ہیں
کسی سے ہولی میں ملتے ہیں وہ نہ عیدوں میں
رَوا ہے ہم سے بھی تفضیل بیعتِ اردو
ہمیں بھی خرقہ ملا ہے غزل مریدوں میں

کسی کی تعزیت کرنا مجھے زیبا نہیں دیتا
جو خود تابوت بردوشی پہ ہو پُرسہ نہیں دیتا
رہوں پیچھے تو گردِ قافلہ سے آنکھ جلتی ہے
بڑھوں آگے تو دانستہ کوئی رستہ نہیں دیتا
ذرا مبہم سہی محفوظ تو رہ جائیں گے چہرے
تراشوں سنگ آئینے سا یہ دھوکہ نہیں دیتا
زمیں کے تین چوتھائی پہ آخر بھر گیا پانی
سواب صحرا کو بادل شرم سے بوسہ نہیں دیتا
گھڑی کی سوئیوں کو پھیر دے ایسا سفر بھی ہے
مگر معکوس رفتاری کو وہ ناقہ نہیں دیتا

تفضیل احمد

جنگل کی ہوا شور میں جنگل سے بڑی ہے
جو بھاپ ہے بادل کی وہ بادل سے بڑی ہے

کالک ہوئے جاتے ہیں خلاؤں میں ستارے
ہر شب یہی کہتی ہے کہ وہ کل سے بڑی ہے

یہ ساری ہوا مجھ میں سما بھی نہیں سکتی
اور پیاس بھی ایسی ہے کہ چھاگل سے بڑی ہے

پتوں کے تناظر میں گھنے ہیں مرے اشجار
جو شاخ بڑی ہے وہ کسی پھل سے بڑی ہے

نکلا ہی کہاں شمس کبھی کاہکشاں سے
چنگاری خیالات کی مشعل سے بڑی ہے

اگلیں گے ناگ مہرے ذرا تندہی سے بیٹھ
تریاق چاہیے تو پرے بانبی سے بیٹھ

بیدار ہو رہی ہیں درختوں میں چینٹیاں
اے دھوپ شاخِ نرم پہ آہستگی سے بیٹھ

گھڑیال بھی ہیں گینڈے بھی اجگر بھی ریچھ بھی
جنگل پڑا ہے ٹیک لگا کر کسی سے بیٹھ

سب کوہ و بحر و دشت بمُوں سے بکھیر کر
جی چاہتا ہے سیر کروں پالکی سے بیٹھ

خود ناچتی زمین پہ شوریدہ رَم ہوں میں
کس منھ سے میں ہُوا سے کہوں یاندی سے بیٹھ

اے ابر طے حجم ہے نہ پیکر نہ سمت جب
کیا حرج ہے جو ریت پہ آ کر خوشی سے بیٹھ

شب داستان گو بھی ہے چپ کا پہاڑ بھی
تفضیل خوب کٹتی ہے اپنی اسی سے بیٹھ

• حسن اقبال

نمی ملی تو اُسی خاک سے نکل آئے
زمیں میں قید تھے ہم چاک سے نکل آئے

تمھیں بھی راس نہیں آئی سرزمینِ ہوس
سو ہم بھی کوچۂ ادراک سے نکل آئے

اگر لہو کا چھلکنا ہی شرط ٹھہرا ہے
تو وہ بھی دیدۂ نمناک سے نکل آئے

زمانے تیری روش ''اختیار'' کی ہم نے
ہزار جبر کی اِملاک سے نکل آئے

سوائے حبس یہاں کچھ نہیں، جُنوں سے کہو
درونِ خانۂ ادراک سے نکل آئے

تو لاکھ جسم چھپائے مگر مری خوشبو
عجب نہیں تری پوشاک سے نکل آئے

یہاں بھی گردشِ آفاق کے ہوئے محکوم
اگرچہ حیطۂ افلاک سے کل آئے

کس قدر چین سے بیٹھا تھا میں انگنائی میں
آپ نے دھول اُڑادی مری تنہائی میں

ہم ہی کافی تھے یہاں ٹھوکریں کھانے کے لیے
آپ کیوں آگئے اس کوچۂ رسوائی میں

اپنے ہی بارے میں سب سوچتے رہتے ہیں یہاں
کون اُترتا ہے کسی ذات کی گہرائی میں

فتح کر سکتے تھے ہم مملکتِ عشق مگر
کیا کریں لُطف جو آنے لگا پسپائی میں

بولنے لگتے ہیں یادوں کے گھنے سناٹے
ایک دستک سی ہوا کرتی ہے پُروائی میں

عزم محکم تھا سو خود پالیا منزل کا سُراغ
آپ نے دیر جو کی حوصلہ افزائی میں

• نوشاد احمد کریمی

ہم ایسے لوگ یہاں اس بہانے رہتے ہیں
کہ اس زمین کے اندر خزانے رہتے ہیں

دیارِ شوق کی راہیں ہیں منتظر کس کی
دل و نگاہ میں اب آستانے رہتے ہیں

گئے دنوں کے ہیں نقش و نگار چاروں طرف
نئے گھروں میں بھی قصّے پُرانے رہتے ہیں

حیات و موت میں دوری تو کچھ نہیں لیکن
حصارِ جسم میں کتنے زمانے رہتے ہیں

نہیں ہے غم، ہمیں جنگل کے خشک ہونے کا
ہوا کی شاخ پہ بھی آشیانے رہتے ہیں

میں اس دیار میں تنہا بھٹکتا رہتا ہوں
جہاں سُنا تھا ہزاروں ٹھکانے رہتے ہیں

عجیب موڑ پہ دنیا اب آگئی نوشاد
نظر نظر میں ہوس کے نشانے رہتے ہیں

عجب طرح کا، نگاہوں میں ارتعاش بھی ہے
جو سامنے ہے اسی کی مجھے تلاش بھی ہے

تمام لوگ جسے دیکھ کر بہت خوش ہیں
کسی کے واسطے منظروہ دلخراش بھی ہے

قدم قدم پہ نئی لذّتیں ہیں ہجرت میں
وصالِ یار بھی، آسانیِ معاش بھی ہے

شکستِ فاش ہو شہہ کو غلام کے ہاتھوں
بتا اے رنگِ جہاں! ایسا کوئی تاش بھی ہے

تو ایک بُت ہے، مگر ہے عروجِ فن کی مثال
کہ تجھ پہ آج خدا خود صنم تراش بھی ہے

خدایا! صرف خلاؤں کا ہو سفر کب تک
مرے لیے بھی کہیں پر زمیں کی قاش بھی ہے

حدودِ جسم میں رہتا نہیں ہے کوئی جہاں
اسی دیار میں نوشاد بود و باش بھی ہے

اصغر شمیم

مری خیرات پر جو پَل رہا ہے
مرے چہرے پہ کالک مَل رہا ہے
عجب اک تشنگی ہے میرے لب پر
سوا نیزے پہ سورج چل رہا ہے
یہ کیسی آگ ہے صحنِ چمن میں
شجر کا پتا پتا جل رہا ہے
نہیں دیتا ہے کوئی ساتھ میرا
مرے ہمراہ رستہ چل رہا ہے
گھٹائیں چھا رہی ہیں چاروں جانب
مری قسمت کا سورج ڈھل رہا ہے
چبھوتا ہے وہی اصغر کو نشتر
جو اس کی آنکھ کا کاجل رہا ہے

اُڑ رہا ہے جو دھواں چاروں طرف
ہے کہاں اب آسماں چاروں طرف
شہر میں وارد ہوا مَیں جس گھڑی
کھل رہی تھیں کھڑکیاں چاروں طرف
گوشہ دل میں چھپا ہے وہ کہیں
ڈھونڈتا ہے تُو کہاں چاروں طرف
بغض، نفرت اور تشدد چھوڑیے
امن سے قائم جہاں چاروں طرف
پیاس اصغر کی بجھانے کے لیے
ہے یہاں دریا رواں چاروں طرف

سوغات غزلیں

● غالب عرفان [پاکستان]

مسافتوں سے مکمّل نجات باقی ہے!
ابھی سفر میں ہوں تسخیرِ ذات باقی ہے

ستارے ٹوٹ رہے ہیں تو سوچتا ہوں کہ اب
مرے لیے بھی کوئی واردات باقی ہے

زکوٰۃ جسم کی دیتے ہوئے تو دن گزرے
پیامِ عید کو بس چاند رات باقی ہے

گرفتِ چشم سے اوجھل رہی ہے جواب تک
خیال وخواب میں وہ کائنات باقی ہے

وہ اپنی بات مکمّل تو کر چکا ہے مگر
جو اَن کہی رہی مجھ تک وہ بات باقی ہے

وہ بازو کٹ کے جو خوں ناب گر گیا دریا
اُسی کی یاد میں شاید فرات باقی ہے

وہ جسم وروح کی دنیا میں مر چکا ہے تو کیا
جہانِ شعر میں اس کی حیات باقی ہے

خود اپنی کھوج میں بھٹکے ہوئے مسافر کا
خودی کے دشت میں عرفانِ ذات باقی ہے

خوابوں کا جال بُن کر تعبیر کے سفر میں
میں خود اُلجھ گیا ہوں تقدیر کے سفر میں

صورت گری سے ہٹ کر آئینہ ہو نہ جائے
اک حرفِ صد معانی تحریر کے سفر میں

اک شب کا آخری پَل دیوار بن گیا ہے
اک صبح تو ہے پہلی تنویر کے سفر میں

کھا کر شکست اک دن ہٹنا پڑا تھا پیچھے
یہ مرحلہ بھی آیا تسخیر کے سفر میں!

گر سُن سکو تو سن لو دیوارودر سے پہلے
ہر خشت بولتی ہے تعمیر کے سفر میں

عرفان کا تقاضا پہنچائے گا کہاں تک
اب دیکھنا ہے مجھ کو تدبیر کے سفر میں

غالب عرفان

گرفتِ چشم میری زندگی کے پیش و پس تک تھی
نظر خوابوں کی لیکن آرزوؤں کے قفس تک تھی
تقاضا آگہی کا ذہن کی فکرِ رسا تک تھا!
نفس کی آمد و شد بھی ہَوا کی دسترس تک تھی
بہارِ رنگ و بو نے تازگی گلشن میں بکھرادی
مگر گل کی نظر دراصل تتلی سے مگس تک تھی
پھر اُس کے بعد سورج بھی اُبھر پایا نہ مشرق سے
علامت آخرِ شب کی بھی آوازِ جرس تک تھی
میں اپنی جنگ میں ہارا کہ جیتا یہ نہ پوچھو تم
خودی کی جست ویسے بھی اَنا کے خاروخس تک تھی
فرازِ دار پر گویائی ساری چھن گئی تو کیا
مری خواہش بھی تو کچھ اور جینے کی ہَوس تک تھی
نہیں معلوم اب وہ شہرِ عرفاں میں کہاں گم ہے
تمنّا جس کو پانے کی مجھے پچھلے برس تک بھی

ہماری خوش بیانی لکھ رہی ہے
نظر دل کی کہانی لکھ رہی ہے
زمیں اپنے ہی بچّوں کے لہو سے
کتابِ خونچکانی لکھ رہی ہے
سمندر میں بھنور کا ایک منظر!
ہَوا کی مہربانی لکھ رہی ہے
تعلق دھوپ سے کیا ہے شجر کا
سفر کی بے مکانی لکھ رہی ہے
جو اوجھل ہے کناروں کی نظر سے
وہ دریا کی روانی لکھ رہی ہے
نگاہیں دُھند میں کچھ پڑھ رہی ہیں
دلوں کی بدگمانی لکھ رہی ہے
مری تحریر میں خوشبوئے عرفاں
کہانی در کہانی لکھ رہی ہے

افتخار راغب

کچھ عرض کرنا چاہا روایت سے ہٹ کے آج
کرنا پڑا مقابلہ اپنا ہی ڈٹ کے آج
آنسو بہت بہے مگر آنکھیں چمک اُٹھیں
ماضی کو اپنے دیکھا جو ہم نے پلٹ کے آج
اپنی مثال آپ تھی جو قوم زور میں
کم زور کتنی ہو گئی ٹکڑوں میں بٹ کے آج
ممکن نہیں مصافحہ پر ہیں تو روبرو
اک آئینے میں آ گئی دنیا سمٹ کے آج
شیریں لبوں تک آپ کے آئے نہ جو کبھی
بہلا رہا ہوں دل انھیں لفظوں کو رَٹ کے آج
راغب تڑپتے دل کو ملا کس قدر سکون
برسوں کے بعد رویا جو خود سے لپٹ کے آج

ڈھانپ لیتی ہے رات سورج کو
کیا بتائیں یہ بات سورج کو
جانے کس روز ملنے والی ہے
شعلگی سے نجات سورج کو
ہم کو حاصل حواس کی دنیا
دھوپ کی کائنات سورج کو
اتنی گرمی ہے دیکھیے کس میں
کون دیتا ہے مات سورج کو
آخری سانس تک لٹاتا ہے
روشنی شش جہات سورج کو
ساری کرنیں وہی لپیٹے گا
جس نے بخشی حیات سورج کو
فیض پہنچا سکے گی کیا راغب
چاند کی التفات سورج کو

افتخار راغب

سامنے آ گئی اِک روز یہ سچائی بھی
دشمنِ جاں یہ سماعت بھی ہے بینائی بھی

تیری آنکھوں نے سکھایا مجھے جینے کا ہنر
ڈوب جانے کے لیے کم نہ تھی گہرائی بھی

میرے جذبات کا اظہار نہیں ہو پاتا
کچھ نئے لفظ دے یا چھین لے گویائی بھی

حسبِ معمول تجھے دیکھ کے دل شاد ہوا
خواب ٹوٹا تو طبیعت مری گھبرائی بھی

کس قدر خوف تمھیں تھا مری بے تابی سے
دیکھ لی تم نے مرے دل کی شکیبائی بھی

خود کو کرتی رہی قربان درختوں پہ ہُوا
سبز شاخوں کو کبھی توڑ کے اِترائی بھی

خوب شعلوں کو ہُوا دی اُس نے
آگ پانی میں لگا دی اُس نے

ڈائری لے کے مری چپکے سے
اپنی تصویر بنا دی اُس نے

دل ہُوا اور پریشاں میرا
جب کبھی دل سے دعا دی اُس نے

وجہِ بے خوابی بتا کر مجھ کو
نیند میری بھی اُڑا دی اُس نے

راہ ہموار کہاں ہو پائی
پھر سے دیوار اُٹھا دی اُس نے

اس کو لگتا ہے بہا کر آنسو
پیت کی ریت نبھا دی اُس نے

میں نے اِک بات کہی تھی راغب
بے سبب بات بڑھا دی اُس نے

شہرِ آہنگ

پیش رَونظمیں

صبا اکرام / غالب عرفان

ہم عصر نظمیں

راشد جمال فاروقی / شکیل اعظمی / سلیمان خمار /
کہکشاں تبسّم / ڈاکٹر نثار جیراجپوری / تبسّم فاطمہ / خاور نقیب

سوغات نظمیں

وحیدالحسن [امریکہ]

رباعیات

مامون ایمن / معراج احمد معراج

پیش رَو نظمیں

● صبا اکرام [پاکستان]

اِیکوَل جِنڈَر

ٹپکتی رال جیسی
خواہشوں کی دھوپ میں
احساس کے بپھرے سمندر کے کنارے
لال پیلی چھتریوں کے سائے میں
خود اپنے ہاتھوں
ہو کے وَستر ہین
لیٹی ریت پر یہ لڑکیاں
ایک تولیئے کے نیچے رکھ کر
لاج کی پونجی
ہوئی ہیں مطمئن
جیسے یہاں اب
اِیکوَل جِنڈر کے نعروں کی فضا میں
واسنا کا کھولتا تیزاب
ٹھنڈا ہو چکا ہو!

● غالب عرفان [پاکستان]

لافانی

یہ دنیا گرچہ فانی ہے
مگر ذہنِ رسا کی ماورا تخلیق کا رشتہ
کبھی فانی نہیں ہوتا، یہ رشتہ آدمی کو ذات کی
پہچان دیتا ہے، یہ رشتہ جذبۂ دل کو
خلوص و مہر کی وادی میں لے جا کر، خیال و خواب
بُنتا ہے۔ خوشی، سچی خوشی سے، ذہن کو سیراب کرتا ہے
محبت کا جہاں شاداب رکھتا ہے۔
یہاں جب آدمی کو شاعری کا فیض ملتا ہے
تو پھر تخلیق کی دیوی، مسلسل آگہی کا دان دیتی ہے
نیا ورَ دان دیتی ہے!
جب انساں ایک شاعر بن کے،
مستقبل کا منظر پیش کرتا ہے!
یہ کم احساں نہیں ہوتا، جو شاعر زندگی پر کر کے
بن جاتا ہے لافانی!

هم عصر نظمیں

● راشد جمال فاروقی

(۱)

ایک نظم

سمندر

سمندر
ریت پر پَسرا ہوا اُس ہاتھ لیتا ہے
مگر موجیں
کسی شیطان بچّے کی طرح
بغلوں میں آ کر گدگداتی ہیں
چڑاتی ہیں
کبھی تلوے کھجاتی ہیں
کسی طرح اسے سونے نہیں دیتیں
سمندر طیش میں آ کر بپھرتا ہے
تو لہریں ڈر کے واپس لوٹ جاتی ہیں

(۲)

میرا پیشہ

بلیک بورڈ کے کالے کالے سخت جسم پر
نرم Chalk کی سب تحریریں مٹ جائیں گی
کالِک باقی رہ جائیں گی
اور باقی رہ جائے گا
اک کارِ زیاں

(۳)

کرفیو

اک تتلی، دیوار سے چپکی
لرز رہی ہے
زور تھمے کالی آندھی کا
اور
وہ اپنے رنگ برنگے کام پہ نکلے

(۴)

ایک نظم

وہ تہی دست!
کہ احساسِ زیاں بھی چ مؤٹا
کھال میں مَست ہیں
اور کھال بھی مرجھائی سی
ہم کہ رہتے تھے سرِ خیمۂ خواب
وادیٔ گل میں بسر کرتے تھے
اس کی آغوش میں شب کاٹتے تھے
اُس کے بستر پہ سحر کرتے تھے

● راشد جمال فاروقی

(۵)

ایک نظم

وہ اپنے اسرار کھولتا ہے
ذرا ذرا سے
تھکا تھکا کر، ستا ستا کر
تجربہ گاہیں نئے نتائج اُگل رہی ہیں
مری کتابیں رموز سے، آگہی سے پُر ہیں
مگر ابھی کیا!

(۶)

ایک منجمد نظر

یہ فلک بوس پہاڑی
میری کھڑکی میں جڑا ہو کوئی منظر جیسے
دھند میں ڈوبی ہوئی
ایک گماں کی صورت
نت نئے رنگ بدلنے کی ادا سے عاری
یہ فلک بوس پہاڑی
اس کی مرطوب فضا سے کوئی بادل بنتا
یوں برستا کہ یہ منظر کھلتا
پھر دھنک رنگ بکھرتے ہر سو
پھر کہیں دور سے سیاح پرندے آتے

(۷)

ایک نظم

یہ سب لکھنے والے
کہاں بیٹھ کر لکھ رہے ہیں
یہ کیا لکھ رہے ہیں
مرے سامنے جو جہاں ہے
کتابوں میں ویسا کہاں ہے

(۸)

ایک نظم

بہت اچھوتے
بڑے نرالے پھول، وہاں دیکھے ہیں میں نے
جہاں کوئی بھی نہیں پہنچتا
مگر وہ کھلتے ہیں
اور اپنی اک عمر جی کر
خود اپنے پودوں کی کھاد بنتے ہیں
اور خوش ہیں
مہک رہے ہیں، چہک رہے ہیں

• شکیل اعظمی

(۱)

پرچم

اذانیں گونجتی ہیں مسجدوں میں
فلک سے رحمتوں کا نور ہر جانب برستا ہے
خدا سے اس کے بندوں کو ملانے کے لیے
بنایا جارہا ہے پُل نمازوں کا
بھجن سے مندروں کے دیوتاؤں کو پکارا جارہا
ہے
فضا میں آرتی کے پھول کی خوشبو مہکتی ہے
دعائیں ابنِ مریم کے مکاں میں
محبت کا نیا پیغام لے کر
ستاروں سی چمکتی ہیں
گھروں میں اور سڑکوں پر اُجالا ہی اُجالا ہے
دسہرہ
عید
دیوالی
کرسمس
سبھی تہوار بچّوں کے لبوں سے ہنس رہے ہیں
ہر اک بازار خوشحالی کے رنگوں سے سجا ہے
کئی دن سے
نہ کوئی آگ نہ کوئی دھواں ہے
بہت امن و اماں ہے
یہ دنیا خوبصورت ہے، حسیں ہے
کسی کے ہاتھ میں پرچم نہیں ہے

(۲)

کتّا اور انسان

میں بیٹھا تھا
اس نے مجھ پر
ٹانگ اٹھا کر مُوتا تھا
ردِ عمل میں
میں نے اس کا
مُوت اسے لوٹانا چاہا
غصّے کی اس حالت میں
مجھ میں اور کتّے میں زیادہ فرق نہیں تھا
غصّہ آگ ہے جنگل کی
دریا کا طوفان ہے غصّہ
غصّے پر قابو پالینا مشکل ہے
لیکن میں نے
مشکل کو آسان کیا
خود کو پھر سے کتّے سے انسان کیا

● شکیل اعظمی

(۳)

فوٹوجنِک چہرے

بہت فوٹوجنِک تھے ہم
چُنا تھا ہم نے تصویروں سے ہی اک
دوسرے کو
مگر جب ہم ملے تو
نہ وہ میں تھا
نہ وہ تم تھے
ہم اپنی اپنی حیرانی میں گم تھے
جو ہم اک دوسرے میں ڈھونڈتے ہیں
وہ لائٹ کا کرشمہ تھا
صفائی کیمرے کی تھی
اگر ہم اس حقیقت کو سمجھ جائیں
تو شاید پا سکیں اک دوسرے کو
بہت ممکن ہے
کچھ دن ساتھ رہ کر
ہمارے چہرے ویسے ہی چمک جائیں
محبت میں ہزاروں روشنی کے رنگ ہوتے ہیں

● سلیمان خمار

فیصلہ کچھ نہ اُگلو

۔۔۔ہاں تو میں کہہ رہا تھا
اُسے تم نے دیکھا نہیں ہے
فقط یوں ہُوا ہے
ہر اک کان کے حلق میں
اُس کی آواز کے شبنمی گھونٹ
اُنڈیلے گئے ہیں
آنکھ کی پُتلیوں میں تو سناٹوں کی فصل ہی
اُگ رہی ہے
کان اور آنکھ کا یہ طلسمی تضاد
ٹوٹنے ہی کو ہے
تب تلک
ذہن کے دانت سے
فکر کے دانے
یونہی چباتے رہو
فیصلہ کچھ نہ اُگلو۔

• کہکشاں تبسّم

(۱)

سلسلے سوالوں کے

ہزاروں صدیاں گزر چکی ہیں......

کسی سمئے میں وہ تھی ستونتی

کہیں ساوتری

کہیں تھی میرا

ہر ایک یگ میں عقیدتوں کی لہر میں بھیگی

تپسیا کے سحر میں گم سم

روایتوں کے نشے میں ڈوبی

تمھارے قدموں کی گرد کو وہ تِلک بناتی

دیے جلاتی تھی نقشِ پا پر

جنم جنم کا اٹوٹ رشتہ نباہے جاتی......!

ہزاروں صدیوں سفر کیا ہے

نظر جمائے

تمھارے پیچھے

تمھارے دکھ پر دکھی ہوئی ہے

تمھارے سکھ پر سکھی ہوئی ہے

مگر بتاؤ......

ہزاروں صدیوں کے درمیاں کوئی ایسا لمحہ

جو تم نے اس کے لیے جیا ہو

سوائے آنسو کے کوئی جگنو

کبھی جو آنچل میں جڑ دیا ہو

پرانے برگد پہ ایک دھاگا

کہیں تو اس کے بھی نام کا ہو

اندھیری طاقوں پہ اس کی خاطر

رکھا ہوا بھی تو اک دِیا ہو

نہیں ہے کچھ بھی

کہیں نہیں ہے......

وہ اپنی تاریخ میں تمھارا

لکھے بھی گر نام

کس طرح سے......؟

(۲)

تذبذب

وہ شاہیں......

جو پہاڑوں پر بسیرا کر رہا تھا

تذبذب میں گھرا ہے

کہاں جائے ـ؟

کدھر جائے -؟
پہاڑوں کا کلیجا چھلنی میزائلیں کرتی ہیں
دھماکے اور دہشت کی
خلا میں حکم رانی ہے
دھوئیں اور آگ کے موسم
ہر اک جانب ہیں خیمہ زن
ٹھکانا اب کہاں ڈھونڈے - ؟
کہ اب کے ابرؔ ہی لشکر
زمینوں کے بجائے آسمانوں پر
ہُوا قابض
ابابیلیں بھی غائب ہیں
نہ اب وہ قصرِ سلطانی کے گنبد ہی سلامت
ہیں
نہ باقی پہلے جیسے پرَ
اُڑانیں بھرتے پھرنے کو
فلک بھی تو نہیں خالی
کوئی بولے
کوئی تو مشورہ دے
لبوں پہ چپ یہ کیسی جم گئی ہے
نہیں......شاید
[illegible]موں کی فکر بنجر ہو چکی ہے......!!

• کہکشاں تبسم

(۳)

خود سے مکالمہ

تمھاری سسکیاں صدیوں رہی ہیں اَن سُنی
اور آنسو بھی تو ان دیکھے رہے ہیں
کہ تم سرگوشیوں کو بھی
خموشی کی ردا سے ڈھانپے رکھتی ہو
یہ نم آنچل اگر ہوتا زمیں
تو کب نمک کی کان بن جاتا
وراثت میں تمھیں ملتا ہی کیا ہے......؟
فقط اک صبر کی تلقین
مقدرّ جس کو کہتے ہیں......!
یہ روز و شب کی محنت کے عوض تم کو ملا بھی
کیا......
مصائب کی بھری تھالی
کٹورا بھر سلگتے زخم
خموشی اور گھٹن کی چٹنیاں، جن کو
نوالے کی طرح ڈالو
اور پھر کڑوے دھوئیں کے گھونٹ پی پی کر
پچالو چپ رہو

کہ بس اشاروں پر تمھیں روبوٹ کی صورت
ہے چلنا
خود اپنی آنچ میں جلتی رہی صدیوں
کبھی ان کو بھی یہ سب سونپ کے دیکھو
کہ جن کی بے نیازی، بے حسی کی آہنی چادر نے
اک جھونکا کبھی تازہ ہوا کا
نہیں آنے دیا تم تک......!!
زندگی کی سرد دیواروں پہ تم
فقط پینٹنگ کی صورت ہونگی
رنگ و روغن سے بھری، لیکن
تمھارے بول غائب ہیں...... سنو
اگر زندہ ہو تو آواز کی لو کو کرو روشن
نہیں تو بے صدا چیخوں نے کب سناٹا توڑا
ہے......!!!

● کہکشاں تبسّم

(۴)

دَلت چیتنا

یہ کیسا چہرہ ہے زندگی کا
کہ نسلِ انساں کا یہ قبیلہ
ہزاروں صدیوں غلام بن کر کھڑا رہا ہے
سیاہ رُو کا سیہ مقدّر
تمھاری مجلس میں ہاتھ باندھے
جھکائے سر کو مہر بہ لب تھا
ہزیمتوں کے عذاب سہہ کر
قیامتوں کا نزول دیکھا......!
گئے دنوں کے بہے پسینے کا کوئی قطرہ
پلک پہ جو کہ اٹک گیا تھا
شگوفہ بن کے وہ کھل چکا ہے
کہ شعلوں جیسا دہک رہا ہے
اب اس کی لپٹیں نظر نظر میں سفر کریں گی
بچا لو خود کو
قیامتیں ہیں گزرنے والی
کہ اب کی باری تمھاری آئی...........!!

کہکشاں تبسم

(۵)

سفر باقی رہے

سفر میں ہیں مسلسل ہم
کئی صدیاں، ہزاروں کے کلنڈر نے ورق پلٹے
مگر یہ پاؤں نہ ٹھہرے کہیں
اور نہ ہی تھمنے پائے اک تجسس پر
کہ آگے اور کیا ہے، کتنا باقی ہے......؟
ہمیشہ تازہ دم رکھا تحیّر نے
مگر کب تک مسافت کے یہ روز و شب؟
سنا ہے اب
قیامت اپنے جلوؤں کی جھلک رہ رہ کے
دکھلانے لگی ہے
زمیں ہے گرم تانبہ سی
کہیں دھنسنے لگی ہے
فلک جو کھوکھلا تھا، اب
دھواں ہونے لگا ہے
مگر یہ چاند، تارے اور یہ سورج
ابھی بھی اپنے محور پر سلامت ہیں
رواں بہتے ہوئے دریا کی موجیں ہیں
پہاڑوں پر ابھی بھی برف جمتی ہے، پگھلتی ہے
تھکے شانوں کو سہلاتے
ہوا کے نرم جھونکے بھی گزرتے ہیں
نہا کے شبنمی بارش میں اب بھی غنچے کھلتے ہیں
ابھی بھی تتلیوں کے پنکھ ہوتے ہیں دھنک جیسے
غنیمت ہے ابھی بھی وقت باقی ہے
چلو بڑھتے چلیں......شاید
ہمارے خواب کی تعبیر آگئے ہو
سکوں کے، امن کے موسم
محبت کی فضاؤں میں کہیں تو منتظر ہوں گے
انھیں ہے ڈھونڈنا باقی
چلو بڑھتے چلیں مل کر
سفر باقی رہے یوں ہی
کہ تھکنا موت ہے جاناں............!!!!!!

● کہکشاں تبسّم

(۶)

یہ غم ہے کیسا

یہ لفظ ماتم کناں سے کیوں ہیں......؟
سروں کو ہاتھوں سے تھامے دیکھو سِسک رہے ہیں
یہ کیسا غم ہے......؟
یہ غم ہے شاید بیاں سے باہر
وگرنہ کہتے زبان سے کچھ
تو بات کیا ہے......؟
ہے فکر کیسی......؟
ہے فکر شاید کہ اگلی نسلوں کا رابطہ نہ قلم سے ٹوٹے
وہ ہاتھ ماؤس پکڑنے والے
جو ایک پَل میں کِلِک کریں تو
جہانِ تازہ بکھر سا جائے نظر کے آگے
کہ ان کو سیرِ جہاں ہے حاصل
یہ بات اتنی بڑی نہیں ہے
تو لفظ ماتم کناں ہیں کیوں پھر......؟
ہے کیسا غم جو شدید تر ہے......؟

یہ لفظ شاید غمِ جدائی سے ہیں ہراساں
قلم سے دوری
بیاں سے دوری
زباں سے دوری
یہ خوف لفظوں میں بھر گیا ہے
یہ خوف شاید غلط نہیں ہے
یہ کون سوچے......؟
اگر ہُوا یوں......؟
کوئی تسلّی......کوئی دلاسہ
نہ کوئی آشا
نہ بڑھ کے کوئی سنائے مژدہ
کہ صدیوں خوابوں کا تم سے رشتہ بنا رہا ہے
بنا رہے گا
نہیں ہے کوئی کہ دے بھروسا
یہ درد بانٹے
یہ خوف جھٹکے
یہ آنسو پونچھے
یہ خوف شاید غلط نہیں ہے
اسی لیے تو یہ لفظ گریہ کناں ہوئے
ہیں......!!!!!

● ڈاکٹر نثار جیراجپوری

(۱)

معصوم کرن

تیرگی تھک کے
سرِ بام!
جب سو جاتی ہے
اک نویلی سی کرن
جھومتی اٹھلاتی ہوئی
جھیل کے نیل گوں
پیالے میں اتر آتی ہے
موجِ گرداب سے
کہتی ہے!
مرے ساتھ تو چل
حلقۂ دام کی پابند
گراں موجِ رواں
اس کی معصومیت پر
ہنس کے
یہی کہتی ہے
تو ہے آزاد
میں پابندِ حیات
تیرے ہم راہ بھلا
کیسے چلوں جانِ وفا
وقت ہے درمیاں حائل
ہمارے رشتوں میں
وہ کسی حال میں
ملنے نہیں دے گا ہم کو

(۲)

سنہری یاد

چاندی کے سکّوں کی صورت
دل رہ رہ
کھنکا کرتا ہے
ارمانوں کی
چنچل بیلیں
سوچ کی دیواروں کے اوپر
اکثر!
لہراتی رہتی ہیں
ساگر کی موجوں میں
چھپ کر
چاند سا کوئی!
جھلمل چہرہ
رہ رہ کر چمکا کرتا ہے

Hasnain Sialvi

ملالہ کے لیے کچھ نظمیں [نثری]

● تبسّم فاطمہ

(۱)

ملالہ
پیاری ملالہ
یہاں سب کچھ ناقابلِ یقین ہے/تمھاری
طرح
کہوں/کہ تمھارے اپنے آتے ہیں/
تو شاید تم بھی یقین نہیں کروگی/
کہوں/کہ ایک نوجوان بیٹے کی ماں ہوتے
ہوئے بھی/
ان دنوں میں پریوں کی دنیا میں ہوں/
تو شاید میری طرف تم تعجب سے دیکھو/

ملالہ، پیاری ملالہ
لیکن مجھے/
ایسے خوشگوار اور مسلسل آنے والے خوابوں پر
کوئی ملال نہیں ہے۔

جیسے طلسمی افسانوں میں
ایک شہزادی دیو کو مار گراتی تھی......
یا ایک ننّھی منّی راجکماری/
منہ سے شعلے اُگلتے راکشس کو
موت کی نیند سلادیتی تھی

ملالہ، پیاری ملالہ
تم ان شہزادیوں اور راجکماریوں سے بھی/
کمسن ہو/
خونخوار طالبانیوں کی سلطنت میں تمھاری
موجودگی
اب بھی میرے لیے کسی پَری کتھا جیسی ہے/
آسمان پر بدلیوں کے درمیان چاند کو
کبھی اس سے پہلے اتنا چمکدار نہیں دیکھا تھا
میں نے/

● تبسّم فاطمہ

(۲)

ملالہ

جانِ ملالہ،
تمھیں گلِ مکئی[1] کہوں یا کس نام سے
پکاروں/
ملال سے پیدا ہوئی تم/
آج کے خوفناک منظرنامہ میں/
کب کیسے بن گئی
ساری دنیا میں خوشبو بکھیرتی
پھول کی علامت
شاید یہ تم بھی نہیں جانتی تھی
اس غیر مہذّب دنیا میں
تیزی سے/
تمھاری خوشبو کو پھیلتے دیکھ رہی ہوں/
میں/

(۳)

ملالہ،
میری پیاری ملالہ،
سوچتی ہوں تو تعجب ہوتا ہے/
جمپر اور شلوار میں
ایک پیاری سی چنری سے منہ ڈھکے/
اسکولی بستے کو کندھے سے لگائے/
جب آخری بار/
پلٹ کر دیکھا ہوگا تم نے اپنے اسکول کو/
دیکھا ہوگا
گھنی داڑھیوں والے ہاتھوں کو آرڈی ایکس/
اور زہریلے ہتھیاروں سے کھیلتے/

سنے ہوں گے،
کان کی پرتیں پھاڑنے والے خوفناک دھماکے/

اور کیسی معصوم سی تم
گھر آکر بن گئی ہوگی
ملالہ سے گلِ مکئی

میں اس پرندے کے قصے کو جانتی ہوں
جو آگ میں جل کر ایک نئے جسم کو پالیتا تھا/

بندوق سے نکلی
بے رحم گولی کی تپش کو لے کر/
ملالہ،
پیاری ملالہ
تم بھی ایک نئے جسم میں داخل ہوگئی ہو/

سورج طلوع ہونے والا ہے
بدعنوان، غیر مہذّب اور دہشت سے لرزتی دنیا میں
تمھاری ننّھی سی اور معصوم سی عمر کی قسم/

● تبسّم فاطمہ

ملالہ

پیاری ملالہ

اس بے رحم اور سنگدل دنیا میں

تمھارے اندر

ایک بدلتی ہوئی تقدیر دیکھ لی ہے میں نے/

(۵)

میں اس پاکستان کو جانتی تھی

جہاں پچھلے ۶۷ برسوں میں سیاست اور

مذہب کے تعلق سے/

ایک کہرام مچا تھا/

جہاں جلتا ہوا تخت تھا

مرتے ہوئے راج نیتا تھے

جھلستی ہوئی جنتا تھی

جہاں دہشت کے سائے میں مرجھائے

ہوئے گلاب تھے

جہاں مسجدوں سے چلتی تھیں گولیاں/

جہاں سوات کی اندھی گھاٹیوں میں/

آزادی کی سزا کے طور پر/

کوڑے پڑتے تھے دین کی بیٹیوں پر

جہاں ٹوپی، داڑھی اور فوج کے سائے میں

عام آدمی بھول چکا تھا، جینا

ملک کی اب تک کی تاریخ میں

جہاں ایک نام/

صرف نفرت کا باب لکھنے کے نام سے/

جانا جاتا تھا/

ملالہ،

خوش آمدید

غضب کیا تم نے ملالہ

عمر کے ۱۵ برسوں کی خوشبو دے کر

دھو ڈالے داغ کے دھبّے

اور بن گئی/

اپنے چمکتے چہرے کے ساتھ/

نئی دنیا کی آبرو

خوش آمدید!!

● خاور نقیب

کہانی کی صورت

جہاں میں
ہزاروں حکایات، قصّے
سفر کرتے کرتے
پہنچتے ہیں ہم تک
یہ ہیں وہ مسافر
جو سینوں پہ
اپنے قدم کے نشاں چھوڑ جاتے ہیں
گویا یہ تعویذِ جاں ہم
وراثت میں بچّوں کو بخشیں
وصیّت کے کاغذ پہ
مہرِ تحفظ لگا کر
پر و بال پھیلائے باہر نکل آئیں
اور اک کہانی کی صورت
مہاجر پرندوں میں گھل مل سے جائیں
زبانوں زبانوں
سفر کرتے جائیں!!

سوغات نظمیں [نثری]

● وحیدالحسن [امریکہ]

(۱)
آخری کھیل

پھولوں سے لدی شاخ پر
بیٹھا ہوا گِدھ
اپنی نوکیلی چونچ صاف کرتا ہوا
سوچ رہا ہے
نیچے ہری گھاس پر یہ دوڑتے ہوئے چوزے
کتنے بھلے لگ رہے ہیں
دوڑتے بھاگتے،
ایک دوسرے کا پیچھا کرتے
کتنے مگن ہیں اپنی دنیا میں
انھیں میری بھوک کی خبر نہیں ہے
یہ نہیں جانتے ہم نے اِن کا کتنا انتظار کیا ہے
اب اور برداشت کرنا ممکن نہیں
یہ اب اور نہیں کھیل سکتے
اور نہیں کھیل سکتے!!

(۲)
ہم شناخت

اِس دھوکوں سے بھری دنیا میں
ہم شناخت ہونا
دھوکے کا سبب بن سکتا ہے
اور
اُس دِن ایسا ہی ہوا
جب اُس گورے نے
پگڑی اور داڑھی والے
ہم شکلوں میں
تمیز کرنا ضروری نہیں سمجھا
ہم شناختگی کی اتنی بڑی قیمت
انھوں نے دی
جن کا دور کا بھی واسطہ
دوسرے پگڑی داڑھی والوں سے
نہیں تھا
خدا کی یاد میں مشغول
انسانیت کی فلاح کے خواہاں
اپنی عبادت میں لگے
قصوروار ٹھہرے
ہم شناختگی کے
اور
جاں بحق ہوئے بے قصور ہو کر
جب عقل نابینا ہو
اور نفرت جو الا مُکھی
اُس کے دہانے پر
معصومیت کا شکار ہونا
ناگزیر ہے!

● مامون ایمن، نیویارک [امریکہ]

[الف]

سوالات

(۱)

ماحول کی، حالات کی دنیا یک سَر
جذبات، خیالات کی دنیا یک سَر
ہونٹوں کو جوابوں سے نہیں کوئی غرض
ٹھہری ہے سوالات کی دنیا یک سَر

(۲)

آنسو کسی پتھر نے بہایا کیسے
کرنوں کے لیے مَر مٹی چھایا کیسے
روتی ہے خوشی دہر میں غم کی خاطر
رُوٹھے ہے کسی جیب سے مایا کیسے

(۳)

آنکھوں میں کوئی ناز سمایا کیسے
جذبات نے چہرے کو چھپایا کیسے
ہونٹوں نے تمنا سے چُرا کر نظریں
قصہ کسی دھڑکن کا سُنایا کیسے

(۴)

کھو جاتا ہے احساس سے جذبہ کیسے
بنتا ہے کسی بات کا قصہ کیسے
دنیا کو سکھاتا ہے بکھرنا جگ میں
پتھر سے اُلجھتا ہوا شیشہ کیسے

(۵)

وعدوں کی طرح دہر میں ٹلتے کیسے
گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے کیسے
کردار کی جاگیر تھے دنیا میں، ہم
ماحول کے ہر سانچے میں ڈھلتے کیسے

(۶)

آندھی میں کوئی سانس کو ترسے کیسے
آئینہ کسی عکس پہ برسے کیسے
دنیا کا سراپا ہو مقدر جس کا
نکلا ہے اچانک وہی گھر سے کیسے

(۷)

قطرے کی تمنا میں سمندر کیوں ہے
سچائی میں بھی خواب کا پیکر کیوں ہے
باطن سے الگ ٹھہری ہے ظاہر صورت
اندر نہیں جو چیز وہ باہر کیوں ہے

(۸)

ہستی میں نمو ذات نمائش کیوں ہے
منزل سے پرے جانے کی کاوش کیوں ہے
انسان کو ہر آن زمیں سے کٹ کر
افلاک میں کھو جانے کی خواہش کیوں ہے

[ب]

چہرہ

(۱)

دُزدیدہ خیالوں کی عبارت کوئی
بستی کسی جنگل میں عمارت کوئی
ہے دھوپ، کہیں سایہ جہاں میں چہرہ
توصیف کبھی خود سے حقارت کوئی

(۲)

محفل میں نظر آتا ہے رقصاں چہرہ
بستی کی نگاہوں میں ہے ارزاں چہرہ
تنہائی کی ہر بات الگ ہے، یعنی
ان لمحوں میں ہوتا ہے بیاباں چہرہ

(۳)

سَرمَست، طرح دار، سویرا چہرہ
خوش بوؤں کا، رنگوں کا بسیرا چہرہ
شرمائے سدا دھوپ کی شدّت جس سے
آنکھوں کی وہ ٹھنڈک ہے گھنیرا چہرہ

(۴)

اُمّید کے ماحول میں پلتا چہرہ
جذبات کی دُنیا میں سنبھلتا چہرہ
مِل جاتا ہے مٹّی میں بھی یوں ہی کیسے
اِک پَل میں کوئی پھولتا پھلتا چہرہ

(۵)

آسودہ، پریشان بنا دیتا ہے
پتھر کو بھی انسان بنا دیتا ہے
صحرا کو بناتا ہے وہ چہرہ گلشن
جو خود کو بیابان بنا دیتا ہے

(۶)

گُم راہ زمانے سے سوا ہوتا ہے
پُر عزم بھی رستے سے ہٹا ہوتا ہے
خود کو بھی منا سکتا ہے روٹھا چہرہ
چہرہ کبھی خود سے بھی خفا ہوتا ہے

(۷)

منزل پہ سرابوں کا نشاں ہوتا ہے
اِظہار میں باطن کا بیاں ہوتا ہے
اس میں بھی نہاں ہوتے ہیں اَسرار کئی
چہرے سے جو مضمون عیاں ہوتا ہے

(۸)

حالات کے جھونکوں سے سنورنے والا
ہستی کی حقیقت سے مکرنے والا
انکار ہو خود اپنے ہی چہرے سے جسے
وہ شخص نہیں تہہ سے اُبھرنے والا

(۹)

سچائی کی دنیا میں فسانہ کوئی
پھولوں کبھی تیروں کا نشانہ کوئی
آنکھوں سے جُدا ہو کے بھی ڈھونڈے چہرہ
ہر سانس پہ مرنے کا بہانہ کوئی

(۱۰)

چہرے کے لیے جسم سجاتے ہیں ہم
چہرے کے لیے جان بچاتے ہیں ہم
چہرے کو دِکھاتے ہیں تماشا، ایمن!
چہرے کو تماشا بھی بناتے ہیں ہم

● معراج احمد معراج

رباعیات

(۱)

محسن ہے مکرّم ہے فیّاض ہے وہ
دنیا کے ہر اک شخص کا نبّاض ہے وہ
جب چاہے وہ کاٹ دے انفاس کی ڈور
معراج سنو صاحبِ مقراض ہے وہ

(۲)

محنت کے بنا ہُن بھی نہیں ملتا ہے
تیشے کا تمدّن بھی نہیں ملتا ہے
جو چیر کے مٹّی کو نکالے سونا
ہر شخص میں یہ گُن بھی نہیں ملتا ہے

شہرِ افسانہ

شوکت حیات

صدّیق عالم

نورالہدیٰ سیّد

اخلاق احمد

یاسین احمد

صغیر رحمانی

غزال ضیغم

سرخ وسبز

● شوکت حیات

(۱)

مُلّا محمد سالم سر پر پاؤں رکھ کر بے تحاشا بھاگتے جا رہے تھے۔

اندھیرے اور غفلت کا فائدہ اٹھا کر انھوں نے راہِ فرار اختیار کر لی تھی اور اب چوکنا نظروں سے کبھی کبھی رک کر پیچھے اور دائیں بائیں نظر دوڑا لیتے تھے۔

رات اپنے تیسرے پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ فجر کی سپیدی نمودار ہونے میں ابھی کافی دیر تھی۔

نیم روشن ملگجی رات میں اوبڑ کھابڑ راستوں پر چلتے ہوئے ملّا محمد سالم ہانپنے لگے۔

متعدد حادثوں کی زد میں ملّا محمد سالم کی شخصیت ٹکڑوں میں بٹنے لگی تھی جس کا انھیں بے حد ملال تھا۔

کوئی تبدیلیوں کے ذکر پر ہامی بھرتا!

کوئی احتجاج کرتا!

اور کوئی چپکی سادھے رہنے کا مشورہ دیتا!

اور کوئی..........

گہرے استغراق اور مراقبے سے حاصل کردہ ان کا امتزاجی رویّہ جو مختلف النوع افکار میں سے مثبت عناصر کو جذب کر کے گرہ میں باندھ لیتا تھا؟ دھیرے دھیرے معدوم ہوتا جا رہا تھا۔

مُلّا محمد سالم کئی مہینوں سے پس و پیش میں مبتلا تھے۔

ان کا قصہ زیادہ پیچیدہ نہیں۔

لیکن پہلے ان کے اطراف کا بیان بہتر ہوگا۔

اس علاقے کی زمین بے حد کھردرے اور اوبڑ کھابڑ راستوں کا بوجھ ایک مدّت سے سہہ رہی تھی۔

آس پاس چھوٹی بڑی پہاڑیوں، ٹیلوں اور جنگلات کے سلسلے چاروں طرف پھیلے ہوئے

تھے۔

اخروٹ، بادام، پستہ اور انجیر کے باغات غیر مسطح زمین میں بھی اُگائے گئے تھے اور ان کی دال روٹی کا نظم کرتے تھے۔

پُرکھوں سے چلے آرہے بوسیدہ رسم و رواج والے اس قصبے میں ایک قبلہ تو اپنی جگہ قائم تھا لیکن قبیلہ کو بعض امور میں حیرت انگیز طور پر فوقیت و برتری حاصل تھی۔

شروع شروع میں حالات معمول اور روایت کے مطابق تھے۔ کہیں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ انھوں نے پیدا ہوتے ہی چاروں طرف کھردراپن، ملگجا اندھیرا اور بند گلیوں کے جال والے قصبوں کا سامنا کیا تھا جہاں بھیڑ اکٹھا ہو جاتی تو چلتے ہوئے کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔

لیکن ملاّ محمد سالم کا معاملہ ذرا ان سے مختلف تھا۔

(۲)

مُلاّ محمد سالم بن مُلاّ محمد عالم۔

لیکن ان کے اطراف کے بارے میں مزید کچھ قابلِ ذکر باتیں۔

ابتدا میں ایسی کوئی تشویش کی بات دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

آزادی کے باوجود بدحالی اور قحط نے علاقے کے مختلف حصوں میں اپنے سیاہ پنجے گاڑ رکھے تھے۔ وقت وہاں ٹھہر سا گیا تھا یا رک رک بہت دھیمی رفتار میں کچھوے کی چال چلتا ہُوا آگے بڑھ رہا تھا۔

گاڑیوں کے بجائے آمد و رفت کے لیے ابھی بھی بیش تر آبادی اونٹ اور ٹٹوؤں پر منحصر تھی۔

کہتے ہیں اس علاقے کی ناہموار زمین کے نیچے چھپی ہوئی معدنیات کی دولت پر دو بڑی طاقتوں کی بُری نظر ایک زمانے سے تھی۔

ایک کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔

دوسرا اسے مرکز میں رکھ کر تیار کیے گئے اپنے طویل مدتی منصوبوں کو بروئے کار لانے کے لیے پوری مستعدی سے کوشاں تھا۔

اچانک اخروٹ، بادام، انجیر، پستہ، آڑو، ناشپاتی، انگور وغیرہ کے درختوں کی پتیوں کا رنگ بدلنا شروع ہوا۔

شاید یہ بھی اچانک نہیں بلکہ بہت دھیمی رفتار سے ہوا تھا اور مدتوں سے ہوتا آرہا تھا؟ اس طرح کہ شروع میں انھیں کچھ غیر معمولی ہونے کا احساس ہی نہیں ہوا۔

لیکن اب واضح طور پر پتوں کے رنگ میں نمایاں فرق آگیا تھا جسے کوئی بھی بصیرت والا آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔

لوگوں نے اسے تبدیلیِ موسم اور ہواؤں کی رفتار کی اتھل پتھل قرار دیا۔
مُلّا محمد سالم نے خطبے میں فرمایا:
''گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ خدا کو شاید ہمارے صبر کا امتحان مقصود ہے!''
پھر چند دنوں کے بعد پتیوں کے ساتھ خشک میوہ جات اور پھلوں کے مزے میں بھی تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوئی۔
ان کی تعداد اور سائز میں بھی کمی ہونے لگی۔
ایسا معلوم ہوتا کہ انھیں تپش نے جھلسا دیا ہو اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے ٹھنڈا دیا ہو۔
مُلّا محمد سالم نے خطبے میں تشویش کا اظہار کیا اور آنکھیں کھلی رکھ کر مشاہدہ کرتے ہوئے چوکنا رہنے کا مشورہ دیا تو پُراسرار طور پر تنظیم والوں نے ان سے رابطہ قائم کیا۔
انھیں اندیشہ ہوا کہ شاید انھوں نے کوئی غلط بات کہہ دی۔ کچھ لمحے کے لیے اُنھیں ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے ان کی نیک نامی کے سفید کاغذ پر سیاہ پنج گاڑ دیے ہوں۔
بعد ازاں بات چیت آگے بڑھنے پر اندازہ ہوا کہ تنظیم والوں اور ان کے عندیے میں کافی دور تک مشابہت تھی۔
تنظیم والوں نے فرمایا:
''آپ جیسے توانا قد آور اور لحیم شحیم انسان کو خدا میدانِ جنگ میں دیکھنا چاہتا ہے..... غازی یا شہید کی شکل میں....... اپنی قابلیت کے جوہر وہاں دکھائیں!''
مسجد کے منبر اور امامت سے ہٹا کر اُنھیں دوسرے امور پر مامور کر دیا گیا۔ اُنھیں بھی لگنے لگا کہ ان کا فربہ اندام جُثہ عسکری اور مجاہدانہ کارناموں کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ ان کی جسامت کے لیے مسجد اور خانقاہ کی چاردیواری چھوٹی پڑ رہی ہے۔
مثبت تبدیلیوں اور بہتری کے وہ بھی خواہاں تھے۔ معدنی ذخائر کو کسی کی بری نظر نہ لگے! وہ بھی یہ چاہتے تھے۔ اگر ان کا استعمال قبائل کی قلاشی دور کرنے کے لیے کیا جائے تو اللہ خوش ہوگا اور ان کی سلامتی کا ضامن ہوگا۔ متفرق ٹکڑوں میں بٹے ہوئے قبیلے آپس میں جڑ کر شاید ایک قومیت کی تشکیل کر سکیں.......
وہ اپنی مرضی سے ہتھیار بندوں میں شامل ہوئے۔
ان کے باپ کو ملال ضرور تھا لیکن انھوں نے بھی آنے والے کل کے سہانے خواب دیکھتے ہوئے امام ضامن باندھ کر بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔
اچانک صبر و تحمل اور مصلحتوں کا مضبوط باندھ بھر بھرا کر ٹوٹ گیا....... آنسوؤں کا رکا ہوا دریا ہڑ ہڑ کرتا ہوا بہہ نکلا...... دونوں کی پشت اور کندھے تر ہو گئے۔

''نصر من اللہ فتح قریب o'' کہتے ہوئے انھوں نے بیٹے کو رخصت کیا۔

دور تک وہ اپنے لمبے چوڑے بیٹے کو بھیگی آنکھوں سے دیکھتے رہے حتیٰ کہ نقطہ بن کر بیٹا افق میں معدوم ہوگیا۔

شروع شروع میں انھیں کھلے آسمان کے نیچے پہاڑوں کے درمیان مسطح خطے پر لگاتار ورزش کرائی گئی۔ ان کے جسم سے زائد چربی زائل ہوئی تو بازو اور ران کی مچھلیاں تڑپنے لگیں۔

دوڑتے ہوئے انھیں سانس درست کرنے اور دم سادھنے کی مشق سے گزرنا پڑا۔ ایک دن ورزشوں کے بعد محمد سالم تن کر کھڑے ہوئے تو ان کے بجائے ایک اونچی پہاڑی آنکھیں مچکاتی اور گہری گہری سانسیں لیتی ہوئی اس علاقے کی بھوری زمین کا جائزہ لے رہی تھی۔

سچ مچ پورا جسم چٹانوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔

اندر قلب اور مغز اب بھی بچ گئے تھے جو پتھروں کے اندر محبوس اٹ پٹا پن محسوس کر رہے تھے۔

اڑتے ہوئے پرندوں نے اپنے پنکھ پھڑ پھڑا کر، ان کے سر پر سے گزرتے ہوئے انھیں سلام کیا اور آسمان کی وسعتوں کی طرف روانہ ہوگئے۔

(۳)

اس قصبے میں کچھ لوگ ایسے تھے جن کے میوہ جات کے باغ اب بھی لہرا رہے تھے۔ ملاّ محمد سالم بن ملاّ محمد عالم ان چند خوش نصیبوں میں تھے جو خوش حال ہونے کے ناتے ضرورت مندوں کی حتی الامکان حاجت روائی کرتے تھے۔ ان کے والد محمد سالم کو ہتھیار بندوں کے درمیان جاتے ہوئے ٹکر ٹکر دیکھتے رہ گئے تھے۔ اگر بیماری نے ان کی کمر کو خمیدہ نہ کر دیا ہوتا تو شاید وہ بھی لام میں شامل ہو جاتے۔

محمد عالم میوہ جات کی تجارت کرتے تھے جس نے ان کے مشترکہ کنبے کے ہر فرد کے چہرے پر سُرخی قائم کر رکھی تھی۔

ملاّ محمد سالم کے جانے کے بعد ایک دن برآمد کیے ہوئے خشک میوہ جات کے بکسے واپس آ گئے تو ان کا تشویش میں مبتلا ہونا لازمی تھا۔

منڈی میں کھلبلی مچ گئی۔ ہُنڈی آنے کے بجائے اعتراضات کے ساتھ سامان واپس آنے لگے۔ ان کی تجارت کی نیک نامی خطرے میں پڑ گئی۔

آگے کیا ہوگا؟

لوگوں کے چہرے خوف اور سراسیمگی سے پیلے پڑنے لگے۔

پیڑوں کی پتیوں اور آدمیوں کے چہروں کی زردی اس حد تک مشابہ ہوگئی کہ لوگوں کو اپنے آپ سے وحشت ہونے لگی — کوئی اپنے باغ کے نیچے کھڑا ہوتا تو دور سے دیکھنے والوں کو لگتا کہ پیٹر کی شاخ سے کوئی

انسانی چہرہ لٹک رہا ہے۔ اداس اور سوگوار۔

ان مشکل گھڑیوں میں لوگوں نے محمد سالم کو شدّت سے یاد کیا۔ وہ ہوتے تو رہنمائی کرتے۔

اس ماحول میں غور و فکر اور لب کشائی کی تاب وہی لا سکتے تھے۔ ان کی انھی خصوصیتوں کے پیشِ نظر تنظیم والے اُنھیں اپنے ساتھ لے گئے۔

کچھ لوگ ملاّ محمد سالم کے والد مُلاّ محمد عالم کے پاس پہنچ گئے۔

خمیدہ کمر مُلاّ کی شخصیت کی تمکنت سے مرعوب ہو کر کوئی سوال کرنے کی جسارت نہیں کر رہا تھا۔

مُلاّ نے ہی پوچھا:

''کیا بات ہے...... تم لوگ تشویش میں کیوں مبتلا ہو..... آفات ناگہانی تو ہمارا مقدر بن چکے ہیں.......!''

''حضور........ میوہ جات کے بکس کے بکس اعتراضات کے ساتھ واپس ہو رہے ہیں!''

محمد عالم گہرے سوچ میں غرق ہو گئے۔ خود ان کا کاروبار نشانے پر تھا۔ ان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے۔ کچھ دیر کے توقف کے بعد انھوں نے خالی آنکھوں سے ایک مرتبہ آسمان اور پھر لوگوں کے چہروں کی طرف دیکھا:

''بکس کھولو.....!''

کچھ لوگوں نے بڑھ کر بکس کھولا۔ میوے ٹھٹھرے اور جھلسے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

انھوں نے کہا۔

''کھاؤ!''

ایک باریش تاجر نے بیک وقت کچھ بادام منھ میں ڈالے۔ اگلے ہی لمحے اس نے عجیب سا منھ بنایا۔ اور آخ تھو کرنے لگا۔

''ان کے ذائقے کڑوے کسیلے ہو گئے..... اصلی مزہ ختم ہو چکا..... اللہ ہم سب پر رحم کرے!''

ملاّ محمد عالم نے اداس اور خالی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا جہاں دھواں اور کہرے کے دبیز غلاف کی پشت پر بار بار بجلیاں کوندر ہی تھیں۔

نوجوانوں کو غصہ آیا۔ ان کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

''ہمیں موسم سے لڑنا ہوگا!''

مُلاّ نے انہیں صبر کرنے کی تلقین کی اور ہدایت کی کہ وہ لوگ میوہ جات کے اس انجام کا سبب جاننے کے لیے جستجو میں لگ جائیں۔ ہر باغ والا کنبہ باری بدل بدل کر پہرہ دے اور پتا لگائے کہ درختوں کی پتّیوں کے زرد ہونے اور میوے کے بدمزہ ہونے کا راز کیا ہے۔

لوگ ٹوہ میں لگ گئے۔

کئی دنوں کی چھان بین کے بعد لوگوں کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں جب انھیں معلوم ہوا کہ کوئی ہیولا درختوں کی جڑوں میں تیزاب ڈال رہا ہے۔

(۴)

لوگوں نے ملا محمد سالم کو بے تحاشا یاد کیا۔

وہ ہوتے تو مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ڈھونڈ نکالتے۔

لوگوں نے ہیولوں کا تعاقب کیا لیکن آن واحد میں وہ چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ کہیں کوئی انہونی یا غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔ کہیں کسی ہیولے کا وجود ہی نہیں تھا۔

خواتین خانہ نشین ہو چکی تھیں۔ وہ جو کچھ دیکھتیں، کھڑکی اور دروازوں کی درزوں سے جھانک کر۔ اس میں بھی اُنھیں احتیاط برتنی پڑتی۔ کمرے کو تاریک کر دینا پڑتا۔ ورنہ درزوں میں کسی سائے کا شبہہ ہوتے ہی گولی آر پار ہو جاتی۔ رات میں بستر پر ہم آغوش ہونے سے قبل اپنے شوہروں کی سرگوشیوں سے عورتوں کو باہر کی خبریں ملا کرتیں۔ ایسے ایسے واقعات رونما ہونے لگے کہ ان کے بستر پر ان کی گرماگرمی مجہولیت میں بدلنے لگی۔ کئی کئی راتیں وہ کروٹیں بدل بدل کر بے چینی میں گزارنے پر مجبور ہو جاتیں۔ حادثوں کے تواتر نے انھیں نڈھال بنا کر بے کیفی سے دوچار کر دیا تھا۔

عورتوں نے دیکھا کہ گھر کے کمروں اور گھر کے اسباب کی جگہ بے ترتیبی کا شکار ہو گئی ہے۔ باورچی خانے کی چیزیں خواب گاہ میں اور سونے کے کمروں کی اشیا باورچی خانے میں رکھی ملتیں۔ معلوم ہوتا کہ باورچی خانہ میں سونے کا کمرہ دَر آیا ہے۔ اور خواب گاہ نے باورچی خانے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ آنگن اپنی جگہ سے بے جگہ ہو کر کبھی کمروں میں گھس آیا ہے، کبھی برآمدے کا سینہ روندرہا ہے۔ اندرون خانہ کی یہ افراتفری ان کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ چیزیں بھلا اس طرح تتر بتر ہوتی ہیں۔

جن کے شوہر تنظیم والوں کے ساتھ لام پر چلے گئے تھے؛ ان کی عورتوں کی تڑپ دیکھنے کے قابل تھی۔ بدن کے جن حصّوں سے پہلے شہد ٹپکتا تھا، وہ اپاہج بنتے جا رہے تھے۔ ان کے اندر کے اُبال اور تلاطم سے ان کا جسم جیسے کٹ کٹ کر ان سے الگ اور بیگانہ ہوتا جا رہا تھا۔ جسم کی سلگتی ہوئی انگیٹھی اُنھیں خوابوں کے پُراسرار اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے پر مجبور کر رہی تھی۔

ہائے رے نامراد بدن...... تیری طلب کے شعلوں سے تو پورا گھر اور قصبہ سلگ اٹھے.....
نگوڑے جسم..... تو نے دریا کے عین درمیان منجدھار میں غرقاب ہونے کا عتاب جھیلنا ہے۔

کچھ دنوں کے بعد لوگوں نے غور کیا کہ کنبے کے افراد میں کمی ہونے لگی تھی۔ متعدد لاشیں جا بہ جا پھینکی ہوئی ملیں۔

مشاہدہ بڑھا تو ایک اور تبدیلی کی جانکاری ملی۔ پتّیوں کے ساتھ بادام، اخروٹ، پستہ اور دیگر میوہ جات کے رنگ اب سرخی مائل ہونے شروع ہو گئے تھے۔

ملاّ محمد سالم کے والد نے تبدیلیوں کے اسباب پر نظر رکھنے کے لیے ایک ٹیم کی تشکیل کردی۔

اس نئی تبدیلی کو لے کر لوگوں نے چھان بین کی تو پیڑوں کی جڑوں میں تیزاب کے ساتھ اب خون کے چھڑکاو کے پراسرار اور خطرناک عمل کا انکشاف ہوا۔

لوگوں کا چہرہ فق ہو گیا۔ بدحواسی کے باوجود تحمل سے کام لیتے ہوئے کچھ نے تعاقب کیا اور ہکا بکا رہ گئے۔

ملاّ محمد عالم تک بات پہنچائی گئی کہ قصبے میں وہی ایک دانشور رہ گئے تھے۔ ملاّ نے انھیں دوسرے دن آنے کے لیے کہا اور خود ایک کُھرپی کے ساتھ اپنی خمیدہ کمر کو سیدھا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے لنگڑے پیروں سے باغات کی طرف روانہ ہو گئے۔ بیچ بیچ میں آسمان کی طرف سے آتے ہوئے آتشیں پھولوں کے گولوں سے بچنے کی کوشش بھی کرتے جاتے۔

دیکھنے والوں نے ان کی خمیدہ کمر، بے بس چہرے اور عجیب الخلقت چال کو دیکھتے ہوئے اپنے چاروں طرف سیاہ پنجوں کے منحوس رقص کا دل آزار منظر اُبھرتے دیکھا۔

دوسرے دن لوگوں کا ہجوم ان کے دروازے کی کُنڈی کھٹکھٹا رہا تھا۔

''میں نے کل پورے دن معائنہ کیا۔ کمزور ہاتھوں سے زمینوں کو کریدنے کا کام بھی کیا۔ میرا مشاہدہ ہے کہ اللہ نے ابھی بھی اپنی کرم فرمائی کی رسّی ڈھیلی چھوڑ رکھی ہے۔ درختوں کی جڑیں اوپر سے ضرور جھلس گئی ہیں.....پتّیاں زرد اور سرخ ہو گئی ہیں...... میوے اپنے قدرتی ذائقے سے محروم ہونے لگے ہیں...... لیکن.....''

ملاّ محمد عالم رک گئے۔ لگاتار بولتے بولتے وہ ہانپنے لگے تھے۔

''میں نے جڑوں کو کریدا..... اندر تک کھود کر دیکھا تو پایا کہ ہمارے درختوں کی جڑیں اوپر سے ضرور جھلس گئی ہیں لیکن بہت گہرائی میں ان کے اندرون میں شادابی ابھی بھی بچی ہوئی ہے!''

اب کیا ہو......؟

لوگ ہراساں اور سوالیہ نظروں سے انھیں گھورنے لگے۔

''اس کا جواب تو سالم ہی دے سکتا ہے۔ لیکن پہلی نظر میں مجھے ایسا لگتا ہے کہ ان آتشیں بارش کو روک پانے میں اگر تم نے کامیابی حاصل کی تبھی آگے کا راستہ کھل سکتا ہے!''

کچھ دیر کے توقف کے بعد انھوں نے کہا:

''مکمل جواب میرے بیٹے سالم کے پاس ہے۔ زندگی میں اس نے ہمیشہ غور و خوض اور تجربے کو ترجیح

دیا ہے۔''

کچھ سوچنے کے بعد انھوں نے پھر سے کہنا شروع کیا:

''لیکن تمھارے لیے اتنی طاقت حاصل کرنا ضروری ہے کہ اس بارش کو روکو...... اگلی بارش کا پانی درختوں کی جڑوں میں پہنچ کر انھیں سرسبز بنا سکتا ہے...... پرندے لوٹ سکتے ہیں...... چہچہاہٹ شروع ہو سکتی ہے......''

سانسوں پر قابو پانے کے لیے انھوں نے توقف کیا:

''اگلی بارش کیسے ہوگی اس کا فارمولا میرا بیٹا ہی بتا سکتا ہے......

اللہ سے دعا کرو کہ وہ زندہ سلامت اپنے قبیلے اور کنبے میں لوٹ آئے...... خدا اس کی عمر دراز کرے!''

لوگ دھیرے دھیرے بوجھل قدموں سے اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئے۔

(۵)

میدانِ کارزار میں دھماکوں، بارود کی مہک اور دھواں کے درمیان ہتھیار چلاتے ہوئے ان کی انگلیاں شل ہو گئیں تھیں۔ کندھے دُکھنے لگے تھے۔ سونے اور جاگنے کا معمول ختم ہو چکا تھا۔ دن اور رات کے معمولات سے ان کا تعلق ٹوٹ چکا تھا۔

کسی طرح یہ سلسلہ بند ہو اور ان کی گلو خلاصی ہو۔

پہاڑ کی سرنگوں اور غاروں میں پناہ گزیں رہتے ہوئے ایک مدّت بیت چکی تھی۔

سالم یہ بھولے نہیں تھے کہ ان کے والد ملاّ محمد عالم خمیدہ کمر اور ضعیف ہو چکے ہیں۔ عمر کے اس حصے میں انھیں اپنے بیٹے کے تعاون کی شدید ضرورت ہے۔

پہاڑ کی چٹانوں پر سوتے ہوئے ایک ملگجی چاندنی رات میں ان کی نیند ٹوٹی تو انھیں اپنے گھر اور اپنی بیوی دلربا خانم کے گداز بدن کی یاد زوروں سے ستانے لگی۔ جوں جوں رات گزر رہی تھی، ان کے دل و دماغ کی نسیں سلگتی جا رہی تھیں۔ شریانوں میں بجلی کی کڑکڑاہٹ بڑھ رہی تھی۔ ان کا سلگتا ہوا سارا وجود عجیب و غریب صورت اختیار کرنے لگا تھا۔

عورت کے دہکتے ہوئے نیم عریاں گٹھیلے بدن سے روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ پتلی کمر اور بھرے ہوئے کولھے والے جسم کے نشیب و فراز پہاڑی گھاٹیوں، چوٹیوں، پگڈنڈیوں اور آبشاروں میں تبدیل ہونے لگے۔ فضا میں پھل جھڑیاں چھوٹنے لگیں اور پھولوں کی پنکھڑیوں پر شبنم کے قطرے چمکنے لگے...... عورت اپنے مدوّر ابھاروں کے جلوے دکھاتی اور انگڑائیاں لیتی ہوئی بھری پُری وسیع و عریض کائنات کا حصہ بنتی جا رہی تھی۔ مرد کی بے قراری اور بیتابی سے بے نیاز کائنات اپنی بانہوں کو وا کیے بڑے ناز و ادا کے ساتھ اس کے سامنے بچھتی

جارہی تھی۔ اپنی مخمور آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے جن میں دعوتِ عشق تھی اور تشنگی کو چھپانے کی کوشش بھی۔ دلفریب زیرِ لب مسکراہٹ مرد کے وجود کو پگھلانے لگی۔ ایسی دلکش کائنات کے مقابل مرد سمٹ کر محض ایک لرزتا ہوا سیمابی نقطہ بھر رہ گیا تھا......... اس میں گم ہو کر نقطہ، کائنات کی ازلی خاموشی اور بے کراں سیرابی کا حصہ بننے کے لیے مضطرب تھا۔

موقع ملتے ہی سالم نے راہِ فرار اختیار کر لی۔

دلربا.......... دلربا...... میں آرہا ہوں۔

چوکنا نظروں اور محتاط قدموں سے رات کی ملگجی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ملاّ محمد سالم لگاتار چلتے جارہے تھے۔ پاؤں میں آبلے پڑ گئے لیکن انھوں نے رکنے سے گریز کیا۔ لمبے چوڑے سالم کو اس بات کا خوف تھا کہ ایک تنظیم سے بچتے بچاتے ہوئے کہیں دوسری تنظیم کے ہتّے نہ چڑھ جائیں۔

راستے اور منزل کا تعیّن آسان نہیں تھا۔ دھوئیں اور کہرے کی کثافت نے چاندنی رات کو نیم روشن بنا دیا تھا۔ سب کچھ دھند میں گھر گیا تھا۔ وہ اس کوشش میں تھے کہ گھر پہنچیں یا نہ پہنچیں لیکن ان دونوں تنظیموں اور آسمان کی آتشیں بارش سے دور پہنچ جائیں۔

لگ بھگ ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے محمد سالم دم لینے کے لیے رکے تو انھیں محسوس ہوا کہ ان کا سفر صحیح سمت میں ہے اور وہ گھر پہنچ جائیں گے۔ کندھے پر ہتھیار گراں گزر رہا تھا لیکن موجودہ صورتحال میں ہتھیار اٹھائے رکھنا بنیادی ضرورتوں میں شامل ہو چکا تھا۔

رات کے آخری پہر کے شروع ہونے سے پہلے آسمان قدرے صاف ہوا۔ دور سے ملگجے اندھیرے میں انھیں اپنے مشترکہ کنبے کا خشک میوہ جات کا باغ اور گھر کا بالاخانہ دکھائی دیا۔

بہت دھیرے سے دستک دینے کے بعد اسے محض اتفاق یا خوبیٔ قسمت کہیے کہ ان کی شریک حیات دلربا خانم نے ہی دروازہ کھولا۔ معلوم ہوتا تھا بہت دیر سے دروازے سے لگی بیٹھی اس دستک کی منتظر تھی۔ بے چینی میں کروٹیں بدلتے ہوئے رات گزار رہی تھی۔ بہت دور سے سناٹے میں اپنے شوہر کے قدموں کی چاپ سن رہی تھی۔

گھر کے برآمدے میں لٹکے ہوئے لیمپ کی ٹمٹماتی روشنی نے ان کی آنکھوں کی سرخی اور خون کے اشتعال کو مہمیز کیا۔

کمرے میں پہنچتے ہی انھوں نے ہتھیار کونے میں رکھ دیا۔

دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں غور سے دیکھا اور ایک دوسرے کے اندر اترتے چلے گئے۔ جسم میں خون اس طرح اُچھلا کہ آپے سے باہر ہو گئے....... ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔ دوسرے لمحے باہم چمٹے ہوئے بے خبری اور مدہوشی کے عالم میں گھسٹتے ہوئے دھڑام سے پلنگ پر آرہے۔

اُنھیں دروازہ بند کرنے کا خیال آیا اور نہ یہ خوف لاحق ہوا کہ مشترکہ کنبے کے کسی فرد کی نیند ٹوٹ سکتی ہے۔

دو بھوکے حیوان ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑ رہے تھے اور ایک دوسرے کو جھنجھوڑ رہے تھے۔

مچلاتے ہوئے ہم آغوش ہیولے زور آوری میں منہمک تھے۔ لالٹین کی روشنی میں ان کی پرچھائیں سے سامنے کی دیوار پر عجیب وغریب نقوش بن اور بگڑ رہے تھے۔

سوکھی دھرتی میں دریا کا پانی غڑپ غڑپ جذب ہو رہا تھا۔ کہیں گھاٹی کے مرغزار میں کلیاں چٹک رہی تھیں .... تیز لہروں میں ڈوبتے ابھرتے، ہچکولے کھاتے اور سسکاریاں لیتے ہوئے حلق سے عجیب وغریب آوازیں نکل رہی تھیں۔

عورت آنکھیں بند کیے دیوانہ وار مرد کے سینے کو چوم رہی تھی اور پنجوں سے اس کے سر کے بالوں کو جکڑے ہوئی تھی۔ گردن اُٹھا اُٹھا کر کبھی اس کے سر کے بڑے بڑے بالوں کی لٹ کو منہ میں لے کر چبانے لگتی اور کبھی مرد کی گردن میں بانہیں حمائل کرتے ہوئے حلقہ باندھ لیتی۔

حتیٰ کہ ہاتھ اور ٹانگیں اجگروں میں تبدیل ہوگئیں اور ایک دوسرے کو جکڑ کر شکنجے کی طرح کسنے لگیں۔

جسم پر جگہ جگہ نیلے نشانات....... سارے کپڑے فرش پر ادھر ادھر بکھرے ہوئے...... مرد اور عورت دونوں ڈھیر ہو چکے تھے اور چھت کے شہتیر کو دیکھتے ہوئے گہری گہری سانسیں لے رہے تھے۔ متلاطم دریا پرسکون ہو چکا تھا..... کہنا مشکل تھا کہ اس جنگ مین کس کو زیادہ کامرانی حاصل ہوئی۔

عورت کا رُواں رُواں شکرانہ ادا کر رہا تھا کہ بھاری بمباری، گولیوں کی بوچھار کے باوجود اس کے مرد کی قوتِ مردی قائم رہی۔

(٦)

ملاّ محمد سالم کے سلامت لوٹ آنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے قصبے میں پھیل گئی۔

لوگ محوِ حیرت تھے۔ ان کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

جکڑ بندیوں سے کس طور پر رہائی حاصل کی ہوگی۔

ایک کے چنگل سے نکل کر دوسرے پھندے میں پھنسنے سے کیسے محفوظ رہے۔

لوگ جوق در جوق ان کے دروازے پر اکٹھا ہو گئے

ان کے والد کے ادھورے جواب کا باقی حصہ بھی سننا تھا۔

ان کے والد نے کہا تھا کہ ان کا بیٹا سالم ہی ان کے مسائل کا حل بتانے کا اہل ہے۔

آسمان سے لپکتی ہوئی آتشیں بارش کا سلسلہ کیسے رکے گا۔ ان کے پیڑ کس طرح سرسبز وشاداب ہوں گے۔ اور اگلی بارش کے ہونے کی سبیل کیا ہوگی؟

ملاّ محمد سالم نے اتنے دنوں میں بتدریج رونما ہونے والی تبدیلیوں کا قصہ سنا۔ حالات کی جانکاری حاصل کی۔ پیٹر کی پتیوں کے زرد اور سرخ ہونے، میوہ جات کے ٹھٹھرنے اور جھلسنے، پیڑ کی جڑوں میں تیزاب اور پھر خون کے ڈالے جانے کے حیرت انگیز اور روح فرسا واقعات سنے۔ اپنے والد محترم کے اس کھوج کا مژدہ بھی سنا کہ جڑوں کی بہت گہرائی میں نمو کی علامت اب بھی باقی ہے۔

سب کی باتیں سننے کے بعد استخارے کے لیے ملاّ محمد سالم کو مراقبے اور استغراق کی حاجت محسوس ہوئی۔ آنکھوں سے نور کی بارش ہونے لگی۔ تقدس کے عمیق جذبے نے چہرے کو کچھ ایسا سرشار کیا کہ بہتوں نے بڑھ کر وفورِ عقیدت سے مغلوب ہو کر مودبانہ دست بوسی کی۔

ملاّ محمد سالم جمِ غفیر کی طرف دیکھتے ہوئے اشارے، اور کنایے میں کچھ کہتے ہوئے حجرے کی طرف بڑھ گئے۔ غیر مرئی فرشتے ان کی راہوں کی دھول اور گرد صاف کر رہے تھے اور کورنش بجالا رہے تھے۔

جانے کس جذبے کے تحت ان کے ذہن کے افق پر کہرے چھا گئے۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔ ٹکرٹکر وہ جمِ غفیر کے چہروں اور آسمان کو دیکھتے رہے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے جسم میں کپکپی طاری ہو رہی ہے۔ حجرے میں داخل ہوتے وقت انھوں نے ڈگمگاتے ہوئے پاؤں پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔

ان کے لوٹنے میں دیر ہوئی۔

فتح و نصرت کی خفیف مسکراہٹ ان کے مقدس ہونٹوں پر رینگ رہی تھی۔ دانش و تدبّر کی چمک ہجوم کی آنکھیں خیرہ کر رہی تھی۔

لوگوں کو اطمینان ہوا کہ استخارہ میں اشارۂ غیبی ان کی خیر و برکت کے حق میں ہے۔

''حضرات!''

انھوں نے گلا صاف کیا:

''انشا اللہ ہمارے پیٹر سرسبز و شاداب ہو جائیں گے!''

''لیکن ....''

وہ رُکے۔

''لیکن اللہ کی رحمت کی امید روشن رکھتے ہوئے ہمیں خصوصی حکمتِ عملی اختیار کرنی ہوگی ..... ایک طرف یہود و نصاریٰ کی سیاہ آندھیاں ہیں جن میں زعفرانی ہوا کے جھونکے شامل ہونے کو بیتاب ہیں .... نجات کے لیے ہمیں تدبّر سے کام لینا ہوگا..... اپنے شعار بدلنے ہوں گے..... گھڑکیوں اور دروازوں کو.....''

وہ پھر رُکے۔ سوچوں میں گم ہوئے۔ ہجوم کے چہروں پر طائرانہ نگاہ ڈالی اور پھر گویا ہوئے:

''یاد کرو وہ لمحے....... جب باہر چوراہے پر پھانسی دی جا رہی تھی اور ہم کپکپاتے ہوئے کھڑکی کی

درز سے اس دلدوز سانحے کو تماشے کی طرح دیکھ رہے تھے...... میری یہ بات شاید آپ لوگوں کو اُٹ پٹی لگے.... لیکن سچ نہ کہہ سکا تو خدا کے نزدیک گنہگار ٹھہروں گا...... اپنے تجربے، مشاہدے، سیاحی اور طویل جدّ وجہد کا نچوڑ......''

انھوں نے توقف کیا۔ پھر کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولے:

''میری زندگی کا ماحصل یہ ہے کہ مشرق کی سرخ اور سبز آندھی کی آمیزش کے بغیر ہم مغرب کی کالی آندھیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہمارے مسائل کا حل اسی نکتے میں مضمر ہے..... اور ہمیں......!''

کچھ دیر کے لیے ان کی آنکھیں گہرے سوچ میں مستغرق ہو گئیں:

''معاف کیجیے شاید اس بات کو ماننے میں آپ کو تامل ہو.... ہمیں اپنی عورتوں کو صرف خواب گاہ میں نہیں، گھر کے باہر بھی برابری کا درجہ دیتے ہوئے ان کے شانہ بہ شانہ آگے بڑھنا ہوگا......!''

یہ کہتے ہوئے رات کے آخری پہر کا پگھلتا ہوا منظر ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا.... اجگر کا روپ اختیار کرتے ہوئے بازو اور ٹانگیں..... تکمیل کے لیے مکمل سپردگی... سارا اندرون ایک دوسرے کے قدموں میں نچھاور.... باہم فنا ہوتی ہوئی محویّت..... فنافی المعشوق......

زیرِ لب رینگتی ہوئی خفیف مسکراہٹ کے ساتھ لذّت کی ڈلیاں منھ میں گھل گئیں۔ رومال سے منھ پونچھتے ہوئے انھوں نے مسکراہٹ کو چھپانے کی کوشش کی۔

پھر جانے کیوں انجانے اضطراب اور بے کلی کی ایک بلبلاتی لہر نے آنکھوں کو نم کر دیا۔

فوراً انھوں نے رومال سے آنکھوں کو ڈھانپ لیا جیسے آنکھوں میں گرد پڑ گئی ہو اور اس کے چلتے پانی نکل آیا ہو۔

کوچے میں تھوڑا آگے قبائلی سماج کے دفتر میں ریڈیو سے خبر نشر ہو رہی تھی:

تمام مہلک بموں سے عاجز آ کر ایک بے حد بے ضرر قسم کے بَم کا نیا فارمولا دریافت کر لیا گیا ہے جسے بہت جلد ٹھوس ایجاد کی شکل دے دی جائے گی۔ نئے فارمولے کے غیر مہلک بموں کے اثرات سے زمین، آسمان، اشیا اور انسان کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ مردوں کی قوتِ مردی بدرجۂ اُتم قائم رہے گی صرف وہ تناسل کی صلاحیت سے محروم ہو جائیں گے۔ عورتوں کی تانیثیت موجود رہے گی بلکہ اس میں بے تحاشا اضافہ ہوگا، صرف کوکھ بانجھ ہو جائے گی۔ اس کے استعمال سے جان و مال دونوں میں سے کسی کا کوئی زیاں نہیں ہوگا۔ اتحادی ملکوں نے اس غیر معمولی کامیابی کے لیے بے پناہ مبارکباد دی ہے۔ تیسری دنیا کے بیش تر ممالک ابھی نئے فارمولے کے اطلاقی پہلوؤں کو لے کر سکتے میں مبتلا ہیں۔

ایک جانباز نے ریڈیو اٹھا کر پھینک دیا ہے اور مُلّا محمد سالم کے سامنے کھڑا ہو کر چلّایا ہے:

''مُلاّ اپنے والد کا ادھورا جواب پورا کرو!''

مُلاّ نے نو وارد کی طرف غور سے دیکھا اور مسکراتے ہوئے اسے معنی خیز نگاہوں سے خوش آمدید کہا:

''ہمیں نئے فارمولے پر عمل کرنا ہوگا..... سرخ اور سبز آندھیوں کے امتزاج سے وہ طوفان پیدا کرنا ہوگا جو رحمتوں کی مطلوبہ بارش شروع کردے...... ہمیں طاقت مہیا کردے...... آتشیں بارش کے زہریلے اثرات زائل ہوجائیں..... ہمارے پیڑ سرسبز ہوکر ہمارے میووں کا اصلی ذائقہ بحال کریں۔''

مُلاّ محمد سالم کی زبان سے پھول جھڑ رہے تھے۔

لوگ ہمہ تن گوش تھے۔

ان کے چہروں پر ایک رنگ آرہا تھا ایک جا رہا تھا۔

(۷)

مُلاّ محمد سالم گھر کے اندر داخل ہوئے۔

انھوں نے تمام دریچے اور دروازے کھول دیے۔

دلربا خانم کو گہری نیند سے اُٹھایا۔

دلربا نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ بھرپور طویل انگڑائی لیتے ہوئے وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ بکھرے ہوئے بالوں کو درست کرتے ہوئے سر کو آنچل سے ڈھکا۔ پھر شوہر کے چہرے پر نظریں گڑاتے ہوئے دھیمے سے بولیں:

''کہیے!''

''بیگم! میں تھوڑی دیر میں واپس آرہا ہوں۔ دس بارہ ہم صفیروں کے لیے بریانی تیار کرکے رکھنا!''

دلربا خانم نیم وا آنکھوں سے اُنھیں، کھلی ہوئی کھڑکیوں اور دروازوں کی جانب دیکھتے ہوئے حیرت واستعجاب میں مبتلا تھیں۔

مُلاّ محمد سالم نے رائفل کو کندھے سے لٹکایا۔ گردن موڑ کر دلربا خانم کی طرف دیکھا اور گھر کی دہلیز سے باہر نکل گئے۔

طویل، ناہموار اور پیچیدہ راستے کی اُڑتی ہوئی دھول عقیدت واحترام کے ساتھ ان کی قدم بوسی کر رہی تھی۔

........☆........

خدا کا بھیجا ہوا پرندہ

● صدیق عالم

یہ پرانا اسٹیشن جس کی محرابوں سے آج بھی چمگادڑیں لٹکتی ہیں، میں نے ہمیشہ اس کے باہر سن رسیدہ بدھ رام کو اپنا انتظار کرتے پایا ہے۔ مگر اس سے پہلے میں آپ کو اس شہر میں آنے کا مقصد بتا دوں۔

پچیس برس پہلے میرے دادا جان اس اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر فسادیوں کے ذریعے مار ڈالے گئے۔ یہ میری پیدائش سے قبل کا واقعہ تھا، مگر ہوش سنبھالتے ہی ایک دن میرے ہاتھ میں دادا جان کی جیبی گھڑی آ گئی اور ساتھ ہی ان کی ذاتی نوٹ بک بھی جو الماری میں مذہبی کتابوں کی بھیڑ میں دفن تھی۔ یہ نوٹ بک انھیں خاصی عزیز رہی ہوگی کیونکہ انھوں نے گھڑیال کے جس چمڑے سے اس کی جلد مڑھوائی تھی وہ چمڑا اپنے سفر کے دوران انھیں کن حالات میں حاصل ہوا تھا اس کا ذکر اس نوٹ بک میں خاص طور پر درج تھا۔ دوسری طرف یہ گھڑی ان کی جیب سے برآمد ہوئی تھی جب ان کا جلا ہوا جسم پلیٹ فارم سے اٹھایا گیا۔ دراصل ان کے جھلسے ہوئے جسم کے سبب ان کی پہچان ممکن نہ ہوتی اگر ان کی شناخت اسی گھڑی کے ذریعے نہ کی گئی ہوتی جو ان دنوں ٹرین کے کنڈکٹر اپنے بٹن کے سوراخ سے لٹکائے رکھتے، یہ اور بات تھی کہ میرے دادا ٹرین میں ڈرائیور تھے۔ اس جیبی گھڑی کی زنجیر سلامت تھی جس کے ایک سرے سے اس کی منحنی چابی لگی ہوئی تھی۔ اس کا شیشہ پگھل کر ڈائل کے ساتھ چپک گیا تھا جس میں اب رومن کا صرف سات کا ہندسہ بچا تھا جس سے جانے کیوں میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ واقعہ دن یا رات کے سات بجے پیش آیا ہوگا، جب کہ یہ صحیح مفروضہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ گھڑی کا ڈھکن کھولنے پر جواب صرف ایک کیل کے ذریعے گھڑی کے کیس کے ساتھ منسلک تھا مجھے ادھڑے ہوئے ڈائل کے پیچھے پہیوں اور اسپرنگ کی ایک دنیا نظر آئی۔ اندر کی زیادہ تر پلیٹیں سلامت تھیں جن میں سب سے بڑی پلیٹ پر ''سوئزرلینڈ میں بنا'' لکھا ہوا تھا۔ اس وقت جب کہ میں کافی کمسن تھا اور ایک دوسرے شہر میں اپنے والدین کے ساتھ رہ رہا تھا جو میرا پیدائشی شہر بھی تھا، اسے اپنی مٹھی میں دبا کر مجھے ایسا لگا تھا جیسے یہ اب بھی گرم ہو گرچہ مجھے معلوم تھا یہ احساس سراسر نفسیاتی تھا۔ آج میں آنکھیں کھول کر دیکھتا ہوں تو میرے دادا جان، جن کی کوئی تصویر ہمارے گھر میں موجود

نہیں، ان کے خط وخال میرے سامنے بالکل واضح اور صاف ہوتے جاتے ہیں جیسے یہ حال کا واقعہ ہو اور میں ان کی گود میں بیٹھا ہوا یہ شہر دیکھ رہا ہوں۔

دادا جان جنھیں کتوں اور کمسن لڑکیوں سے پیار تھا، نماز کے لئے ان کا احترام لوگوں کی سمجھ سے باہر تھا گرچہ یہ انھیں آئے دن شراب نوشی کے اڈے کی طرف جانے سے نہیں روکتی تھی۔ انھوں نے اپنی پہلی شادی میں اس بات کو یقینی بنانا چاہا کہ ان کی شریک حیات ان کے لئے کنواری ثابت ہو۔ اس رات انھوں نے اپنی دقیانوسی نوٹ بک میں لکھا، اگر میرے ساتھ دھوکہ نہیں کیا گیا ہے تو میرے ہونے والے بچے کا باپ اس کرۂ ارض پر کہیں بھٹک رہا ہوگا۔

سڑک پر کیروسین لیمپ کے رنگین شیشوں سے چھن چھن کر آتی روشنی میں چلتے ہوئے وہ یہی سوچ رہے تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اب رات اور زیادہ گہری ہونے والی نہیں اور آخری دکانیں بس اپنے چھاپے گرانے ہی والی ہیں۔ تو انھوں نے ایک مٹھائی کی دکان کے سامنے رک کر اپنی کمسن بیوی کے لئے پیڑے خریدے، کیونکہ وہ حمل سے تھی اور ہمیشہ بھوکی نظر آتی تھی۔

''اسے دو آدمی کا کھانا چاہئے۔'' اس نے بنگالی دکاندار کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ دکاندار ادھیڑ عمر کا تھا اور اپنی کافی بڑی توند پر ایک چرکٹ بنیان چڑھائے مٹھائی کے شوکیس کے پیچھے کھڑا کسی گاہک کی امید میں ایک بوڑھے انسان کے لئے بالکل بھی تیار نہ تھا۔ یوں بھی یہ اس کی رکھیل کا وقت تھا اور ڈھلان میں اتر کر اسے کھیت کے کنارے دیسی شراب کے ٹھیکے پر ایک پاؤ لینا لازمی تھا۔

''آپ ان لوگوں کا پیٹ کبھی نہیں بھر سکتے۔'' دکاندار ٹنڈر کے کھردرے کاغذ کے ٹھونگے کے اندر پیڑے رکھتے ہوئے دادا کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ چھپر کے کنڈے سے لٹکتی لالٹین کی مدھم روشنی میں اس کا سیاہ جسم کافی کیم شیم نظر آ رہا تھا۔ ''اگر انھیں بچہ دینا ہو تو آپ کبھی روک نہیں پائینگے۔''

''عورتوں کے سلسلے میں تمہارا رویہ صحتمند نہیں۔'' دادا نے شوکیس کے شیشے پر پیسہ گنتے ہوئے کہا۔ شوکیس کے اندر جلتی موم بتی کی حرارت کے سبب سیشہ پر سبز پتنگے پڑے پڑے تپ رہے تھے۔ انھیں حلوائی کی بات سے تکلیف پہنچی تھی۔ ''تم شادی شدہ نہیں ہو سکتے۔'' وہ بڑبڑائے۔

''جب کہ میرے چھ بچے ہیں۔''

جس سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا، دادا ریلوے کی پٹریوں کو احتیاط سے پھلانگتے ہوئے سوچ رہے تھے کیونکہ روشنیاں اونچے کھمبوں پر نصب ہونے کے سبب پٹریاں دھندلی لکیروں میں بدل گئی تھیں۔ ریلوے کے گدام کی چہار دیواری کے ساتھ بگلوں کی بیٹ سے سفید فلک بوس درختوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا جو چاندنی راتوں میں کافی پراسرار اور زیادہ تاریک نظر آتے۔ راستے میں کہیں کہیں اینٹ کی کوئی دیوار نمودار ہو جاتی جس کے وہاں ہونے کے جواز کا پتہ لگانا مشکل تھا سوائے اس کے کہ اس جگہ سے نجاست کی وہ خاص بو آیا کرتی جس کا تعلق

صرف ریلوے یارڈ سے ہوا کرتا ہے۔ دادا کو اپنا راستہ بخوبی معلوم تھا۔ بہت جلد وہ ریلوے کے کوارٹروں سے باہر نکل آئے جہاں کھیتوں کے بیچ رہائشی گھروں کی زیادہ تر روشنیاں بجھ چکی تھیں اور کتے تک خاموش تھے۔ دن کے وقت ایسا لگتا جیسے اس جگہ سے آدھے کوس دور دادا کے گاؤں کے گھروں کی دیواروں تک یہ شہر اپنی غلاظت کے ساتھ کبھی بھی پہنچ نہ پائے گا۔ مگر قریب پہنچنے پر خود ان کا گاؤں بھی غلاظت کا ایک ڈھیر ہی ثابت ہوتا۔ مگر یہ غلاظت کا ڈھیر نہ تھا جب دادا نے اپنا گھر بنوایا تھا۔ دادا اس شہر کے نہیں تھے اور جب ریلوے کی نوکری کے سلسلے میں ان کا تبادلہ اس اسٹیشن پر ہوا تو سستی زمین اور سکون کی تلاش میں وہ اتنی دور آگئے تھے جہاں کچھ سال پہلے تک گنّے کے کھیتوں اور ناریل کے درختوں کے جھنڈ کے بیچ کنول کے پتوں سے ڈھکے ہوئے کئی تالاب تھے جن کے پانی پر بچھی دبیز کائی پر بطخ کے غول لکیریں کھینچتے نظر آتے اور طرح طرح کی لانبی چونچ والی خاکستری مائل چڑیاں مچھلیوں کی تلاش میں پانی کے اوپر اوپر منڈلایا کرتیں اور جب جوہڑ کے کنارے وہ پانی میں اترتیں تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ کس طرح اتنی لمبی پتلی ٹانگوں کو جن کا گلابی رنگ حیران کن ہوتا، اور اڑتے وقت جنھیں وہ تیر کی طرح سیدھی رکھتیں، پانی میں اترتے ہی ان میں سے ایک ان کے پروں کے اندر غائب ہو جاتی۔ یہی وہ چیزیں تھیں جنھوں نے ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ اس وقت انھیں اس بات کی بالکل بھی خبر نہ تھی کہ اپنے شور اور غلاظت کے ساتھ اس جگہ تک پہنچنے میں اس شہر کو صرف بیس برس لگیں گے اور زیادہ تر تالاب یا تو ڈھک دیئے جائینگے یا کوڑے کے ڈھیر میں بدل جائینگے۔ ”مجھے اور بھی زمینیں خرید کر رکھنی چاہئے تھیں۔“ ایک دن انھوں نے اپنے دوست بدھ رام سے کہا جو سگنل مین کی ڈیوٹی سے ریٹائر تو ہو چکے تھے مگر اب بھی ہرے اور سرخ سگنل کے خواب دیکھنے سے باز نہ آتے۔ ”میں کبھی اچھا بزنس مین نہیں رہا۔ یہ تم نہیں سمجھ سکتے، ایک ایسا آدمی جو سگنل کی روشنیوں سے باہر کچھ سوچنے کی طاقت نہیں رکھتا۔“

شاید وہ ٹھیک کہہ رہے تھے کیونکہ بدھ رام کی ساری زندگی بیکار گئی تھی۔ وہ خاندانی ناستک تھے جنھوں نے حال ہی میں مسیحیت قبول کی تھی اور بڑے گرجا کے پادری کے حکم سے ان کے نام کے آخر میں ہربرٹ کا لقب چپکا دیا گیا تھا۔ مگر ان کے اس لقب سے کم لوگوں کو واقفیت تھی اور جنھیں واقفیت تھی انھوں نے اس پر یقین نہیں کیا تھا۔ خود انھیں لوگوں نے کبھی چرچ جاتے نہیں دیکھا تھا۔ آفس کے رجسٹروں میں وہ اب بھی بدھ رام ہی تھے۔ بدھ رام نے زندگی بھر اپنے رشتے داروں سے دور ریلوے کوارٹر میں تجرد زندگی گزاری اور ریٹائر ہونے کے بعد اب ایک کرائے کے گھر میں رہتے تھے جو دراصل ایک ریلوے کوارٹر ہی تھا مگر جس کے نام سے وہ الاٹ تھا اس شخص نے اسے کرائے پر دے رکھا تھا۔ انھیں اس کی پرواہ نہیں تھی کہ اس کے رشتے داروں نے کبھی ان کی کوئی خبر نہیں لی سوائے ان دنوں کے جب انھیں پیسے کی ضرورت ہو۔ شاید اس میں قصور ان ہی کا تھا۔ ان کے پاس ہر ضرورت مند کے لئے کچھ نہ کچھ رقم تیار رہتی تھی۔

”میں زندگی بھر ایک اچھا انسان رہا۔“ بدھ رام نے اپنی کھینی کی ڈبیا نکالتے ہوئے کہا۔ ”اور میں نے

دیکھا ہے، اس دنیا میں پانے کے لائق کچھ بھی نہیں ہے۔ اور وہ جنھوں نے بڑی بڑی حویلیاں کھڑی کیں اور کھیت اور باغات کے ڈھیر لگا دئے، مرنے کے بعد انھیں دو گز زمین پر قناعت کرنی پڑی۔ انھیں تین پشت سے زیادہ یاد بھی نہیں رکھا گیا۔''

''یہ ایک ہارے ہوئے انسان کی سوچ ہے۔'' دادا سامنے ڈھلان کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں بچے ڈوبتے سورج کے نیچے المونیم کے پہیوں کے ساتھ بھاگتے ہوئے دس کا ہندسہ بنا رہے تھے۔ ''اگر تمہارے خیال سے میں ایک ایسا گھر چھوڑ کر جاؤنگا جس کی کسی کو ضرورت نہ ہوگی تو یہ تشفی میرے لئے کم نہیں کہ میرے لگائے ہوئے آم اور امرود کے پیڑ برسوں تک پھل دیتے رہینگے۔ اور اگر وہ پھل دینا بند بھی کردیں تو بھی کٹھ بڑھئی اور گلہریاں اس میں پناہ تو لے ہی سکتی ہیں۔''

شاید دادا کو آنے والے دنوں کی آہٹ مل چکی تھی۔ انگریز ملک چھوڑ کر جا چکے تھے۔ مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی مشرقی پاکستان کا رخ کر چکی تھی۔ اب اس بستی میں چند ہی مسلمان رہ گئے تھے جو اب تک ان کی دو منزلہ عمارت سے آس لگائے بیٹھے تھے اور جب بھی شہر کے اندر فساد کا بازار گرم ہوتا پناہ لینے کے لئے اس کے اندر آ جاتے۔ انھیں اس بات کا دکھ تھا کہ صرف اس وجہ سے ان کے مکان کو پولس والے شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے اور آئے دن انھیں پاکستانی جاسوس ہونے کے الزام کا سامنا کرنے کے لئے تھانہ جانا پڑتا۔ انھیں پتہ تھا دیر سویر اس گھر کو بک جانا ہے۔ خود ان کے مکان کے چاروں طرف نچلی ذات کے ہندوؤں نے گھر بنا لیا تھا اور ایک ایسا شخص بھی تھا، جو کبھی اس کا نوکر رہ چکا تھا مگر اب سرکاری نوکری میں نچلی ذات والوں کو رزرویشن مل جانے کے سبب اس کے چاروں لڑکوں کو سرکاری نوکریاں مل گئی تھیں اور اب اس کے پاس اتنا پیسہ آ چکا تھا کہ وہ دادا کے گھر کو خریدنے کے بارے میں سوچ سکے۔

''مجھے تمہارا یہ نمک خوار پسند نہیں۔'' بدھ رام نے ایک دن اپنی اکتاہٹ کا اظہار کیا۔ ''وہ کیسے کھلے عام تمہارے گھر کے بارے میں بات کر سکتا ہے۔''

''کیونکہ اسے پتہ ہے میرے مرجانے کے بعد یہ گھر اس کا ہونے والا ہے۔ یہ میرے نالائق لڑکے، تم ان سے کیا امید رکھتے ہو۔ انھیں سوائے پہلوانی کے آتا بھی کیا ہے۔ اور اس کے لئے تم ان نچلی ذات کے لوگوں کو ذمہ دار ٹھہرا نہیں سکتے۔ کبھی وہ دوسروں کے ذریعے بے زمین کر دئے گئے تھے۔ آج انھوں نے اپنی زمینیں واپس لینا شروع کر دی ہیں۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔''

بدھ رام نے شادی نہیں کی تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ خوش تھے۔ دادا کو اس کا پتہ تھا کہ ان کے رشتے داروں کی ایک فوج تھی جس نے اس کی زندگی تنگ کر رکھی تھی اور آئے دن اپنی عجیب و غریب مانگوں کے ساتھ نمودار ہوتے رہتے تھے۔ مگر اس کے لئے وہ بدھ رام کو ہی ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔ وہ جب بھی شراب کے نشے میں ہوتے ان کا دل بدھ رام کے لئے خیر سگالی کے جذبے سے بھر آتا۔ بدھ رام جو کبھی کسی عورت کے ساتھ ہم

بستر نہ ہوا، انھیں ان سے زیادہ قابلِ رحم انسان اور کوئی دکھائی نہ دیتا۔

''ویشالی میں تمہارا اتنا بڑا کنبہ ہے...'' وہ اکثر بدھ رام کو تلقین کیا کرتے۔ ''تم اپنے رشتے داروں میں لوٹ کیوں نہیں جاتے۔ بڑھاپے میں ایک انسان کو سب سے زیادہ اپنے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''ایک دن تمہیں اپنے لوگوں کا مطلب سمجھ میں آئے گا جب میں تمہیں اپنے لوگوں کے بیچ لے جاؤنگا۔'' بدھ رام نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''اس دن تم صحیح رائے دینے کے قابل ہو جاؤ گے۔''

بڑھاپے میں ایک اور شادی کرنے کی پاداش میں (اور یہ ان کی تیسری شادی تھی) دادا کو اپنے سفید بال اور داڑھی کو مہندی سے سرخ کرنی پڑی تھی، گرچہ میری کمسن دادی کو اس سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ وہ تو ایک بڑا سا پیٹ اٹھائے آج بھی ایک الھڑ لڑکی نظر آتی تھی۔

''وہ کیسے اتنا بڑا پیٹ لے کر دیوار پھاند جایا کرتی ہے۔'' بدھ رام نے ایک دن اپنی حیرت کا اظہار کیا۔ ''مجھے پتہ نہ تھا کہ تم نے ایک گلہری سے شادی کی ہے۔'' میرے دادا کو بدھ رام کی بات پسند آگئی۔ ''وہ سچ مچ ایک گلہری ہے۔'' انھوں نے بدھ رام کی دی ہوئی کھینی پھانکتے ہوئے آنکھ ماری۔ ''ایک جنگلی گلہری جسے اول تو پکڑنا آسان نہیں اور اگر پکڑ میں آجائے تو زیادہ دیر تک تھامے رکھنا مشکل ہے۔''

''بوڑھے آدمی، تمہیں اپنے آس پاس کے نوجوانوں پر نظر رکھنی چاہئے۔ یہ دنیا ایک بہت ہی بُری جگہ ہے۔ تم یقیناً نہیں چاہو گے کہ اس بڑھاپے میں کوئی تم پر ہنسے۔''

''لوگوں کو ہنسنے سے کون روک سکتا ہے۔'' میرے دادا جان نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''ویسے اسے ایک بار ماں بن لینے دو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور تم چاروں کھونٹ گھوم آؤ، جہاں تک عورت کا تعلق ہے، بستر میں میرے جیسا دوسرا آدمی تمہیں دکھائی نہ دیگا۔''

بدھ رام نے ترحم کے ساتھ میرے دادا کی طرف دیکھا۔ انھیں ایسا لگا جیسے وہ اب زیادہ دنوں تک زندہ رہنے والے نہیں۔ اس دن ایک سرخ سگنل کی طرف تاکتے ہوئے انھوں نے سوچا، ہم کسی چیز کو پانے کی دھن میں اسے اپنے آپ سے کتنی دور کر دیتے ہیں۔

بدھ رام بستر پر لیٹے لیٹے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب روشنی تھی۔ آپ میری طرف اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟ میں نے پوچھا۔ مجھے ان کی آنکھوں سے بے چینی ہو رہی تھی جیسے وہ مجھے میری جڑوں تک کھنگال لینا چاہتی ہوں۔ وہ تھوڑی دیر چپ رہے، پھر انھوں نے اپنی خاموشی توڑی۔ کبھی کبھی تمہاری شکل تمہارے دادا سے ملنے لگتی ہے۔ لیکن یہ مشابہت زیادہ دیر قائم نہیں رہتی۔ میں نے انھیں کبھی نہیں دیکھا، میں نے کہا۔ شاید میرا چہرا ان سے ملتا ہو۔ نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ کوئی بھی چہرا تمہارے دادا کی برابری نہیں کر سکتا۔ وہ مجھ سے عمر میں کچھ برس چھوٹا تھا مگر اس نے اسے کبھی قبول نہیں کیا۔ اس کے اندر دو بیل کی طاقت تھی۔ پولس بھی اسے حوالات میں ڈالنے سے ڈرتی تھی۔

بدھ رام اپنی زندگی کے آخری دن گن رہے تھے اور ان دنوں ہمارے دادا کے مکان میں کرایہ داروں کے لئے بنائی گئی کوٹھریوں میں سے ایک میں بغیر کرایہ کے رہ رہے تھے۔ ان کے کمرے کا آدھا حصہ دائمی طور پر اندھیرے میں ڈوبا رہتا جس کی انھیں پرواہ نہ تھی۔ ان کی ساری زندگی کا اثاثہ ایک ٹرنک کے اندر بند تھا جس پر بیٹھے بیٹھے وہ کھڑکی سے باہر آسمان پر نظریں ٹکائے رہنے کے عادی تھے۔ ان وقتوں کے علاوہ جب میں قانونی دستاویزات پر ان کی رائے لینے آتا جن کے سہارے میں اپنے دادا کی جائداد کو بچانے کی جدوجہد میں مصروف تھا، باقی وقت وہ میرے ساتھ اپنی یادداشت کے گلیاروں میں گھومنے کے عادی تھے۔ اور یہ مجھے پسند بھی تھا کیونکہ مجھ سے زیادہ میرے دادا کے واقعات کا علم بدھ رام کو تھا۔ بدھ رام جنھیں کہانی بُننے کا فن بخوبی آتا ہے۔

وہ ایک بڑا ہی خاموش دن تھا، بدھ رام نے کہنا شروع کیا: میرے کوارٹر کی کھڑکی کے کواڑ برسات کا پانی پی پی کر پھول گئے تھے اور ٹھیک سے بند نہیں ہو رہے تھے جب اس پر ایک دستک ہوئی۔ یہ دستک میرے لئے حیران کن تھی۔ اب میری ضرورت کسے ہو سکتی ہے؟ میں نے نہ بند ہونے والا پٹ کھولا تو ایک ادھیڑ عمر کی عورت ایک سبز طوطا ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔

اس طوطے پر اللہ کا نام لکھا ہوا ہے، اس نے کہا۔

آہ، میں نے سوچا، اب یہاں برا وقت آنے والا ہے۔

میں نے اس کے لئے دروازہ کھولا جو مجھے نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اور وہ ایک بہت ہی چرب زبان عورت ثابت ہوئی کیونکہ دس منٹ کے اندر اندر اس نے وہ طوطا اور پیچ گونی تار کا پنجڑا جس کے اندر طوطا بند تھا، مجھے بیچ ڈالا۔

اس کا احترام کرنا، یہ خدا کا بھیجا ہوا خاص پرندا ہے، اس نے روپئے ساڑی کے پلّو میں باندھتے ہوئے کہا۔

دراصل اس ادھیڑ عمر کی عورت نے مجھے ایک ہی نظر میں اپنا غلام بنا لیا تھا۔ مجھے پہلی بار حیرت ہوئی کہ اتنی لمبی عمر کسی عورت کے بغیر میں نے کیسے گذار دیا تھا۔ تم کس گاؤں کی ہو؟ میں نے اس سے دریافت کیا۔ میں اسی شہر کی ہوں، عورت نے جواب دیا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی، عورت کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ میں بری طرح اس کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہوں۔ اس نے اپنے جسم کے بھرپور احساس کے ساتھ میری طرف دیکھا اور اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرتے ہوئے مزید کہا: اس طوطے کو پانی سے بچا کر رکھنا ورنہ اللہ کا نام غائب ہو جائے گا۔

شاید اب اسے میرے ساتھ جھوٹ بولنے کی ضرورت نہ تھی۔

اس کے جانے کے بعد مجھے افسوس ہوا کہ میں نے اس کے گھر کا پتہ کیوں نہ دریافت کیا۔ گرچہ پچھلے بیس برس میں یہ شہر کافی بڑا ہو چکا تھا مگر جانے کیوں مجھے اس بات کا یقین تھا کہ میں اس طوطا فروش کو ضرور ڈھونڈ کر نکال لونگا۔ بعد میں جب میں نے تمہارے دادا سے اس واقعے کا ذکر کیا تو اس نے انتہائی شبہے کے ساتھ اس

پورے معاملے کو دیکھا۔ تم نے دیر کر دی، تمہارے دادا نے کہا۔ اب وہ اس لائق نہیں رہ گئی ہے کہ تمہارے لئے بچہ دے سکے۔ کیا وہ کنواری تھی؟ وہ مسلمان تھی، میں نے اس سوال سے بچنے کے لئے یہ بے تکا سا جواب دیا۔ پھر تو معاملہ اور بھی پیچیدہ ہے، تمہارے دادا بڑبڑائے۔ اس میں پیچیدہ کیا ہے؟ میں نے ضد کی۔ آخر ہم عیسائی اور مسلمان ایک ہی پیغمبر کے ماننے والے ہیں۔ نہیں، تم اسے نہیں سمجھ سکتے، اس سے پیچیدگی اور بھی بڑھ جاتی ہے، اور تمہارے دادا خاموش ہو گئے۔ لیکن مجھے علم تھا، وہ اتنی آسانی سے کسی بھی چیز کو بھولنے والا آدمی نہ تھا۔ دوسری صبح جب وہ اپنا شنٹنگ انجن لے کر پٹری سے گزر رہا تھا، اس نے اشارے سے مجھے بتایا کہ مجھے شام خالی رکھنی چاہئے جب ہم سندر پٹی سے گذر کر اسٹیم گیٹ کے پیچھے بڑے کھلیان کی طرف جائینگے جہاں کی دیسی شراب ہمیں خاص طور پر پسند تھی۔ خالی، میں نے سوچا، اب میرے پاس ایسا ہے ہی کیا کہ اپنے آپ کو مصروف رکھوں! مگر میرا یہ سوچنا غلط تھا۔ قدرت نے کچھ اور ہی چیز میرے لئے تجویز کر رکھی تھی۔ اچانک اس عورت کی مجھے شدید یاد آنے لگی اور دوپہر تک میری حالت اتنی غیر ہوگئی کہ میں تمہارے دادا کو بھول کر اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

سند کے طور پر میں نے اپنے ساتھ وہ طوطا رکھ لیا تھا جس پر اللہ کا نام لکھا تھا۔ شہر، کیا تم اسے شہر کہوگے، صرف اس لئے کہ اس کی تارکول کی سڑکوں پر بجلی کے کھمبے آگئے ہیں اور اس کی نئی پرانی عمارتوں میں ہر طرح کے لوگ رہنے لگے ہیں اور تم نے ذرا بھی دیر کی تو وہاں رات اتر جاتی ہے اور عین ممکن ہے کہ تم راستہ بھول جاؤ یا کوئی تمہیں لوٹ لے یا ایک باغی کے نرغے میں آ جاؤ یا کسی فحش فعل میں مصروف جوڑا تمہیں دیکھتے ہی بھاگ نکلے۔ مگر یہ دن اس طوطے کا تھا۔ وہ پنجرے کے بیچ گونی خانوں سے پنجوں کے ناخن باہر نکالے خاموش کھڑا تھا اور بار بار سر نیوڑھا کر دھندلے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا جس میں اب ہفتے میں دو ایک ٹوسیٹر جہاز نمودار ہونے لگے تھے جو سامانوں کے اشتہار پھینک جایا کرتے۔ یہ کاغذی اشتہار پلندوں کی شکل میں جہاز سے باہر آتے مگر دیکھتے دیکھتے شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل جاتے۔

میں بہت تھک چکا تھا۔ میں پناہ لینے کے لئے ایک عمارت کے اندر داخل ہوا۔ عمارت ویران پڑی تھی پھر بھی میں کسی نیک دل انسان کی تلاش میں اس کی سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ عمارت کے تمام دروازے دریچے بند تھے یا شاید میری دستک اس کے مکینوں تک نہیں پہنچ پا رہی تھی یا شاید انھیں میری نیت کا پتہ چل چکا تھا۔ آخر کار میں اس کی چھت پر پہنچ گیا جس کے اوپر آسمان میں پتنگ اڑ رہے تھے اور سورج دور افق میں غلیظ بادلوں کے اندر بجھ چکا تھا۔ میں نے پانی کے کائی خوردہ ٹینک کے سامنے جس سے پانی رستا ہوا کونے میں جم رہا تھا، ایک دیوار کا انتخاب کیا جس کی تعمیر بیچ میں ہی روک دی گئی تھی، اور پنجرا اس پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے پتہ بھی نہ چلا دیوار پر بیٹھے بیٹھے کب میری آنکھ لگ گئی۔

آنکھیں کھلیں تو میں نے اپنے آپ کو ایک عجیب وغریب شہر کے اندر پایا جو میرے لئے اجنبی تھا۔ یہ

کون سا شہر ہے؟ میں یہاں کس طرح سے پہنچا؟ دور تک کنکریٹ کی عمارتیں جنھیں ہم سوچ بھی نہ سکتے تھے جن کے درمیانی راستوں میں بجلی کے اونچے اونچے کھمبے کھڑے تھے جنھیں میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ بہت دیر تک غور سے دیکھتے رہنے کے بعد ایک آدھ پرانی عمارتوں کے مینار اور گنبد ابھرنے لگے جن کے اندر مجھے پرانے شہر کے نشان دکھائی دے رہے تھے مگر کنکریٹ کے ان اونچے ڈبوں کے سامنے وہ ہیچ نظر آرہے تھے۔ وہ کھلا ہوا شہر جانے کہاں چلا گیا تھا۔ ہر طرف تنگ راستوں اور گلیوں کا جال بچھ چکا تھا۔ سورج شاید نکل رہا تھا یا ڈوب رہا تھا اور میں اپنی اونچی مگر تنگ چھت کی منڈیر پر بیٹھا اینٹ اور پلستر کے ان ڈھیروں کی طرف تاک رہا تھا جن پر برسات در برسات کائی جم کر کئی بدنما پیڑ اُگ آئے تھے۔ چیل کوٹھی کی چھت پر پانی کا ٹینک اپنی جگہ کھڑا تھا اور آج بھی اس سے پانی رستا ہوا کونے میں جم رہا تھا۔ اس پانی میں ایک کبوتر مرا پڑا تھا۔ چھت کے فرش سے لے کر اس کی نیم تاریک سیڑھیاں اور ان کے بیچ کے چبوترے تک گندے ہو رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا اس عمارت کے مکین اپنی تمام گندگیاں ان جگہوں پر ڈالنے کے عادی ہو گئے ہوں۔ لیکن میرے یہاں ہونے کا جواز کیا تھا؟ اور یہ خالی پنجرا! میں اسے اٹھائے کیوں کھڑا ہوں؟ اور مجھے اس کا افسوس ہونے لگا کہ میں اکیلا اس مہم کے لئے نکل آیا تھا۔ مجھے تمہارے دادا کو ساتھ لینا چاہئے تھا۔ آخر کار عورتوں کے معاملے میں وہ ایک جہاں دیدہ انسان تھا۔ تو میں نے چھتوں کے ناہموار سلسلے پر دور تک نظر دوڑائی جہاں دلچسپی کے لائق کچھ نہ پا کر میری نظر واپس خالی پنجڑے پر ٹک گئی۔ کیا میری نیند کی حالت میں طوطا اڑ چکا تھا یا کوئی اسے چرا لے گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ کوئی جادوی طوطا ہو جو مجھے اس شہر میں لانے کا سبب بنا ہو، اور اپنا کام کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو چکا ہو۔ تو یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس عورت کا ضرور کوئی نہ کوئی وجود رہا ہوگا جس نے وہ مقدس طوطا چند سکّوں کے عوض میرے حوالے کیا تھا۔

میں جب سیڑھیاں اتر رہا تھا تو میں نے دیکھا، نیچے کی چاروں منزلیں بظاہر ویران پڑی تھیں جن کے اندر گھپ اندھیرا تھا مگر ہر دو سیڑھیوں کے درمیانی چبوترے پر کھڑے ہو کر عجیب و غریب بھنبھناہٹوں اور سرگوشیوں کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا، عمارت آباد تو تھی مگر آج بھی لوگ میرا سامنا کرنے سے کترا رہے تھے۔ نیچے کنکریٹ کی سڑک پر میں نے کچھ راہگیر اور فیکٹری سے لوٹتے سائکل سواروں کو دیکھا۔ وہ شاید میرے ہی منتظر تھے اور اپنے آس پاس کی دنیا کو بھول کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔

کسی نے میرا طوطا دیکھا ہے؟ میں نے اپنے خالی پنجڑے کو اوپر اٹھا کر دریافت کیا۔ اس پر اللہ کا نام لکھا ہوا تھا۔

انھوں نے جواب دینے کے لئے منہ کھولنے کی کوشش کی۔ میں دیکھ رہا تھا، انھیں اس میں ناکامی ہو رہی تھی۔ اچانک مجھے ان کے چہروں میں ایسا کچھ نظر آیا جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ طوطے کے بارے میں سارے شہر کو واقفیت تھی۔ یہ کون سا شہر ہے؟ میں نے ڈرتے ڈرتے دریافت کیا، یہ میرا شہر تو نہیں ہو سکتا۔ میں

نے دیکھا راہگیر مجھ سے دور ہٹتے جا رہے تھے۔ سائکل سواروں نے اپنی سائکلوں کا رخ موڑ لیا اور تیزی سے پیڈل مارتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں ان کا تعاقب کرتے ہوئے، (گرچہ یہ تعاقب بے معنی تھا) ایک دوسری ویران سڑک پر نکل آیا جو ایک لوہے کے پل سے گذرتی تھی جس کے نیچے کیچڑوں بھرے پانی کا کھال تھا۔ کھال کے کنارے لوگ ٹوکریوں سے مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ شاید میں کسی گودی کے علاقے میں بھٹک رہا تھا۔ سڑک پر تا حدِ نظر ایک ہی طرح کے آہنی لیمپ پوسٹ کھڑے تھے جن میں سے ایک کے نیچے ایک بھکاری اپنی گدڑیوں کے بیچ بیٹھا تھا۔ اس کا کتا اس سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر ایک چھوٹی دیوار پر جو شاید کبھی سنگ میل رہی ہوگی، اپنے سامنے کے پنجے جمائے کھڑا نیچے کھال کی طرف تاک رہا تھا۔ اس کی بھینگی آنکھوں میں سارے شہر کی دہشت لکھی ہوئی تھی۔ خود بھکاری کے وجود سے ایک عجیب طرح کی بساند آ رہی تھی جیسے اس کا جسم سڑ چکا ہو۔

آپ اس شہر کے لئے نئے نہیں ہو، بھکاری نے کہا۔ اور میں آپ سے بھیک قبول نہیں کر سکتا، کہیں مجھے آپ کے کسی سوال کا جواب نہ دینا پڑے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف تم پڑھے لکھے ہو بلکہ تمہیں میرے طوطے کا بھی علم ہے، میں نے کہا۔ ہاں، بھکاری نے جواب دیا، وہ اسی طرح کے ہتھکنڈے لوگوں پر آزمایا کرتی تھی، مگر ایک ہی شہر میں آپ برسوں تک لوگوں کو ایک ہی طرح کے فریب نہیں دے سکتے، ایک نہ ایک دن آپ کا پول کھل جاتا ہے۔ اسے چاہئے تھا کہ کسی دوسرے شہر میں قسمت آزمائے۔ مگر کوئی خاص وجہ اسے اس شہر کو چھوڑنے سے روکے ہوئے تھی۔ تو اس نے اپنا پیشہ بدل لیا۔ اس نے کھال کے کنارے دھندا کرنا شروع کر دیا۔ وہ ہر شام اسی لوہے کے پل پر ملاحوں کی امید میں آتی مگر اسے زیادہ تر خالی ہاتھ لوٹنا پڑتا کیونکہ اس کی عمر کے سبب کسی گاہک کو اس کے اندر کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ خاص طور پر جب کمسن لڑکیوں کی کھیپ کی کھیپ چکلوں کے اندر بھر چکی ہو۔ رہا آپ کا طوطا، تو وہ کب کا مر چکا ہے۔ تمہیں علم نہیں تم جس طوطے کی بات کر رہے ہو وہ کوئی ایسا ویسا طوطا نہیں تھا، میں نے کہا۔ تم اتنے سرسرے انداز میں اس کی موت کا ذکر نہیں کر سکتے۔ وہ خدا کا بھیجا ہوا خاص پرندا تھا۔ ممکن ہے وہ ویسا ہی رہا ہو، بھکاری نے تائید میں سر ہلایا، مگر آپ واپس کیوں نہیں لوٹ جاتے۔ شاید آپ کو علم نہیں، آپ اپنے وقت سے باہر نکل آئے ہیں۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ تمہیں اتنا سب کچھ کیسے معلوم؟

بھکاری اپنے عجیب و غریب دانتوں سے مسکرایا۔

میں نے آپ سے کہا تھا نہ کہ میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ پھر بھی ایک بات تو بتا ہی سکتا ہوں۔ بیس برس قبل ایک بوڑھا آپ کی تلاش میں یہاں آ نکلا۔ ہوا کی ایک ٹھنڈی لہر سے بچنے کے لئے بھکاری نے چیتھڑوں کو اپنے گرد لپیٹنا شروع کر دیا جس سے بساند اور بھی تیز ہو گئی۔ وہ آپ کو تقریباً تلاش کر چکا تھا کہ شہر میں فساد پھیل گیا اور لوگوں نے اسے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر زندہ جلا ڈالا۔ اس کے بعد بھی وہ سرکاری اسپتال میں کئی دنوں تک زندہ رہا۔ پھر اس پر دل کا دورا پڑا اور اس کے لوگ اسے واپس اٹھا کر لے گئے۔ اور آپ

کا طوطا بیس سال تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس نے ضرور پنجرے کے اندر جان دے دی ہوگی اور وہ دھیرے دھیرے مٹی میں بدل گیا ہوگا۔ شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو، میں پنجرے کے اندر دیکھ رہا تھا، کچھ ایسا ہی ہوا ہوگا اور اس کی مٹی کو برسات کا پانی بہا کر یا ہوا اڑا کر لے گئی ہوگی۔ مگر تمہیں اس عورت کا پتہ تو معلوم ہوگا؟ میں نے پوچھا۔ ایسی عورتوں کا کوئی پتہ ٹھکانہ نہیں ہوتا، بھکاری نے جواب دیا۔ میں نے اسے عرصے سے دیکھا بھی نہیں ہے۔ یوں بھی، وہ اب آپ کے کسی کام کی نہیں، وہ ہر طرح کے ٹیومر سے گھر چکی ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو کسی ہسپتال کے احاطے میں اپنی موت کا انتظار کر رہی ہوگی۔ یہ اس کے ان گنت گناہوں کا نتیجہ ہے۔

تمہارے دادا کی موت کی اطلاع مجھ پر بجلی بن کر گری تھی مگر اس کے جھٹکے کو سمجھنے کے لئے مجھے کچھ وقت لگ گیا۔ اور جب مجھے اس کا احساس ہوا تو میں پاگل کی طرح سڑکوں پر دوڑتا پھرا۔ کچھ راستے اور گلیاں میری پہچان میں بھی آگئیں اور پھر دھیرے دھیرے میں ان کی پہچان بن گیا۔ میں نے وہ پنچ کونی تاروں والا پنجڑا کب کھو دیا، مجھے اس کا احساس نہ تھا۔ خود میں اچھا خاصا بوڑھا ہو چکا تھا۔ میں نے ایک لمبے عرصے تک شہر میں آوارہ گردی کی۔ اپنی آوارہ گردی کے دنوں میں بھوک مٹانے کے لئے مجھے کئی معصوم چوریاں بھی کرنی پڑیں۔ ایک بار پکڑا بھی گیا مگر میری عمر کو دیکھتے ہوئے لوگوں کو مجھ پر ترس آگیا اور انھوں نے مجھے عیسائیوں کے ذریعہ بنائے گئے بوڑھوں کے ایک آشرم میں ڈال دیا جہاں سے بھاگنا آسان نہ تھا کیونکہ اس کا پاگل دربان ایک گھنٹے کے لئے بھی نہیں سوتا تھا۔ مگر میں بھاگ نکلا۔ آخر کار وہ دن آ ہی گیا جب میں نے تمہارے دادا کی قبر دریافت کر لی۔ خدا بھلا کرے ان لوگوں کا جنھوں نے قبروں پر کتبہ نصب کرنے کی روایت قائم کی۔ شہر میں آج کے برعکس ان دنوں تم مسلمانوں کا ایک ہی قبرستان تھا، مگر تمہارے دادا کو تمہارے لوگوں نے تمہارے خاندانی قبرستان میں دفن کیا تھا جس کے دو ہاتھ کے فاصلے پر اس کا کتا بھی دفن تھا جسے تمہارے دادا نے رمضان میں روزہ رکھنے کی عادت ڈلوائی تھی۔ مگر تمہارے بڑے چچا نے، جس نے گھر کے تمام ساز و سامان کے ساتھ اس اتنی بڑی عمارت کی چھت سے لگے شہتیروں سے لے کر کھڑکیوں دروازوں کے چوکھٹ تک گروی رکھ دی تھی، مجھے ایک الگ ہی واقعہ سنایا۔ اس کے مطابق وہ ریلوے کے حادثے میں مارا گیا تھا۔ وہ مال گاڑی لے کر کسی سنسان اسٹیشن سے گزر رہا تھا جب اس کا انجن بفر لائن پر غلطی سے جا نکلا جس کے خاتمے پر ٹرین کو روکنے کے لئے بنائے گئے مٹی کے اونچے ڈھیر سے ٹکرا جانے کے سبب اس کا ابلتا ہوا بوئلر پھٹ کر تمہارے دادا پر آ گرا جس سے وہ جھلس کر مارا گیا۔ یہ اسٹیم انجن کا زمانہ تھا جب پٹریاں دستی بیرم کے ذریعے بدلی جاتی تھیں اور کسی نے شرارت سے پٹری کا رخ بفر لائن کی طرف موڑ دیا تھا۔

بدھ رام سے میں نے اس طوطے کے بارے میں دریافت کیا۔ کیا واقعی اس کا کوئی وجود تھا؟ کیا واقعی وہ خدا کا بھیجا ہوا پرندا تھا جس کے اندر اتنی طاقت تھی کہ وہ گھڑی کے کانٹوں کو طوفانی رفتار سے چلنے مجبور کر دے، اتنی تیزی سے کہ دہائیاں گزر جائیں اور آدمی کو پتہ نہ چلے، اور خود اس کا اپنا شہر اس کے لئے اجنبی بن جائے، جیسا کہ ان کے ساتھ ہوا تھا۔

بالکل، وہ ہنسے۔ اب تک اس بوڑھے کی ہنسی میں اس کا بچپنا جھلکتا تھا۔ اگر تمہارے دادا زندہ ہوتے تو اس بات کی تصدیق کرتے۔

کچھ دنوں کے بعد ہمارے دادا کا مکان ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ ہم لوگ بدھ رام کو اس کے ٹرنک کے ساتھ اسٹیشن چھوڑنے آئے جس کی محرابوں سے ہمیشہ کی طرح چمگادڑیں لٹک رہی تھیں۔ ہمالیہ کی ترائی میں اسے ایک کہرے سے ڈھکے ہوئے شہر کی یاد تھی جہاں اب بھی اس کے کچھ رشتے دار زندہ تھے جو انھیں پہچان سکتے تھے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا میں وہاں کیوں جا رہا ہوں؟ بدھ رام نے کہا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی جس کے سبب پلیٹ فارم پر ایک طرح کی دھند چھا گئی تھی۔ ہملوگ لوہے کا ٹرنک سیٹ کے نیچے رکھ کر ابھی ابھی باہر آئے تھے اور ان کی کھڑکی کے سامنے کھڑے تھے۔ تیز ہوا بارش کی پھوار کو شیڈ سے نیچے کی طرف لا رہی تھی۔ بدھ رام کی آنکھیں بجھی ہوئی تھیں۔ وہ اب زندگی میں بالکل اکیلے ہو چکے تھے۔ کچھ دیر بعد انھوں نے سر اٹھا کر کہا، اگر تم لوگ کچھ اور دن انتظار کرتے تو اپنے دادا کی زمین میں عیسائی رسم و رواج کے مطابق مجھے دفن کر سکتے تھے۔ آخر کار اس میں ایک کتا بھی دفن ہے۔ میں تو خیر ایک عیسائی ہوں۔

ہم عدالت کے حکم کے سامنے مجبور ہیں، میں نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ وہ مکان اب ہمارا نہیں رہا۔

ٹرین چل چکی تھی جب بدھ رام نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر چلاتے ہوئے کہا، ایک دن میں واپس آؤں گا اس عورت اور اس طوطے کی تلاش میں۔ اس دن تمہارے دادا کے بارے میں میں اور بھی بہت ساری جانکاری دونگا۔

ایسا نہیں تھا کہ میں نے پوری طرح ان کی بات کا بھروسہ کیا ہو، مگر وہ دن اور آج کا دن، مجھے اب بھی اس ٹرین کا انتظار ہے۔ آج جب چند ناگزیر حالات کے سبب میں اس شہر کا باشندہ بن چکا ہوں جہاں ایک عورت اور اس کے طوطے کی نامکمل کہانی کے ساتھ ساتھ میرے دادا کی زندگی کے ان گنت واقعات دفن ہیں جن کا علم صرف بدھ رام کو ہے۔

بدھ رام، میں دادا کی جیبی گھڑی کو جس میں وقت دائمی طور پر رک چکا تھا، اس کی زنجیر اپنے سامنے لٹکا کر اس کے سات کے ہندسے کو دیکھ رہا تھا، جب تک تم لوٹ کر نہیں آتے نہ وہ طوطا مر سکتا ہے، نہ وہ عورت اور نہ ہی تم مر سکتے ہو۔ وقت کا یہی فیصلہ ہے!

........☆........

تاخیر

● نورالہدیٰ سیّد [پاکستان]

اس رات میڈم نے بستر سے پیٹھ لگائی ہی تھی کہ یادیں ان کے حافظے کو مخاطب کرنے لگیں ''اب ان یادوں کا حاصل کیا ہے؟ ۳۵ سال تو یوں ہی گزر گئے''۔

مختصر خود کلامی کے ساتھ ہی میڈم کو نیند آئی تو دیکھا کہ دو برہنہ عورتیں محورقص اور نغمہ سرا تھیں اور معزز حاضرین ان کو کہتے سن رہے تھے:

''یہ ۳۰ ویں شب ہوگی جو ہم آپ کی پر جوش قربتوں میں گزاریں گے۔ اس طویل عرصے میں آپ کی محویت سے ہمیں دلی خوشی ہوئی ہے اور حیرت بھی کہ ۷۰ افراد پر مشتمل آپ کا قافلہ بھول ہی گیا کہ وہ اس متبرک مقام پر اللہ تعالی کے حضور قوم کے لیے رحم اور قحط کے عذاب سے نجات کی اجتماعی دعاؤں کے لیے آیا تھا مگر......''

خواب کے عمل میں میڈم کو یاد آیا کہ وہ تو ایک معروف قصے کا اہم ٹکڑا تھا۔

عین اسی وقت ایک اور خواب کا در کھلا جو منظر ان کے روبرو تھا وہ صرف ۳۵ برس پرانا تھا اور ہزاروں سال کے سفر کے بعد کا تھا' یہاں پہنچ کر اشتعال کا عمل کیوں تھا۔؟

میڈم حیرت زدہ ہو کر دیکھ رہی تھیں۔ پختہ سڑکیں' یونیورسٹی کا کشادہ احاطہ' روشن اور دلکش شہر کی گہما گہمی! دستیاب سب کچھ تھا' خرم جاہ بھی ان کے ساتھ ساتھ تھے۔ میڈم سوچنا چاہتی تھیں کہ بیداری سے انارکی کا کوئی علاقہ ہوتا ہے؟ پتہ نہیں کیوں وہ ایسا کچھ محسوس کر رہی تھیں لیکن وہ چند ایسے لفظوں میں الجھتی چلی گئیں جو ہمیشہ بحث طلب رہے تھے یا تفہیم کو مدعو کرتے تھے' مثلاً جبر' احتجاج' بے حسی' بیداری عزت نفس اور انارکی، اور وہ حریص اور ہوس کیش اصحاب اقتدار! اچانک میڈم کو لگا کہ ہر طرف گھپ اندھیرا چھا گیا۔ تیز بارش ہونے لگی تھی۔ وہ بارش میں بھیگی ہوئی ایک ویران علاقے میں، سائبان کے نیچے زمین پر پڑی تھیں۔ چاروں طرف، ہو کا

عالم تھا۔ خرم جاہ کی غیر موجودگی ان پر واضح ہوئی تو وہ خوف کے عالم میں خود کو ٹٹولنے لگیں' ان کی نیند ان کی اپنی چیخ سے ٹوٹی تو وہ اپنے بستر پر تھیں۔ پسینے سے شرابور' تھر تھر کانپتی ہوئی' میڈم کے حواس دھیرے دھیرے ان کے قابو میں آئے' تو انھوں نے سوچا کہ جو لوگ بیدار تھے، وہ کامیاب ہوئے، لیکن وہ جو جبر کے مقابل نہ ہوئے اور بے حس تھے، ان کا کیا ہوا'۔ میڈم کو یاد آرہا تھا کہ وہ لوگ انارکی کی دست برد سے کہاں بچ سکے تھے۔ خرم جاہ آج تک نہ ملے اور گویا اس انارکی کی تابکاری آج بھی موجود تھی۔

گاہے ماہے میڈم کی نگاہوں میں خرم جاہ اب بھی پھر جاتے، تو ان کی آنکھیں امنڈ آتی تھیں' امید و بیم کی حالت میں کبھی وہ یوں بھی سوچتیں کہ خرم جاہ زندہ سلامت ہوں گے، لیکن کیا وہ بھی ان ہی کی طرح آج تک میرے واسطے انتظار کا در کھولے بیٹھے ہوں گے؟ اس میں حرج کوئی نہیں کہ ایسا نہ ہو' یوں سوچ کے میڈم نے کئی باتیں اور بھی سوچیں۔ یہ بھی کہ خرم جاہ بہر طور زندہ سلامت ہوں' اتنے میں یوں ہوا کہ ان کا ذہن اس لڑکی کی طرف مبذول ہو گیا جو حال ہی میں کسی اور یونیورسٹی سے آئی تھی ان کے شعبے میں پڑھتی تھی۔ وہ سوچنے لگیں جب سے وہ لڑکی ان کے قریب آئی تھی، ایک بار پھر سے یادوں کا انبوہ انھیں کیوں بے چین کرنے لگا تھا۔ اور وہ سوالوں کے عجیب ہی عذاب میں مبتلاء ہو رہی تھیں'' اندیشوں اور امیدوں کے تذبذب سے نکل جانا ہی اچھا ہوگا'' انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس لڑکی کو بلا کر وہ سب کچھ پوچھیں گی جو ان کے دل میں تھا۔

اس دن صباء یونیورسٹی سے لوٹیں تو ماں کے کمرے میں گئیں اور ماں کے سرہانے بیٹھی اپنے والد کی باتیں سنتی رہیں۔ گفتگو کے وقفے میں صبا بول پڑیں۔

''آج میڈم نے مجھے اپنے چیمبر میں بلایا تھا''

''کیا نام ہے اُن کا؟''

خرم جاہ پوچھ بیٹھے۔

تھوڑی دیر پہلے ان کا فون آیا تھا۔

روشن آراء بیچ میں بولیں اور کہنے لگیں

''ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

صبا چلی گئیں تو روشن آراء خرم جاہ کو آنکھ گاڑے دیکھتی رہیں، خرم جاہ ان کی نظر پہچان کر کچھ دیر خاموش رہے، پھر روشن آراء نے خرم جاہ کا داہنا ہاتھ اپنی طرف کر کے ان کی ہتھیلی کھولی اور ایک جگہ پر اپنی شہادت کی انگلی کا پور چھاتے ہوئے بولیں:

''خود دیکھ لو' یہ دونوں لکیریں شروع سے متوازی پڑی ہیں' سو میں کہتی ہوں' سوکن زندہ ہے۔''

دوسرے دن' روشن آراء نے صباء کی میڈم کو فون کیا' بولیں:

''کل' آپ کی باتوں میں یہ کہنا میں بھول گئی کہ آپ میرے گھر آیئے' آج یہی پوچھنے کی غرض سے فون کیا ہے' کب آرہی ہیں۔''

میڈم بولیں:

''فون تو ملاقات کا ذہن بنا کر ہی کیا تھا' آج ذرا دیر سوچنے دیجیے۔''

فون رکھ کے میڈم کئی طرح سے سوچتی رہیں۔ آخر راہ یوں نکالی کہ خرم جاہ کو اپنی نظروں کے سامنے رکھنے کے لیے بہر صورت روشن آراء کے قریب ہونا ہی پڑے گا' اور چار بجے شام کا وقت' ملاقات کے لیے طے پایا تو میڈم ٹھیک وقت پر روشن آراء کے گھر پہنچ گئیں صباء نے میڈم کو خلاف معمول برقعے میں دیکھا۔

روشن آراء نے کمرے کے دروازے پر ان کا استقبال کیا تو میڈم نے پوچھا:

''آپ کی طبیعت ناساز ہے؟''

''آپ تنہا آئی ہیں؟''

روشن آراء نے پوچھا تو میڈم بولیں:

اب تو ایک مدت گزر گئی' تنہائی صبر سے گھل مل گئی ہے۔ تو میں بھی سکون سے ہوں۔

''صبر' سکون اور تنہائی!''

روشن آراء نے نوٹ کیا' خاموش رہیں' میڈم کہہ رہی تھیں:

سوچ رہی ہوں، آپ کو مخاطب کس طرح کروں

میں آپ کو آپی کہنا چاہتی ہوں تا کہ بچے آپ کو خالہ امی کہیں، کوئی حرج ہے؟

روشن آراء نے کہا تو میڈم سمجھ گئیں' انھوں نے پوچھا:

''بچے کہاں ہیں' سب؟''

''صبا تو آپ کی شاگردہ ہیں' سب میں بڑا بیٹا آصف جاہ ہے' گھر پر موجود نہیں ہے' بیٹیوں میں راحیلہ بڑی ہیں اور......''

''آصف جاہ!''

میڈم، روشن آراء کی بات کاٹ کر بولیں اور خیالوں میں گم ہو گئیں۔

''آصف جاہ، انھوں نے اپنے پہلے بیٹے کے لیے سوچ رکھا تھا' سو خرم جاہ نے اتنا خیال رکھا' البتہ کوکھ بدل گئی' ہونی پر کس کا اختیار''

وہ اس تصویر کو دیکھ رہی تھیں جو شوکیس پر رکھی تھی' روشن آراء نے دیکھا' بولیں:

''خرم جاہ کی ہے' دوسال پرانی ہے۔''

''آصف جاہ کے ابو کی ہے' ان کے ساتھ آپ ہیں۔''

میڈم نے تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا اور پوچھا:

شادی کب ہوئی تھی آپ کی؟

''یاد کر کے بتا سکوں گی'' روشن آراء ذرا دیر رک کر کہنے لگیں:

ہم لوگ انار کلی کے پُر ہَول دور سے گزر رہے تھے' آپ کو تو یاد ہی ہوگا' خرم جاہ کی بیوی اُس میں لا پتہ ہوگئی تھیں ۳ برس گزر گئے تھے، خرم جاہ نے دوسری شادی نہ کی' آمادہ ہی نہ ہوتے تھے' پھر چند بزرگوں نے ان کو قائل کیا تو وہ مجھ سے شادی کرنے کو تیار ہوئے۔ اس طرح ہماری شادی ہوئی' انھی دنوں CSS کے امتحانات ہوئے' خرم جاہ کامیاب ہوگئے۔ ٹریننگ پر گئے' پوسٹنگ ہوئی' تبادلہ ہوا اور ہوتا چلا گیا' کبھی یہاں، کبھی وہاں' اب جو ریٹائرمنٹ کا وقت آیا تو ہم سب لوگ پھر اسی شہر میں آ گئے۔ اور صبا آپ کی شاگردہ ہوئی، روشن آراء کی باتوں میں میڈم نے دو باتیں نوٹ کی تھیں۔ ایک بات یہ تھی کہ وہ نہایت خلیق خاتون تھیں' دوسری بات یہ تھی کہ وہ اپنی ساری گفتگو میں خرم جاہ کی پہلی بیوی کا نام لینے سے عمداً اجتناب برت رہی تھیں۔

اس دن میڈم جانے کس بے کلی میں ٹھیک دوپہر کے وقت گھر سے نکلیں اور گھنٹہ بھر شہر میں گھومتی پھرتی رہیں' اور پھر روشن آراء کے گھر آ گئیں' لیکن گھر میں داخل ہونے کی بجائے وہ ان کے پچھلے لان میں آ گئیں۔ وہ رجنی گندھا کے اس درخت کے پاس گئیں جس کے بارے میں روشن آراء نے انھیں بتایا تھا کہ خرم جاہ کہیں سے لیکر آئے تھے اور اپنے ہاتھوں سے اسے اپنے کمرے کی آخری کھڑکی کے بالکل سامنے لگایا تھا اور اب اس کی مسحور کن خوشبو ان کے کمرے میں داخل ہوتی رہتی تھی۔

''خرم جاہ' یادوں کے گلشن میں!''

میڈم ذرا دیر کو رومانٹک ہوتے ہوئے بڑبڑائیں' پھر لان سے نکل کر گھر کی دیوار کے سائے میں کھڑی ہوگئیں اتنے میں صبا بھاگتی آئیں، بولیں امی آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔

روشن آراء کا کمرہ ٹھنڈا محسوس کر کے میڈم بولیں:۔

کچھ بھی کہو چمکیلی دھوپ کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے اور صوفے پر بیٹھتی ہوئی کہنے لگیں:

''روشن' تمھاری بات رتی رتی درست نکلی۔''

روشن آراء ان کا اشارہ اچھی طرح سمجھ رہی تھیں۔ لیکن خاموش رہیں اور مسکراتی ہوئی اپنے پیروں کو بستر پر سیدھا کر کے تکیے پر سر رکھ کر لیٹ رہیں۔

''کیسی طبیعت ہے؟''

میڈم نے ان کو دیکھتے ہوئے پوچھا تو روشن آراء ذرا دیر چُپ رہیں پھر کہنے لگیں:

کیا کہوں' اب تو خرم جاہ کے چہرے کو دیکھ کر ہی کچھ سمجھ پاتی ہوں' اس صدمے کے ساتھ کہ اُن کی زندگی کا یہ پیمانہ اب خالی ہوتا جا رہا ہے۔

میڈم کی دل آزاری کا ارادہ ہرگز نہ تھا مگر ان کی دل آزاری تو ضرور ہوئی ہوگی۔ روشن آراء بول چکی تھیں' اب پچھتاوے کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا' اسی دوران آصف جاہ کمرے میں داخل ہوئے تو میڈم نے پہلی بار جو ان کو دیکھا تو لگا کہ برسوں پہلے کا کوئی دن تھا اور خرم جاہ ان کے سامنے کھڑے تھے' میڈم جیسے تیسے گھر واپس آ گئیں' بے نام صدمے کی چوٹ سے گھائل، میڈم زار و قطار روئے جا رہی تھیں۔ وہ روتے روتے بڑبڑانے لگیں:

''اوب گئی ہوں روشن آراء کی واہیات باتوں سے۔اس کے نت نئے چونچلوں سے۔کیا رکھا ہے فضول کی آمد ورفت میں''

میڈم کے جذبات دھیرے دھیرے ان کے قابو میں آئے تو وہ ہاتھ منہ دھو کر لان میں آ گئیں۔نصیر سے کچھ کہا تو وہ باہر جانے لگا' اسی وقت الن میاں ہاتھ میں فون لئے میڈم کے پاس آئے' میڈم نے کچھ سنا تو ہاتھ کے اشارے سے نصیر کو روک لیا۔

''اسی اسپتال میں' جہاں روشن آراء پہلے گئی تھیں۔''

میڈم نے جلدی جلدی نصیر سے کہا' اور گاڑی میں بیٹھ گئیں۔اور اسی سوچ کے ساتھ اسپتال پہنچیں کہ روشن آراء ایک اعلیٰ ظرف عورت کا نام ہے' قوت برداشت ایسی کہ سامنے بیٹھا کوئی بھی اس کے اندر کی کیفیتوں کو سمجھ نہیں سکتا تھا۔اسپتال میں گھر کے تمام افراد مغموم کھڑے تھے' خرم جاہ روشن آراء کے بیڈ کے قریب ڈاکٹروں کے درمیان کھڑے تھے' پھر خرم جاہ تیز قدموں سے کہیں جاتے دکھائی دیئے' میڈم نے راحیلہ کا ہاتھ پکڑا اور روشن آراء کے پاس گئیں' وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھیں' لیکن میڈم کی آہٹ پا کر ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھا اور نیم جان آواز میں بولیں:

''بچوں کا خیال رکھیئے گا خرم جاہ سے تنہا نہ ہو سکے گا۔''

روشن آراء اپنی آنکھیں کھلی نہ رکھ سکیں' ان پر نیم بے ہوشی طاری تھی' ڈاکٹروں نے کہا تو میڈم راحیلہ کے ساتھ باہر آ گئیں۔

صبح کے وقت میڈم ناشتے کی میز پر تو آئیں مگر ناشتے سے ان کا جی ہٹ سا گیا تھا وہ روشن آراء کے بارے میں سوچ رہی تھیں' چند روز قبل روشن آراء نے جو خواب دیکھا تھا میڈم کو بھی سنایا تھا' وہی خواب میڈم کے حافظے میں بار بار آ رہا تھا۔

''میں دریائے ویاس کے کنارے کھڑی تھی۔دوسرے کنارے ایک بڑی فوج تھی جو دریا سے پرے جا رہی تھی اور سپہ سالار سرخ گھوڑے پر سوار محض تھوڑے سے سپاہیوں کے ساتھ مخدونیہ واپس جا رہا تھا۔کسی نے کہا اب اس کی واپسی کا حکم آ گیا تھا' میں پیچھے مڑی۔دیکھا' ایک سفید گھوڑا کھڑا تھا' بلا تامل میں اس پر سوار ہوئی' تو اس نے جست بھری اور ایک ہی چھلانگ میں دریا کے اُس پار اتر گیا' میں اس کی پشت پر جانے کدھر نکل گئی تھی۔ مجھے یاد ہے' میرا گھوڑا سفید تھا' روشن آراء کا خواب میڈم کے حافظے میں مکمل ہوا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی' ذرا دیر کی خبر سن کر ٹیلی فون منقطع کرتے ہوئے میڈم بولیں اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

روشن آراء کے انتقال کے بعد میڈم نے خرم جاہ کے بارے میں کئی بار بھرے جذبات سے سوچا۔ہر بار روشن آراء کی وصیت ان کو تقویت بھی دیتی رہی اور ہر بار اس ہینگر کو دیکھ کر وہ فکر مندی سے سوچتیں کہ دیکھیں برقعے کا ساتھ اب اور کب تک رہتا ہے۔

''میری تشفی تو کراؤ'' دونوں بھائی امریکہ گئے، مجھ سے ایک پیسہ بھی طلب نہ کیا' حنا اور زیبا کی شادیوں پر خرچ کرنے کے لیے پندرہ لاکھ روپے' محض اندازے سے تمھارے ہاتھ بھیجے تھے،سو وہ رقم تمھاری خالہ امی نے صبا کے بینک اکاؤنٹ میں جمع کروادی، تمھاری امی نے وصیت کی ہوگی مگر اس میں ہرگز یہ نہ ہوگا کہ مجھے مقروض کر کے اللہ کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہ رہنے دیا جائے گا' تم ہی ان سے کہو کہ وہ ایسا نہ کریں اور اخراجات کو منہا کر کے کم از کم یہ تو دیکھ لیں کہ وہ اب تک کس قدر زیر بار ہوئی ہیں۔''

راحیلہ میڈم کے گھر گئیں اور خرم جاہ کی تمام باتیں ان تک پہنچادیں' میڈم نے پوچھا کہ کیا ساری باتیں تمھارے ابو نے کہی ہیں۔ راحیلہ نے اقرار کیا تو وہ کسی سوچ میں پڑ گئیں پھر کہنے لگیں:

''میری زندگی کو ایک ساعت ایسی کبھی میسر نہ آئی جو حساب کتاب اور منہائی کا سلیقہ شعار کرتی' بے شک میں مجاز نہ تھی کہ روشن آراء کی اولاد کیلئے کچھ کرتی' مگر یہ سب کچھ ہو گیا، اب جو حساب کتاب اور منہائی کی بات آن کھڑی ہوئی ہے تو اس بارے میں صبا جانیں اور خرم جاہ جانیں۔ میں تقدیر کی ہیٹی بے وجہ اس میں اپنی ٹانگ کیوں پھنساؤں۔''

راحیلہ نے میڈم کا جواب من وعن خرم جاہ تک پہنچایا تو وہ مسکرائے اور چپ ہو رہے۔

دوسرے ہی دن خرم جاہ صبا کو میڈم کے گھر چھوڑ گئے۔

میڈم نے صبا کو سیڑھیاں چڑھتے دیکھا تو قدرے سخت لہجے میں بولیں' اکیلے ہی آ ئیں؟

ابو چھوڑ کر گئے ہیں' وہ پانچ روز کے لیے باہر گئے ہیں۔''

صبا کی وضاحت سے میڈم کو اچھا لگا۔

اگلے روز ناشتے کے بعد میڈم نے الن میاں سے کہا کہ دو چار آدمی کہیں سے پکڑ لائیں، ساتھ بھنگی کو بھی لے لیں' صبا کے گھر کی صفائی ستھرائی کی ضرورت تھی۔ کئی سال سے ہوئی نہ تھی' سو اس میں پورے چار دن لگ گئے' اگلے دن مطالعہ کے دوران میڈم اپنے آپ سے مخاطب ہو کر بولیں:

صفائی ستھرائی میں چار دن لگے تو کام سارا خرم جاہ کی پسند کے مطابق ہو گیا۔

انھیں یاد آ رہا تھا کہ خرم جاہ کہا کرتے تھے' مسلسل صفائی ستھرائی سے گھر اور اس کی تمام چیزیں خوش ہو کر بولتی ہوئی سی لگتی ہیں اور ہمارے ساتھ ہماری خوشیوں اور غموں میں شریک ہو کر بسر کرتی ہیں۔ ان کو یاد آ رہا تھا کہ کل ہی جب وہ گھر کی صفائی ستھرائی کے بعد خرم جاہ کے بستر پر ذرا دیر کو لیٹ رہی تھیں تو انھیں ایسا محسوس ہوا تھا کہ کمرے کی دیواروں اور ساری چیزیں خوش ہو کر ان کی طرف دیکھ رہی تھیں جیسے کہنا چاہتی ہوں۔ میڈم آپ کا شکریہ!

میڈم خوشی کی جس کیفیت میں تھیں اس کے تحت اٹھ کر سیدھے اپنی رائٹنگ کی میز تک آئیں، کرسی پر بیٹھیں ایک دراز میں سے دو لفافے نکالے جن میں تصویریں تھیں، ان دو تصویروں میں سے ایک آصف جاہ کی تھی، ان کی ہونے والی بیوی کے ساتھ اور دوسری تصویر واصف کی تھی ان کی ہونے والی بیوی کے ساتھ۔ دونوں تصویریں واصف کی سسرال والے امریکہ سے ساتھ لائے تھے۔ میڈم نے سوچا' اور فیصلہ کیا کہ تصویریں وہ خرم

جاہ کو بھیج دیں گی' پھر کچھ اور بھی سوچ کر انھوں نے ایک فولڈر سے اپنے نام کا چھپا ہوا ایک بڑا لفافہ نکالا اور دونوں تصویروں کو اس میں ڈال کر خوش ہوئیں کہ خرم جاہ کے گھر کی رونق جلد ہی بحال ہو جائے گی' اور ساتھ ہی خرم جاہ ان کے لفافے پر چھپا ہوا ان کا نام پڑھ کے زیادہ خوش ہوں گے۔

''صاحب کے ہاتھ میں دینا۔''

میڈم نے نصیر کو روانہ کرتے ہوئے کہا۔

خرم جاہ نے لفافے کو دیکھا' چھپے ہوئے نام کو پڑھا' سوچ میں پڑ گئے کہ یہی ہونا تھا' کوئی دن! دل او ر دماغ کے پیکار میں جو وقت گزرا اس کا اندازہ تک نہ ہوا۔ بس سوچوں سے تھک گئے تو انھوں نے راحیلہ کو فون کیا۔

بہنوں اور بھائیوں کی باہم مشاورت، موقع و محل کے تعین میں وقت یوں گزر گیا کہ میڈم کی امید مایوسیوں میں گھرتی چلی گئی۔ خرم جاہ نے فون تک نہ کیا۔ ان کی اولاد نے فون کرنا ہی چھوڑ دیا۔ میڈم کو صاف یہی لگا کہ خرم جاہ خود کو اپنے حصار میں محفوظ پا کر خوش تھے۔

''کسی کی زندگی میں کوئی زبردستی داخل نہیں ہو سکتا۔''

میڈم انتہائی صدمے کی حالت میں سوچ رہی تھیں' اسی وقت انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ملک ہی چھوڑ کر چلی جائیں گی۔

اس دن مغرب کی نماز کے بعد میڈم جائے نماز پر بیٹھی تھیں' ان کے پیچھے آہٹ ہوئی تو مڑ کر دیکھا، آصف اور صبا کھڑے تھے' وہ بے تاب ہو کر اٹھ کھڑی ہوئیں' دونوں بھائی بہن ان کے سینے سے لپٹ گئے۔ آصف نے میڈم کو بستر پر بٹھایا' اور ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئے' کافی دیر اداسی کے ماحول پر خاموشی طاری رہی' سب کے اداس چہرے اشکوں سے دھلتے رہے' رہ رہ کر سسکیاں سنائی دیتی رہیں۔

''ایک طویل عرصہ ڈھائی مہینوں کا گزر گیا' میڈم بھرائی آواز میں دھیرے دھیرے بول رہی تھیں:

''آواز سننے کو ترس گئی' سو اس کی وجہ ہی بتا دیتے' باپ کی نافرمانی کو میں ہرگز نہیں کہتی ......''

وہ اور نہ بول سکیں تو آصف اور صبا نے میڈم کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا' اداسی کی فضا کافی دیر رہی تو میڈم نے پوچھا:

''تم کب آئے؟''

''سب ساتھ آئے ہیں' آج ہی''

آصف بولے، ذرا دیر چپ ہوئے' پھر کہنے لگے:

''آپ کو کیا۔ آپ تو چند گھنٹوں بعد ایئرپورٹ پر ہوں گی' اور ہمیں چھوڑ کر چلی جائیں گی۔ فار ایور''

میڈم کی سمجھ میں سب کچھ آنے لگا تھا۔ پھر بھی بولیں:

''قطع تعلق کرا دیا گیا' اب مجھ کو محصور کرنے کیلئے تم دونوں کو بھیجا گیا ہے۔''

''پاسپورٹ اور ٹکٹ کہاں ہے۔''

آصف نے پوچھا تو میڈم نے بلاچوں وچرا پاسپورٹ اور ٹکٹ آصف کے حوالے کر دیا۔
ٹیلی فون پر ٹکٹ کینسل کروا کر آصف نے صبا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا:
''یہ زینت خرم جاہ کون ہیں!''
''یہ تو نہیں لگتیں!''
صبا نے میڈم کو شوخی سے دیکھتے ہوئے کہا' اور پھر اجازت لے کر دونوں گھر کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں آئس کریم پارلر پر رکے۔ اور یہ کہتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی کہ ابو بیٹھے ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔
دونوں بھائی بہن بہت خوش تھے۔ گھر پہنچے تو خرم جاہ ذرا دیر قبل گھر سے نکل چکے تھے' کسی نے بتایا کہ کسی کا فون آیا تھا' وہ ڈرائیور کو لے کر گئے تھے' جلدی میں تھے۔
شادی کارڈ کی چھپائی مسئلہ بنا ہوا ہے ابو کے نزدیک' فون پریس والے کا ہی ہوگا۔
لیکن آدھی رات بیت گئی' خرم جاہ اپنے Cell phone پر بھی کانٹیکٹ نہ ہو پا رہے تھے۔ رات کے اخیر پہر ایک بار ان سے رابطہ ہوا تو انھوں نے خود ہی Cell phone کو ڈس کنیکٹ کر دیا۔
پوری رات تشویش میں گزر گئی تھی۔ صبح کے نو بجے خرم جاہ کی گاڑی آئی، اس میں وہ خود نہ تھے۔ اس کے فوراً بعد میڈم کی گاڑی آئی' اس میں میڈم نہ تھیں' ذرا دیر بعد گیٹ پر میت گاڑی آن کھڑی ہوئی۔ یہ سب کچھ جلدی جلدی ہوتا چلا گیا تو گھر کے سارے لوگ سراسیمگی سے گیٹ کی طرف بھاگے' میت گاڑی کا دروازہ کھولا گیا' خرم جاہ باہر نکلے، کھڑے رہے' پھر سڑک پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں خرم جاہ کی ساری اولاد اکٹھی ہوگئی تو ماتم پڑ گیا۔
جب زینت خرم جاہ کا جنازہ گھر سے اٹھایا گیا' تو آہ وزاری اور بین کی آواز تیز تر ہوگئی خرم جاہ گم صم بیٹھے تھے۔ بڑے داماد نے ان کو میت گاڑی میں اگلی سیٹ پر لا کر بٹھایا' خرم جاہ کی حالت دیکھ کر کسی نے کہا: ''بے حسی کی کیفیت طاری ہے۔''
قبرستان میں خرم جاہ جس جگہ کھڑے تھے کھڑے رہے۔ جنازہ قبر میں اتارا گیا' پھر کسی نے پوچھا کہ قبر کو بند کیا جائے؟ یہ آواز خرم جاہ نے سنی تو یکایک چونکے اور زور سے بول اٹھے: ''ٹھہرو!'' اب وہ قبر کے کنارے کھڑے تھے۔ زینت خرم جاہ کا چہرہ کھول دیا گیا اور وہ خاموش ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ پھر وہ زیر لب کچھ بول رہے تھے۔ بولتے رہے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا' قبر کو دھیرے دھیرے بند کیا جا رہا تھا اور زینت ان کی نگاہوں سے ایک بار پھر اوجھل ہوتی جا رہی تھیں۔
قبرستان سے واپسی کے بعد اکثر و بیشتر خرم جاہ کہتے تھے:
''بہت تاخیر ہوگئی۔''

مارٹن کوارٹرز کا ماسٹر

● اخلاق احمد [پاکستان]

ماسٹر کے گھر کے قریب پہنچ کر ڈرائیور نے گاڑی اندر گلی میں لے جانے سے انکار کر دیا۔

''پچھلی بار کسی نے سالن پھینک دیا تھا صاحب جی۔'' اُس نے حتی الامکان اَدب کے ساتھ کہا...... ''اور اس سے پچھلی بار تین چھوکرے....''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' منظر نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ چھوکرے کیا ہوتا ہے؟...... ذرا دیکھ بھال کر بولا کرو......''

ڈرائیور خاموش بیٹھا رہا۔

ٹائی اور کوٹ سے نجات پا کر منظر کار سے باہر نکل آیا۔ تیز، چبھتی دھوپ اور کراچی کی مخصوص نم ہوا۔ وہ جب بھی ماسٹر سے ملنے آتا تھا، ڈرائیور کسی نہ کسی بہانے ناگواری کا اظہار کر دیتا تھا۔ اور منظر ہر بار اپنے غصے پر قابو پا لیتا تھا۔ یہ بات بھی اسے ماسٹر ہی نے سکھائی تھی: ''غریب آدمی کے غرور پر ناراض مت ہوا کر پیارے''۔ اُس نے کہا تھا۔ ''سالا غرور کی بیساکھیوں کے سہارے ہی خوش رہنے کے بہانے ڈھونڈ لیتا ہے۔ صاف ستھرے کپڑوں پر، جمعہ کی نماز پڑھ لینے پر، گھر میں گوشت پکنے پر، بچے کی سیکنڈ ڈویژن پر، ہر چیز پر اس کی گردن اُکڑ جاتی ہے۔ اس پر بُرا نہیں ماننا چاہیے۔''

گلی کے کونے پر اَب ایک نیا احاطہ نظر آ رہا تھا۔ بلاکوں سے بنی دیوار پر پلستر کے بغیر ہی سفیدی کر دی گئی تھی۔ ہر کوارٹر والا زیادہ سے زیادہ جگہ گھیر لینے کی فکر میں تھا۔ قبضے بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ پیلے رنگ کے سرکاری کوارٹر، ان پھیلتے، بڑھتے احاطوں کے اندر کہیں غائب ہو گئے تھے جہاں اس نے اپنا سارا لڑکپن گزارا تھا۔

وہ بائیں جانب کی پہلی گلی میں مڑ گیا۔ کسی ارادے کے بغیر۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ یہ گلیاں، یہ علاقہ

اسے یوں یاد تھا جیسے ہتھیلی کی لکیریں۔ چالیس برس گزرنے کے باوجود، اتنی تبدیلیوں کے باوجود وہ ان کوارٹروں کے درمیان تنگ گلیوں میں، گٹر کے ڈھکن پھلانگتا، کیچڑ سے بچتا، نالیوں کو عبور کرتا، یوں آگے بڑھ سکتا تھا جیسے یہیں رہتا ہو۔

ماسٹر کے کوارٹر کا دروازہ اسی پردے کے پیچھے چھپا ہوا تھا جو گزشتہ بیس برسوں کے دوران بارشوں اور دھوپوں اور میلے ہاتھوں اور گرد کے جھکڑوں کا سامنا کرتے کرتے ایک میلی، بدوضع چادر بن چکا تھا۔

منظر نے پہلے گھنٹی کو دو تین بار دبایا۔ پھر پردہ ہٹا کر دروازہ دھڑ دھڑایا۔

لمحہ بھر بعد اندر سے کسی عورت نے کرخت آواز میں پوچھا۔ ''کون؟''

''قیصر صاحب ہیں؟'' منظر نے بند دروازے کو مخاطب کیا۔ ''میں..... منظر ہوں۔''

کرخت آواز نے کہا۔ ''باتھ روم گیا ہوا ہے۔ ابھی آجائے گا۔''

وہ یقیناً ماسٹر کی بیوی تھی۔ منظر نے اندازہ لگایا۔ ہر بار وہ ایسی ہی بدتہذیبی کا مظاہرہ کرتی تھی۔ ماسٹر کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ شاید وہ عادی ہو گیا ہوگا۔ آدمی پچاس سال کی عمر میں ہر زیادتی کا عادی ہو جاتا ہے۔

منظر نے کوارٹروں کی قطار پر نگاہ ڈالی۔ ماسٹر کا کوارٹر سب سے خستہ حال نظر آتا تھا۔ چالیس سال پہلے کون سوچ سکتا تھا کہ ...... مگر چالیس سال پہلے سوچنے کی فرصت ہی کس کے پاس تھی۔ منظر نے میلے پردے کو دیکھا اور دل ہی دل میں ہنسا۔ چالیس سال پہلے تو زندگی کا ذائقہ ہی کچھ اور تھا۔ ماسٹر کی اماں کے زمانے میں ایسا میلا پردہ کوارٹر کے قریب بھی نہیں آسکتا تھا۔ چپلیں صحن میں اُتارنی پڑتی تھیں اور کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے پڑتے تھے۔ پلنگوں پر بے داغ سفید چادریں۔ چوڑی چوڑی لال نیلی پٹیوں والی بڑی دری۔ تام چینی کی پلیٹیں اور مٹی کی ہانڈی سے اُٹھتی گرم شوربے کی خوشبو۔

ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا اور ماسٹر نمودار ہوا۔

وہ پہلے سے زیادہ کمزور لگ رہا تھا اور اس کے دُبلے پتلے سیاہی مائل چہرے پر ہڈیاں بھی زیادہ اُبھری ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ مگر اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور ایک پُر جوش توانائی تھی۔

''ابے اتوار کے روز؟'' ماسٹر ہنسا۔ ''اتوار کو تو تجھے ہفتے بھر کی کمائی کا حساب کرنا ہوتا ہے سیٹھ۔''

وہ گلے ملا تو منظر نے اس کے لاغر جسم کی ہڈیوں کی چبھن محسوس کی۔

''جاہل ماسٹر، سیٹھ لوگ کوئی کام نہیں کرتے۔ ملازم کرتے ہیں سارا حساب کتاب۔''

ماسٹر نے قہقہہ مارا۔ ''کیا فٹ بات کہی ہے پیارے۔ خوش رہ۔''

پھر وہی گلیوں کا سفر تھا۔ کوارٹروں کے سینے میں اندر اُترتی گلیاں۔ ماسٹر نے برسوں سے...... بیس پچیس برسوں سے کبھی اسے گھر کے اندر آنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ ہر بار وہ اسی طرح چل پڑتے تھے۔ منظر نے کبھی اس کی بیوی کو نہیں دیکھا تھا۔ بچوں کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ ماسٹر کا ایک بیٹا ہے اور ایک بیٹی۔ بیٹا بجلی کمپنی میں ملازم ہو چکا تھا۔ بیٹی شاید بی اے کر چکی تھی۔ کبھی کبھی منظر کو یہ سب بہت عجیب لگتا تھا۔ چالیس

برس پرانے دوست، جو ایک دوسرے کے گھر والوں کی صورتوں سے آشنا نہ تھے۔

نیم دائرے میں گھومتی تپلی گلی ختم ہوئی تو صلاح الدین ایوبی ہوٹل آ گیا۔ دیوار پر ایک بہت بڑے فریم میں صلاح الدین ایوبی کا پوسٹر آویزاں تھا۔ گھوڑا، تلوار اور صلاح الدین ایوبیؒ۔ تصویر کے سارے رنگ اُڑ چکے تھے اور صلاح الدین ایوبی کی تلوار اَب ایک سرمئی ڈنڈے جیسی لگتی تھی۔ ساتھ ہی ایک پوسٹر شاہ رُخ خان کا تھا، ایک مادھوری دکشت کا۔ اور دو چھوٹے چھوٹے فریم۔ یہاں ملازمین کو روزانہ اُجرت دی جاتی ہے۔ ہوٹل میں بیٹھ کر سیاسی گفتگو کرنا منع ہے۔ کرسیاں وہی پرانی تھیں۔ اور میزیں بھی۔

کاؤنٹر کے پیچھے سے ایوب کالا نکل آیا۔ ''آؤ، آؤ، آج تو شہزادہ آیا ہے..... بڑے دن بعد شکل دکھائی ہے بھئی.....''

''بس یار، کام دھندے میں مصروف رہتے ہیں۔ کیا کریں.....''

ایوب کالا بولا۔ ''صحیح کہہ رہا ہے تُو... اس سسرے شہر میں ہر شخص پھنسا پڑا ہے۔ اور ٹُو تو پھر بھی سال چھ مہینے میں آ جاتا ہے۔ اپن تو نکل ہی نہیں پاتے ہیں اس کتّے کام سے۔ اچھا یہ بتا، کیا حال ہے؟ سنا ہے بڑا ٹاپ قسم کا ہوٹل بنالیا ہے تونے....؟ بڑا والا لونڈا بتا رہا تھا ایک دن۔ دوستوں کے ساتھ گیا تھا تیرے ہوٹل۔''

''کب؟'' منظر نے کہا۔

''دو تین مہینے پہلے۔ بتا رہا تھا، ایک سے ایک گاڑیوں کی لائنیں لگی رہتی ہیں۔ میں نے پوچھا، منظر چچا سے ملا کہ نہیں، تو ٹال گیا۔ بولا، وہ شاید تھے ہی نہیں۔ میں نے کہا، اَبے وہ تیری طرح نہیں ہے کہ اپنے ہوٹل پر نہ بیٹھے۔ یوں کہہ کہ تجھے شرم آ رہی تھی سلام کرتے ہوئے۔ خوب سنائیں سالے کو.....''

ماسٹر نے کہا..... ''زیادہ مت سنایا کر اولاد کو۔ کسی دن جواب مل گیا تو چھُٹی ہو جائے گی۔''

ایوب کالا ساکت کھڑا رہ گیا۔

ماسٹر ان ایکشن۔ منظر مسکرایا۔ سالا جملہ نہیں، بھالا مارتا ہے۔

کاؤنٹر کی طرف جاتے جاتے ایوب کالا دھیمی آواز میں بولا۔ ''تھوڑی بہت تو سنانی پڑتی ہیں یار......''

دور ایک میز پر کچھ مزدور ٹائپ لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ ان کے ساتھ والی میز پر تین لڑکے سر جوڑے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے اور کنکھیوں سے منظر کو دیکھ رہے تھے۔ منظر جانتا تھا، وہ کیا کہہ رہے ہوں گے۔ انھی کوارٹروں سے اُٹھ کر دولت مند بن جانے والا شخص، جو اپنے ماضی کو نہیں بھولا۔ اس کے ہوٹل اور اس کی گاڑی اور اس کی شان و شوکت کے بارے میں مبالغہ آمیز انکشافات۔ اَبے، چونتیس کے ایک میں رہتا تھا۔ دوسری والی گلی میں۔ ابا بتاتے ہیں پڑھائی میں بہت تیز تھا۔ ان کوارٹروں میں رہنے والے ہیروز کی تلاش میں رہتے تھے۔ مشہور لوگ، مقبول لوگ، جو کئی دن تک گفتگو کا موضوع بن سکیں۔ خود منظر کو آج تک بہت سے لوگ یاد تھے۔ ٹی وی کا اداکار ظہور احمد تھا جو اپنے بھائی سے ملنے آتا تھا۔ اور گلوکار ایم کلیم، جو ذرا آگے رہتا تھا۔ برسوں پہلے ایک

شام کرکٹر نذیر جونیئر نے ان کی پچ پر بالنگ کرائی تھی۔ سرخ گیند کی ناقابل یقین آف اسپن۔ پھر ریڈیو پاکستان کا وہ صداکار اور گلوکار تھا۔ صادق الاسلام۔ منظر کو سب لوگ یاد تھے۔ اور وہ جوش وخروش بھی، جو ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے سب چہروں پر رقص کرتا تھا۔

ماسٹر نے دو مسکا بند منگوائے۔ اور دودھ پتی۔

''مجھے پتا ہے۔'' ماسٹر نے کہا۔ ''تیری جان نکل رہی ہوگی مسکا بند دیکھ کر۔ تجھے اپنا کولیسٹرول یاد آ رہا ہوگا جس کی وجہ سے تو صبح دوپہر شام گھاس کھاتا رہتا ہے۔ پر جانِ من، یہ نرم، ملائم بند اور یہ نیوٹاؤن مکھن کی تہہ اور یہ گرم چائے..... اسے کھائے بغیر زندہ رہنا زندگی تو نہیں ہے۔''

منظر ہنسا۔ ''تیس سال پہلے تو کلیجی کے بارے میں یہی کہتا تھا۔ وہ جو توے پر بھون کر......''

''ابے ہاں۔'' ماسٹر نے کہا۔ ''وہ بھی طوفان ہوتی تھی یار.....''

''اور اس سے پہلے یعقوب بھائی کے گولے گنڈے کے بارے میں.....''

ماسٹر نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا۔ ''تجھے تو بیوی ہونا چاہیے تھا۔ اتنی پرانی پرانی باتیں پوری کمینگی کے ساتھ یاد رکھتا ہے تو۔ یا پھر تاریخ دان ہونا چاہیے تھا.....''

''تاریخ تجھے کبھی معاف نہیں کرے گی ماسٹر۔'' منظر نے کہا۔ ''تو نے میری زندگی کا پہلا کالا چشمہ توڑ دیا تھا۔ ماموں امریکہ سے لائے تھے وہ چشمہ۔''

''تیرے ماموں خالی ہاتھ آئے تھے امریکہ سے۔ بولٹن مارکیٹ سے خریدے تھے سارے تحفے انھوں نے۔ اور تاریخ تجھے بھی معاف نہیں کرے گی بیٹا۔ تو نے میرا نام ماسٹر رکھا تھا۔ تو جلتا تھا مجھے ہر وقت پڑھتا لکھتا دیکھ کر۔ آج ساری دنیا مجھے ماسٹر کہتی ہے۔ ایک اپر ڈویژن کلرک کو۔ گلی کے لونڈے ماسٹر صاحب کہہ کر سلام کرتے ہیں۔ اور مجھے اندھا مت سمجھ۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ تو میرے مسکا بند کا چھوٹا والا پیس کھا رہا ہے.....''

کوئی تازگی کی لہر تھی جو منظر کو شرابور کرتی جاتی تھی۔ مہینوں کا زنگ اُتارتی جاتی تھی۔ بے کیفی کا اور پژمردگی کا اور اُداسی کا زنگ۔ ایک مرجھایا ہوا پودا انگڑائی لے کر کوئی سرسبز چولا پہن رہا تھا۔ اس نے سر جھٹک کر قہقہہ لگایا۔ چھ سات ماہ کے دوران پہلا بھرپور قہقہہ۔

''اچھا۔ اَب بات بتا۔'' ماسٹر نے چائے کا گھونٹ لے کر کہا۔ ''کیا پریشانی لاحق ہے تجھے؟''

منظر دم بخود رہ گیا۔ پھر اس نے سنبھل کر کہا۔ ''ایسی کوئی خاص بات تو نہیں ہے.....''

ماسٹر نے کہا۔ ''دو طرح کی ہوتی ہیں پریشانیاں۔ ایک تو روزمرّہ کی پریشانی ہوتی ہے۔ جیسے میں پریشان ہوں کہ بجلی کا بل زیادہ آ گیا ہے، اس کی قسطیں کرانی ہیں۔ ڈپٹی ڈائریکٹر نے سالانہ انکریمنٹ رُکوا دی ہے۔ موٹر سائیکل کا پچھلا ٹائر بالکل ختم ہو چکا ہے۔ یا جیسے تو پریشان ہوتا ہوگا۔ ایکسائز والا زیادہ رشوت مانگ رہا ہے۔ ڈرائیور پیٹرول کی جعلی رسیدیں لا رہا ہے۔ بالٹی گوشت بنانے والا کاریگر بھاگ گیا ہے۔ یہ پریشانیاں تو عام پریشانیاں ہیں۔ ان پر ٹائم ضائع کرنا بے کار بات ہے۔ پر تیرا منہ بتا رہا ہے کہ معاملہ کوئی بمباٹ ٹائپ کا

ہے۔ ملا ہاتھ۔ صحیح کہہ رہا ہوں نا۔؟“

منظر کو دس برس پرانی بات یاد آئی۔ ماسٹر نے اس وقت بھی اس کے چہرے سے بھانپ لیا تھا کہ معاملہ سنگین ہے۔ خلع کا مطالبہ واقعی سنگین معاملہ تھا اور بات بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ ماسٹر نے اسے پسپا ہو جانے کا مشورہ دیا تھا جس پر منظر بھڑک اٹھا تھا۔ ماسٹر کی باتوں نے اس کے دل میں گہری خراشیں ڈال دی تھیں۔ اس نے کہا تھا، غلطی تیری ہے پیارے، تیرے انجن کی ٹیوننگ ایک دم آؤٹ ہے۔ تو غریب آدمی ہے جسے مقدر نے دولتمند بنا دیا ہے۔ اور وہ خاندانی امیر ہے جسے پیسہ بے دردی سے خرچ کرنے کی اور آزاد رہنے کی اور اپنی مرضی چلانے کی عادت ہوتی ہے۔ تو اب کوارٹر میں نہیں رہتا، تجھے ان پیسے والوں کے رنگ ڈھنگ سیکھنے ہوں گے کیوں کہ تجھے اب وہیں رہنا ہے۔ برداشت کرنے کی عادت ڈال، سمجھا؟ اور آنکھیں بند رکھنے کی بھی۔ ورنہ منہ کے بل گرے گا اور سب تالیاں بجائیں گے۔ اس بیوی کو چھوڑ دے گا تو دوسرا کیا آسمان سے لائے گا؟ وہ بھی ایسی ہی ہوگی۔ انھی بنگلوں سے آئے گی۔ اور بھی بہت کچھ کہا تھا ماسٹر نے۔ کڑوی باتیں۔ زہر میں بجھے جملے۔

ماسٹر نے کہا۔ ”کیا سوچ رہا ہے بے؟“

”سوچ رہا ہوں تو کتنا.....“

ماسٹر ہنسا۔ ”سب یار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یار کی نظر صرف نظر نہیں ہوتی پیارے۔ ایکسرے ہوتی ہے۔“

کبھی کبھی منظر کو ماسٹر کی باتوں پر حیرت ہوتی تھی۔ وہ بچپن سے ایسا ہی تھا۔ کھرا مگر دانش مند۔ یہ دانائی اس نے صرف زندگی سے حاصل نہیں کی تھی، اُن بوسیدہ، سیکنڈ ہینڈ کتابوں سے بھی جمع کی تھی جو ریگل چوک پر ہر چھٹی کے دن فروخت ہوتی تھیں۔ مقدر نے اسے ایک سرکاری محکمے کا یوڈی سی بنا دیا تھا اور تنگ دستی نے اسے سنبھلنے کا اور سکھ کا سانس لینے کا موقع ہی نہ دیا تھا مگر ماسٹر نے کبھی ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔

منظر نے کہا۔ ”مسئلہ ماہ نور کا ہے یار......“

ماسٹر اچھل پڑا۔ ”گڑیا کا؟ اسے کیا ہوا؟“

”ابے، کچھ نہیں ہوا اسے۔“ منظر نے کہا۔ ”بس، ٹینشن کھڑی کر رکھی ہے اس نے۔“

ماسٹر نے کہا۔ ”بیٹیاں تو ساری عمر کی ٹینشن ہوتی ہیں پیارے۔ جانتا ہے کیوں؟ کیوں کہ ہم ان سے محبت کرنا نہیں چھوڑتے۔ وہ شادیاں کر لیتی ہیں، بچوں کی مائیں بن جاتی ہیں، ان کے بچے جوان ہو جاتے ہیں، مگر سالی ٹینشن ختم نہیں ہوتی۔ خیر، تو بڑا ہوگا تو سب سمجھ جائے گا۔“

منظر نے جھنجھلا کر کہا۔ ”یار، تو تقریر کر لے پہلے....“

ماسٹر نے گھبرا کر دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”اچھا، میرے باپ...... اب نہیں بولوں گا...... چل، آگے بتا۔“

”وہ شادی کرنا چاہتی ہے۔“ منظر نے کہا۔ ”ابھی بیس سال کی بھی نہیں ہوئی ہے۔ ایک ہنگامہ کھڑا کر رکھا ہے اس نے گھر میں۔ تین دن سے کسی سہیلی کے گھر پر ہے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ گریجویشن کرے۔ پھر

سال دو سال کے لئے انگلینڈ چلی جائے اور ماسٹرز کرے۔ مگر اس کے دماغ پر شادی کا بھوت سوار ہے.....''

ماسٹر بالکل ساکت بیٹھا تھا۔ کسی پتھر کے بت کی طرح۔

منظر نے کہا۔ ''لڑکا اس کا کلاس فیلو ہے۔ چوڑی دار پاجامے جیسی پتلونیں پہنتا ہے۔ ہاتھوں میں رنگ برنگے کڑے۔ لپ اسٹک لگاتا ہے۔ ایک دم زنانہ۔ فیملی بہت پیسے والی ہے۔ باپ نے پچیس سال پہلے لائٹ ہاؤس پر دکان کھولی تھی۔ سمجھ رہا ہے نا؟ لنڈا بازار میں۔ پرانے کپڑے بیچتا تھا۔ اب بھی یہی کام چل رہا ہے لیکن بہت بڑے پیمانے پر۔ پورے پورے کنٹینرز آتے ہیں پرانے کپڑوں کے۔ ادھر حاجی کیمپ میں ان کے دو بہت بڑے وئیر ہاؤس ہیں۔ سارے مال کی چھانٹی ہوتی ہے۔ خراب مال کراچی کی مارکیٹ میں۔ اور ستھرا مال جاتا ہے بنکاک، ہانگ کانگ اور نہ جانے کہاں کہاں.....''

ماسٹر بدستور ساکت بیٹھا تھا۔

منظر نے کاؤنٹر کی جانب دیکھا اور اشارہ کیا۔ ذرا سی دیر میں ایک بچہ ان کے سامنے دو کپ چائے رکھ کر چلا گیا۔

ماسٹر بولا۔ ''بس؟ یا ابھی باقی ہے اسٹوری۔''

منظر نے گرم چائے کا گھونٹ بھر کر کہا۔ ''تو مجھے اچھی طرح جانتا ہے یار۔ میں کوئی تنگ دل، تنگ نظر باپ نہیں ہوں۔ مگر لبرل ہونے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ کوئی باپ اولاد کی.... اور پھر بیٹی کی دھمکیاں برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ.....''

ماسٹر نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ ''اسٹوری کو خواہ مخواہ پھیلانے کی کوشش نہ کر۔ میں سمجھ گیا ہوں تیری بات۔''

منظر کو ماسٹر کا لہجہ کچھ عجیب سا لگا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی جو کرختگی محسوس ہوتی تھی۔

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔

ماسٹر چھت کو دیکھتا رہا اور اپنی لمبی، سانولی انگلیوں سے میز پر طبلہ بجاتا رہا۔ یوں جیسے کہیں دور بجتی کوئی دھن سن رہا ہو۔ مگر منظر جانتا تھا کہ وہ کسی سوچ میں غرق تھا۔ یہ اس کا خاص انداز تھا۔

ہوٹل کے کچن سے ایک چھناکے کی آواز آئی۔ شاید برتن دھونے والے لڑکے نے کوئی کپ توڑ دیا تھا۔

کاؤنٹر پر بیٹھا ایوب کالا چلایا۔ ''توڑ دے۔ سارے برتن توڑ دے۔ تیری ماں جہیز میں لائی تھی نا۔ سب توڑ دے۔''

ماسٹر جیسے کسی گہری نیند سے بیدار ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ''دیکھ پیارے۔ کچھ باتیں تو تیری بالکل چریوں والی ہیں۔ چریا سمجھتا ہے نا؟ لڑکا زنانہ ٹائپ ہے تو کیا ہوا؟ آج کل یہی چل رہا ہے۔ بالیاں پہنتے ہیں لڑکے۔ اور چوڑیوں جیسے کڑے اور ایک دم ٹائٹ قمیض۔ بیوٹی پارلر جاتے ہیں۔ ٹائم بدل گیا ہے میری جان۔ یاد ہے تجھے، ہم لوگ بیل باٹم پتلونیں پہنا کرتے تھے۔ چوبیس انچ کا پائنچا۔ سالی پتلون غرارہ لگتی تھی لیکن ہم سارے

صلاح الدین ایوبی ہوٹل میں گزرنے والی اس نرم، روپہلی دوپہر میں، اس آشنا، جانے پہچانے ماحول میں اور پرانی یادوں کے رس میں لتھڑی اس خوشگوار ملاقات میں انھوں نے سوچا تھا۔

---------------O---------------

سات آٹھ ماہ بعد منظر نے پھر اس دروازے پر دستک دی۔ میلے، بدوضع پردے کی اوٹ میں چھپے دروازے پر۔

کچھ دیر بعد اندر سے وہی کرخت آواز آئی۔ ''کون ہے؟''

''وہ...... قیصر صاحب ہیں؟ میں منظر ہوں۔''

تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی۔ منظر کسی بدتہذیبی کا انتظار کرتا رہا۔

اندر سے کچھ گھسٹنے کی آوازیں آئیں جیسے کوئی کرسی یا کوئی پلنگ کھسکایا جارہا ہو۔ یا کچھ اور۔ منظر دل ہی دل میں مسکرایا۔ ہوسکتا ہے بیوی نے ماسٹر کو باندھ کر ڈال دیا ہو...... اور اَب اسے گھسیٹ کر دروازے تک لارہی ہو........

پھر کنڈی کھلنے کی آواز آئی۔ اور اس کے بعد دروازہ کھل گیا!

ماسٹر کی بیوی نے دروازے کی اوٹ سے کہا۔ ''اندر آجاؤ......''

ایک لمحے کیلیے منظر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اندر آجاؤ؟ کیا مطلب ہے......؟ اندر کیوں آجاؤ........؟ کیا...... کیا ماسٹر بیمار ہے......؟

ادھ کھلے دروازے سے اس نے ماسٹر کی بیوی کو چادر سنبھالتے، چپلیں گھسیٹتے، اندر جاتے دیکھا۔

اندر وہی بوتھی۔ ہوا سے اور دھوپ سے محروم گھروں کی بو۔ اور وہ بے ترتیبی بھی، جس کی منظر کو توقع تھی۔ دیواروں پر اور چھت پر سفیدی کی پپڑیاں جو رفتہ رفتہ ٹوٹ کر گرنے کے لیے تیار تھیں۔

منظر کسی مشینی آدمی کی طرح آہستہ آہستہ آگے چلتا گیا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم۔ ہر طرح کے احساس سے عاری۔ صحن کے بعد برآمدہ تھا جہاں دو تین کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اور آگے دو کمرے جو نیم تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ برآمدے کے کونے میں نل کے پاس میلے کپڑوں کا ڈھیر تھا۔ منظر آخری بار اس گھر کے اندر اس وقت آیا تھا جب ماسٹر کی اماں کا جنازہ اٹھایا جارہا تھا اور محلّے کی عورتیں زاروقطار رورہی تھیں۔

''قیصر.... کہاں ہے؟'' منظر نے پوچھا اور اپنی آواز کی کپکپاہٹ پر حیران ہوا۔

''وہ چلا گیا..... تمھارا ماسٹر .....'' ماسٹر کی بیوی نے کہا۔ وہی کرخت آواز۔ اس نے چادر کو یوں لپیٹ رکھا تھا کہ صرف اس کا سانولا چہرہ نظر آتا تھا۔ ''اَب تو چھ مہینے ہونے والے ہیں......''

''کہاں چلا گیا؟'' کسی اختیار کے بغیر منظر نے پوچھا۔

ماسٹر کی بیوی نے چلاّ کر کہا۔ ''کہاں چلے جاتے ہیں لوگ......؟ وہیں چلا گیا ہے وہ..... اتنی سیدھی سی بات تمھاری سمجھ میں نہیں آتی؟.... رانی کو مار کے چلا گیا ہے.... لالو کھیت کی کسی قبر میں جا کے سو گیا ہے سوّر کا

ہے کہ گڑیا شادی سے پہلے ماسٹرز کرے گی۔ بس، اس چھوٹی سی شرط پر اڑ جا۔ جانتا ہے، کیا فائدہ ہوگا اس سے؟''

''ہنگامہ دو تین سال کے لیے ٹل جائے گا۔'' منظر نے سوچتے ہوئے کہا۔

ماسٹر ہنسا۔ ''عقل کے گھوڑے، اس سے بھی بڑا فائدہ ہوگا۔ دو تین سال میں گڑیا تھوڑی اور سمجھ دار ہو جائے گی۔ ظالم باپ کی مخالفت ختم ہوگی تو وہ اپنی اانکھوں پر لگا ضد کا چشمہ اتار دے گی۔ جوانی میں سب اڑیل گھوڑے ہوتے ہیں میری جان۔ اپن بھی ایسے ہی تھے۔ سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اور دو تین سال میں تو دنیا بدل جاتی ہے۔ گڑیا پڑھے گی تو اس کی آنکھیں کھلیں گی۔ وہ بے شمار لوگوں سے ملے گی۔ سمجھ رہا ہے نا؟ ابھی وہ بس اس لونڈے کو دیکھ رہی ہے۔ تیرا کام ہے اسے دائیں، بائیں، اوپر، نیچے دیکھنے کے قابل بنانا۔ بغیر لفڑا کیے یہ سمجھانا کہ دنیا بہت بڑی ہے۔ تو جانتا ہے نا، کہ ان کوارٹروں کے آگے بھی زندگی ہے۔ صاف ستھرے علاقے ہیں اور بنگلے ہیں اور لشکارے مارتی گاڑیاں ہیں۔ اور ان سے بھی آگے دبئی ہے اور امریکا ہے اور نہ جانے کیا کیا ہے۔ یہ سب کیسے پتا چلا تجھے؟ تو اس کنوئیں سے نکلا تبھی پتا چلا نا؟ گڑیا بھی نکل جائے گی اپنے کنوئیں سے۔ تھوڑا ٹائم دے اُسے۔ اور لسی پینا شروع کر، تاکہ تیرے دماغ کی گرمی کم ہو سمجھا؟''

منظر نے سر کھجا کر کہا۔ ''ویسے میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا کہ......''

ماسٹر نے کہا۔ ''ابے تو کیا، تیرا پورا خاندان یہ نہیں سوچ سکتا۔ ایک ایک کو جانتا ہوں میں۔''

باہر دھوپ ڈھلنی شروع ہو گئی تھی۔

منظر نے کہا۔ ''ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ میں کبھی بھی اس طرح نہیں سوچ سکتا تھا۔ آدمی اپنی زندگی کو، اپنے فیصلوں کو غیر جانب داری سے نہیں دیکھ سکتا۔''

ماسٹر نے ایک انگرائی لی، انگلیاں چٹخائیں اور بولا۔ ''کیوں کہ تو ایک گھامڑ آدمی ہے لہٰذا تو کبھی نہیں پوچھے گا کہ پیارے بھائی، وہ دوسری واردات کیا تھی؟ لہٰذا میں خود ہی بتا دیتا ہوں تجھے۔ دوسری واردات یہ ہے کہ اگر دو تین سال بعد بھی گڑیا اپنے مطالبے پر قائم رہے اور وہ لونڈا بھی ڈٹا رہے تو تجھے وہ کرنا ہے جو ہر عقلمند باپ کرتا ہے..... یعنی ان دونوں کی شادی!''

''شادی؟'' منظر نے کہا۔ ''مگر.....''

''ہاں بیٹا، شادی۔'' ماسٹر نے کہا۔ ''تین سال بعد تجھے پورا ڈرامہ کرنا ہوگا، اتنی خوشی کا اظہار کرنا ہوگا کہ سب حیران رہ جائیں۔ گڑیا بھی اور تیری بیوی بھی اور دونوں خاندان بھی۔ سمجھ رہا ہے نا؟ کوئی پنگا نہیں کرنا ہے۔ پنگا کرے گا تو تیرا انجام وہی ہوگا جو پشتو فلموں میں وِلن کا ہوتا ہے۔ باپ کو زندگانی ایسے ہی گزارنی ہوتی ہے شہزادے، ٹوپی ڈرامہ چلائے رکھنا ہوتا ہے۔ تو پی ڈرامہ سمجھتا ہے نا؟ اولاد کو خوش رکھنا پڑتا ہے۔ ہر وقت مسکرانا پڑتا ہے۔ اکا دکا کوششیں کر لیتا ہے آدمی اور بس۔ کوئی گڑیا سمجھ جاتی ہے، کوئی نہیں سمجھتی۔ آدمی سالا کیا کر سکتا ہے؟''

منظر کے دل میں کچھ کہنے کی آرزو بہت شدید تھی مگر اس نے کچھ نہ کہا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ماسٹر بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ اندر بھڑکتی اشتعال کی آگ بالآخر بجھ جائے گی۔ تب شاید سب کچھ اسی طرح ہوگا جیسا

شہر میں اکڑ کر پھرتے تھے۔ پھر جینز آ گئی تھی۔ اپن اسی لائٹ ہاؤس سے خریدتے تھے۔ ہاتھ پیر پھولے ہوئے ہوتے تھے کہ کوئی جاننے والا نہ دیکھ لے۔ تیرے ابا نے تو ایک دفعہ تیری جینز اور پرنٹڈ قمیضوں کو آگ بھی لگائی تھی.....''

''ہاں، ہاں، آگے بول۔'' منظر نے کہا۔ ''داستانیں سنانے بیٹھ جاتا ہے سالا۔''

ماسٹر ہنسا۔ ''برا لگ رہا ہے نا؟ گڈ۔ بلکہ ویری گڈ۔ دل خوش ہو گیا۔ اچھا، دوسری بات یہ ہے کہ اگر لڑکے کا باپ پہلے لنڈے کے کپڑے بیچتا تھا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے، آج کروڑ پتی تو بن گیا ہے نا۔ اور تو خود کیا تھا؟ تیرے گھر میں اتوار کے اتوار گوشت پکتا تھا۔ کالج میں تیرے پاس فیس کے پیسے نہیں ہوتے تھے۔ ناولٹی سینما میں سب سے اگلی سیٹوں پر بیٹھ کر فلمیں دیکھتا تھا تو۔ یاد ہے نا؟ یا بھول گیا ہے؟''

منظر خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔

ماسٹر نے اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارنے کی کوشش کی، گردن کھجائی اور بولا۔ ''تو نے بتایا نہیں لیکن میں سمجھ گیا ہوں کہ تو نے گھر میں لفڑا کیا ہے۔ لفڑا سمجھتا ہے نا؟ اسٹوری تو یہ سنا رہا ہے کہ گڑیا نے گھر میں ہنگامہ کر رکھا ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ ہنگامہ خود تو نے کیا ہے۔ ابے تو سمجھتا کیوں نہیں ہے؟ وہاں نہیں چلتی یہ مار دھاڑ، چیخ پکار۔ یہاں کوارٹروں میں ٹھیک ہے.....''

منظر نے بیزاری سے کہا۔ ''پھر؟''

ماسٹر نے ٹھنڈی ہو جانے والی چائے کا ایک بڑا گھونٹ لیا اور بولا۔ ''پھر یہ کہ تجھے عقل سے کام لینا ہوگا۔ اب یہ مت پوچھنے بیٹھ جائیو کہ عقل کہاں سے آئے گی۔ دیکھ، گڑیا ابھی غصے میں ہے اور ناسمجھ ہے۔ لیکن وہ جوان بھی ہے اور... اور بیٹی بھی ہے! باپ کے لیے سب سے مشکل کام بیٹی کو سنبھالنا ہوتا ہے۔ جانتا ہے کیوں؟ کیونکہ بیٹی میں اُس کی جان ہوتی ہے۔ سالا اتنی محبت کرتا ہے بیٹی سے کہ عقل سے بالکل پیدل ہو جاتا ہے۔ دنیا کو اپنی انگلیوں پر نچاتا ہے مگر بیٹی کی بات آ جائے بیچ میں تو خچر کی طرح ہنہنانے لگتا ہے، دولتیاں جھاڑنے لگتا ہے۔ سچی بات بتاؤں؟ تیرا یہ جو چہرہ ہے نا، یہ تھوڑا تھوڑا خچر جیسا ہو گیا ہے.....''

منظر نے جسم و جاں کی پوری قوت کے ساتھ پھٹ پڑنے کی خواہش پر قابو پایا اور کرسی سے ٹیک لگائے خاموش بیٹھا رہا۔ ماسٹر کو سیدھے راستے پر رکھنے کے لیے اس سے اچھی تکنیک کوئی نہیں تھی۔

ماسٹر مسکرایا۔ یوں، جیسے مقابلہ کرنے والے کسی اچھے کھلاڑی کو داد دے رہا ہو۔ پھر اس نے کہا۔ ''دو کام بتاتا ہوں تجھے۔ سمجھ لے، دو وارداتیں کرنی ہیں۔ پہلے ایک واردات۔ پھر دوسری۔ سمجھ رہا ہے نا؟''

منظر نے سر ہلایا۔

ماسٹر نے کہا ''پہلی واردات تو آج ہی کر ڈال۔ گھر جا کر بیوی سے کہہ کہ تجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ ایک دم یوداس والی ایکٹنگ چاہیے۔ سمجھا؟ پھر بیوی کو ساتھ لے کر گڑیا کے پاس جا۔ آج رات ہونے سے پہلے پہلے گڑیا کو گھر میں ہونا چاہیے۔ دونوں کو بتا دے کہ تجھے شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ شرط صرف یہ

بچہ..... ''وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

منظر کو محسوس ہو رہا تھا کہ زمین شق ہوتی جا رہی ہے اور وہ کرسی سمیت اندر دھنستا جا رہا ہے۔ کوئی بھنور تھا جو ایک جنونی رفتار سے اسے گھمائے جا رہا تھا، گھمائے جا رہا تھا......

نہ جانے ماسٹر کی بیوی نے خود پر کب قابو پایا تھا۔ نہ جانے وہ خود سوچنے سمجھنے کے قابل کب ہوا تھا۔ منظر کو بس یہ یاد تھا کہ وہ ہلنے جلنے کی قوت سے محروم بدن کے ساتھ کرسی پر ترچھا پڑا ہوا تھا اور اس کا سر پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔

ماسٹر کی بیوی چادر لپیٹے سامنے بیٹھی تھی مگر اس کی آواز جیسے کہیں دور سے آ رہی تھی۔'' .... میں نے اس سے کہا تھا کہ رشتہ برا نہیں ہے.... لڑکا درزی کے پاس کام کرتا ہے تو کیا ہوا....... کل اپنی دکان کھول لے گا....... پھر رانی کو بھی پسند تھا وہ لڑکا....... مگر ماسٹر کہنے لگا، بی اے پاس بیٹی کو میٹرک پاس سے بیاہ دوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے...... ابھی جلدی کیا ہے...... رانی کو ڈانٹا اس نے...... کہنے لگا، جس دن وہ اپنی دکان کھول لے گا، اس دن بات کرنا.... اس سے پہلے نہیں.... بات تو خیر ٹھیک تھی۔ میں نے بھی اس رات یہی سوچا تھا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ لیکن رانی نے کچھ اور ہی سوچ لیا تھا۔ میں فجر میں اٹھی تو رانی کی..... رانی کی لاش پنکھے سے لٹک رہی تھی اور..... ''وہ چادر میں منہ چھپا کر پھر رونے لگی......

منظر نے سر جھٹک کر دماغ پر چھائی دھند کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ اُسے یہ سب کچھ غیر حقیقی لگ رہا تھا۔ جیسے ابھی آنکھ کھل جائے گی۔ جیسے ابھی ماسٹر کی بیوی اور یہ بوسیدہ گھر اور یہ پورا نظارہ پلک جھپکتے میں غائب ہو جائے گا۔

ماسٹر کی بیوی نے خود پر قابو پا کر کہا۔ ''میں پاگلوں کی طرح پچھاڑیں کھا رہی تھی، چلا رہی تھی...... میرے بیٹے کا بھی برا حال تھا...... مگر وہ چپ تھا.... تمہارا ماسٹر..... میں نے اسے بھی گالیاں دیں...... گھر میں لوگ بھرے ہوئے تھے...... مجھے عورتیں گھسیٹ کر دوسرے کمرے میں لے آئیں..... پولیس آ گئی تھی...... محلے والوں نے ہی سب کچھ بھگتا..... ''

آہستہ آہستہ منظر کے بدن میں دوڑتی سنسناہٹ کم ہوتی جا رہی تھی۔ اعصاب قابو میں آتے جا رہے تھے۔ لیکن ایک تھکن تھی جس نے اسے بدستور جکڑ رکھا تھا۔

ماسٹر کی بیوی کے چہرے پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں اور آنکھوں میں زندگی کی سب سے بڑی ہار کا اعتراف۔

منظر نے کہا۔ ''اور...... ماسٹر...... ؟''

ماسٹر کی بیوی نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''دو دن رہ سکا وہ...... میں بے غیرت تھی، جھیل گئی..... مگر اس کو بیٹی کا دکھ لے گیا..... سانس کا اٹیک ہو گیا تھا اسے.... منہ کھول کھول کر سانس لیتا تھا اور اس کے سینے میں سے ایسی آوازیں آتی تھیں کہ بس..... ڈاکٹروں نے ٹیکے بھی لگائے ..... دم والا پانی بھی منگوایا

میں نے...... مگر اُس کی حالت بگڑتی گئی...... آخر میں تو دماغ پلٹ گیا تھا اس کا...... ہنسنے لگا تھا زور زور سے
...... چھت کو دیکھ کر کہنے لگا تھا، مولا، پہلی واردات ہی غلط کرادی...... بار بار کہتا رہا یہی...... میں سمجھ گئی تھی کہ
اَب وہ بچے گا نہیں...... پھر وہ...... پھر وہ......"

منظر اُس کی ہچکیاں سنتا رہا اور خاموش بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھوں میں ماسٹر کا چہرہ تھا اور اُس کے دامن
میں ہزاروں لاکھوں یادیں تھیں اور اُس کے سامنے برباد ہو جانے والا یہ گھر تھا۔

نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ پانچ، دس منٹ۔ یا آدھا گھنٹہ۔

ماسٹر کی بیوی نے چونک کر کہا۔ "معاف کرنا.... میں چاے...."

منظر نے ہاتھ کے اِشارے سے اُسے روک دیا۔ "نہیں......"

ماسٹر کی بیوی نے کہا۔ "بیٹے نے فون کیا تھا تمھارے ہوٹل کے نمبر پر...... سوئم کے بعد...... میں
نے ہی ڈھونڈ کر نکالے تھے کچھ نمبر...... وہ تمھارا بہت ذکر کرتا تھا...... شاید تم تک خبر نہیں پہنچی......"

منظر اچانک اُٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ کارڈ بیٹے کو دے دینا۔" منظر نے اپنا کارڈ بڑھایا۔ "کسی بھی دن آجائے۔ مجھ سے مل لے۔ مجھے
آنے میں بہت دیر ہوگئی، مگر خیر...... ٹھیک ہو جائے گا...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

دور سڑک پر کھڑی کار کے مؤدب ڈرائیور نے اس کے لیے دروازہ کھولا۔

منظر نے کہا۔ "تم گاڑی لے جاؤ۔ میں آجاؤں گا۔"

ڈرائیور کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ "آپ کیسے آجائیں گے سر؟"

منظر نے گرج کر کہا۔ "دفع ہو جاؤ...... اس گاڑی سمیت میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔"

ڈرائیور ہڑبڑا کر کار میں بیٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے کار نظروں سے اُوجھل ہوگئی۔

منظر کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔

پھر اس نے جہانگیر روڈ کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

تھلّوں پر سیمنٹ کے بلاک بنانے والے مزدوروں اور انکوائری آفس کے درختوں تلے کھیلتے میلے
کچیلے بچّوں اور مٹھائی کی دکان پر سیاہ تیل میں سموسے تلتے کاریگروں اور موتی مسجد میں داخل ہوتے متقی نمازیوں
میں سے کسی کو خبر نہ تھی کہ ان کے درمیان سے ایک شکستہ شخص گزر رہا ہے جس کی آنکھوں سے آنسو آہستہ آہستہ بہتے
جاتے ہیں اور جس کا دل دُکھ سے لبالب بھرا ہوا ہے اور جس کا ماسٹر، اُس کے ساتھ ہاتھ کر گیا ہے۔

........☆........

عاقبت

● یاسین احمد

اخبارات کا مطالعہ باقاعدگی سے کرنے والے دو طبقے کے لوگ ہوتے ہیں۔ایک طبقہ وہ ہے جو زندگی کے اعلیٰ شعبوں سے جڑا رہتا ہے۔جن کی تقدیر میں راوی نے چین ہی چین لکھ دیا ہے۔دوسرا طبقہ وہ ہے جو مفلوک الحال ہے لیکن پڑھا لکھا ہے۔اپنی زندگی کی گاڑی صحیح ٹریک پر لانے کے لیے جدوجہد کرتا رہتا ہے۔

نعیم کا تعلق دوسرے طبقے سے تھا۔دن میں جتنے اخبار ہاتھ لگتے ،چاٹ جاتا۔موجودہ عہد کی اس سیاست سے نفرت تھی جو ویشیا کے چکلے سے بھی زیادہ بدتر ہو چکی تھی۔اس لیے سیاسی خبروں پر سرسری نظر ڈال کر آگے بڑھ جاتا۔ایسے کھیلوں کی خبروں سے بھی اُنسیت نہیں تھی جن کو دُنیا کی بڑی طاقتوں نے افیون کی گولیوں کی طرح ایشیائی ممالک کو پلا دیا ہے اور نتیجہ میں عوام کے خون پسینے کی کمائی مٹھی بھر افراد کی جیبوں میں چلی جا رہی تھی۔

اس کی نظر 'ضرورت ہے' کے کالم میں بھٹکتی رہتی۔لیکن مطلوبہ چیز ہاتھ نہ لگی۔اخبارات کے یہ کالم زیادہ تر لڑکا یا لڑکی کے پیامات سے بھرے رہتے یا پھر قوتِ باہ میں اضافہ کرنے والی دواؤں کے اشتہارات سے۔ Penis کی لمبائی بڑھائے' پہلی ہی خوراک میں اپنے آپ پر قابو پانا مشکل' خلوت میں شرمندگی سے بچئے' جیسے اشتہارات پڑھ کر اُس کا موڈ بگڑ جاتا۔دماغ میں کڑواہٹ سی پھیل جاتی۔جی چاہتا کہ اخبار کے پرزہ پرزہ کر کے پھینک دے۔

اس نے حفظ کیا تھا۔کئی سال تک جس علم کو سخت محنت کر کے حاصل کیا تھا اُس کو کام میں لانا چاہتا تھا۔اس لیے نظر کو ہمیشہ ایسے اشتہارات کی تلاش رہتی تھی جہاں اُس کی ضرورت نکل سکتی تھی۔کوئی اچھے بڑے مدرسہ کے طلباء یا پھر کوئی صاحبِ ثروت خاندان کے افراد جو قرآن پڑھنے کے خواہش مند ہوں۔کئی ماہ گزر گئے

اور کوئی اشتہار نظر سے نہیں گزرا۔

رمضان کا مہینہ آیا تو ایک مسجد کی کمیٹی والوں نے تراویح پڑھانے کی پیشکش کی تھی۔ وہ کمیٹی والوں سے معاوضہ کے بارے میں کچھ پوچھے بغیر تراویح پڑھانے کے لیے راضی ہوگیا۔ پہلا موقع تھا' پہلا تجربہ۔ جو روح پرور تھا اور سُرور انگیز بھی۔ اُس نے بڑی یکسوئی اور عقیدت سے یہ کام انجام دیا۔ نمازِ عشا اور تراویح پڑھا کر گھر آنے تک گیارہ اور کبھی ساڑھے گیارہ بج جاتے۔ دو تین گھنٹوں کی کچی پکی نیند مشکل سے ملتی اور پھر سحری کے لیے اُٹھ جاتا۔ سارا رمضان نیم شبی رت جگوں میں گزرا۔ اعصاب پر ایک بوجھ' ایک تھکن طاری رہتی لیکن دل و دماغ ایک غیر معمولی سرور انگیز کیفیت سے سرشار رہتے۔ ہلال کے دکھائی دینے سے دو دن قبل کمیٹی والوں نے اُس کی گلپوشی کی۔ پھولوں کا ایک پتلا سا ہار اُس کے گلے میں ڈال کر ایک بند لفافہ اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ محلّے کے ایک دولت مند بزرگ نے ایک سستی سی شال اس پر اوڑھا کر اُس کے ہاتھوں کو چوم لیا۔ تب اس کا سارا وجود جوش و عقیدت کے گہرے ساگر میں ڈوب سا گیا۔

اسی سرشاری کے عالم میں وہ گھر پہنچا۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ زندگی کی پہلی کمائی کے بند لفافے کو کھولا' جیسے یہ لفافہ نہیں علی بابا کے خزانے کا دروازہ ہو۔ لیکن فوراً اُس پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ ساری اُمیدیں آبی بلبلے کی طرح فنا ہوگئیں۔ لفافہ میں ہزار کے دو نوٹ اور ایک پانچ سو روپے کا نوٹ رکھا ہوا تھا یعنی ڈھائی ہزار روپے۔ زندگی کی پہلی کمائی.... ایک ماہ کی محنت کا معاوضہ.....!

وہ بجھ سا گیا۔

لیکن اس کا باپ اس کمائی پر مسرور تھا۔ ''تم کو ایسی بیش بہا دولت مل گئی ہے جس کی حفاظت کے لیے کسی بینک' کسی سیفٹی لاکر یا تجوری کی ضرورت نہیں۔ روزِ محشر تم کو اس دولت کا اندازہ ہوگا۔ تمھاری عاقبت سنور گئی ہے۔''

وہ حیرانی سے اپنے دولت مند باپ کا چہرہ تکتا رہا۔ جس کے پاس دو ڈھائی ہزار روپے کی کبھی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ اتنی رقم تو وہ اپنے دوستوں کے ساتھ لنچ یا ڈنر پر صرف کر دیتا تھا اور ماتھے پر بل تک نہیں آتا۔ لیکن اس ڈھائی ہزار رقم پر ایسے خوشی کا اظہار کر رہا تھا جیسے کوئی بہت بڑا خزانہ مل گیا ہو۔ اُس دن پہلی بار....... زندگی میں پہلی بار اپنے والد پر غصہ تو نہیں آیا تھا لیکن رنج و ملال کا شدید احساس لئے اس نے سوچا تھا کہ والدین نے حافظ بنانے کے لئے اس کا انتخاب کیوں کیا تھا؟ وہ سب سے چھوٹا تھا۔ آخری نمبر....... اُس سے بڑے دو اور بھائی بھی تھے!

والدین نے پہلے بیٹے کو ایل ایل بی کرایا تھا۔ وکالت کی ڈگری لینے کے بعد بڑے بھائی نے کامیابی کے زینے بڑی تیزی سے طے کیے تھے۔ آج اس کا شمار ہائی کورٹ کے ٹاپ وکلاء میں ہوتا تھا۔ اُن کی رہائش گاہ کے ایک حصے میں بڑے بھائی کا بہت بڑا خوبصورت دفتر تھا۔ جہاں تین تین جونیئر وکیل اُس کی ماتحتی میں کام کرتے تھے۔ موکلوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ اس کے قانونی مشورے کی فیس ۵ بلکہ ۵ ہندسوں سے زائد تھی۔

دوسرے بھائی نے انجینئرنگ کی تھی۔ایک بہت بڑی کمپنی میں ملازم تھا۔معقول تنخواہ اور دُنیا بھر کی سہولتیں ...اور وہ...وہ خاندان کا پہلا حافظِ قرآن تھا۔خاندان کے بیشتر افراد تو تجارت سے وابستہ رہے۔میٹرک پاس کرنے کے بعد اس کے والدین نے اس کو اعلیٰ تعلیم دلائی اور نہ کوئی پروفیشنل کورس کرایا۔نعیم کو وہ دن خوب یاد تھا جب باپ نے اُس کو ایک دینی مدرسہ میں داخل کرایا تھا۔تب اُس نے کہا تھا۔'' بیٹے پچھلی کئی پشتوں سے ہمارے خاندان میں کوئی حافظ نہیں بنا۔میری خواہش ہے کہ تم حفظ کرو۔ہم سب کی بخشش ہوجائے گی۔''

سعادت مندی کا تقاضہ ہے کہ اولاد باپ کی خواہش پر لبیک کہے۔چنانچہ اس نے سرِ تسلیم خم کردیا۔باپ نے جو راہ اُس کے لئے چنی تھی اُس پر چل نکلا تھا۔حالانکہ یہ راہ آسان نہیں تھی۔قدم قدم پر دشواریاں تھیں۔پیچیدگیاں تھیں لیکن اب اس راہ کو چھوڑنا بھی ممکن نہیں تھا۔حفظ کی تعلیم سے فارغ ہوکر چار سال بیت گئے تھے۔عمر کی ۲۵ ویں منزل پر پہنچ چکا تھا۔اب تک اُس کو مناسب اور مستقبل کمائی کی صورت نظر نہیں آتی تھی حالانکہ ماں باپ کو اس کی بے کاری پر مطلق تشویش نہیں تھی۔ان کے ہاں اتنی دولت تھی کہ اپنے بیٹے کی زندگی کو بہتر طریقے پر سنوار سکتے تھے۔لیکن نعیم خود مکتفی ہونے کے لئے ہمیشہ فکرمند رہتا۔اپنی محنت کی کمائی شادی اور ہونے والے بچوں پر صرف کرنا چاہتا تھا۔کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرنا اس کی اَنا کے خلاف تھا۔

گھر کے سارے افراد اُس کو عزیز رکھتے تھے۔اگر اشارتاً بھی بڑے بھائی کے سامنے اپنی کسی ضرورت کا اظہار کرتا تو وہ اُس پر ہزاروں روپے خرچ کرنے پر آمادہ ہوجاتا لیکن اس نے کبھی اپنے بھائی سے ایک روپیہ بھی نہیں مانگا۔پاکٹ منی کے نام پر جو پیسے والدین سے مل جاتے اُسی میں اپنی ضرورتیں مکمل کرلیتا۔یوں بھی اُس کی ضرورتیں کیا تھیں۔ہر قسم کے لہو و لعب سے کوسوں دور تھا۔سگریٹ، بیڑی، ہوٹل، سنیما اور دیگر تفریحات اس کے لئے شجرِ ممنوعہ کا درجہ رکھتی تھیں۔دوستوں کا حلقہ بھی بہت محدود تھا۔بس تین چار دوست ...جن کی سوچیں؛ جن کی بھاگ دوڑ بھی بہت محدود تھیں۔اُس کی طرح ایک مخصوص دائرے میں محصور......!

طالب علمی کے زمانے میں باپ نے ایک ویسپا دلائی تھی جو آج تک ایک وفا شعار بیوی کی طرح اُس کا ساتھ دے رہی تھی۔وقتاً فوقتاً وہ روٹھ بھی جاتی تھی۔کبھی کلچ پلیٹ کی کمر ٹوٹ جاتی تو کبھی ہینڈل صدائے احتجاج بلند کرتا' کبھی پلگ میں کاربن آجاتا تو کبھی ہیڈ لیمپ بینائی سے محروم ہوجاتا لیکن یہ سب Minor Work کے زمرے میں آتا تھا۔تھوڑا بہت روپیہ خرچ کرنے پر جس کی مرمت ہوجاتی اور وہ پھر سے سڑک پر دوڑنے لگتی۔گھر کے افراد اس کی اس ویسپا سے نالاں تھے۔

ایک دفعہ بڑے بھائی نے اپنی نئے ماڈل کی کار i-20 کی چابی اُس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔''اس کھٹارا کو کسی کباڑے کے حوالے کرو اور اس کار کو استعمال میں لاؤ۔''

بھائی کی محبت کو وہ سمجھتا تھا۔لیکن کسی پر بار ہونا نہیں چاہتا تھا۔بڑی خوبصورتی سے اس نے کار کی چابی لینے سے انکار کردیا تھا۔کبھی کبھی بڑے بھائی کو احساس ہوتا تھا کہ نعیم کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔اگر اس کو دینی

تعلیم کے ساتھ ساتھ دُنیا کی تعلیم بھی دلادی جاتی تو آج اس کی حیثیت ایک کھوٹے سکّہ کی مانند نہ ہوتی۔ ایک دن بڑے بھائی نے ایک امیر آدمی کا وزیٹنگ کارڈ اُس کے حوالے کرتے ہوئے کہا: ''یہ شہر کا امیر ترین آدمی ہے۔ اس کی پراپرٹی کے کئی مقدمے میں دیکھ رہا ہوں۔ وہ اپنے بیٹوں کو قرآن پڑھنا چاہتا ہے۔''

نعیم وزیٹنگ کارڈ دیکھ کر نہال ہو گیا۔ مہینوں سے جس گھڑی کا انتظار تھا شاید اب وہ آچکی تھی؟ اس کی بھاگ دوڑ رائیگاں گئی تھی مگر بڑے بھائی کا پروفیشن کام میں آیا تھا۔

اتوار کے روز وہ وزیٹنگ کارڈ پر درج کیئے ہوئے پتہ پر پہنچ گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ رات بھر کی بارش نے صبح کے چہرے کو دھو دھلا کر شاداب بنا دیا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو یہ سہانے لمحے دوستوں کی صحبت میں گزارتا لیکن وہ اپنی تقدیر کے دانے چگنے کی جستجو میں نکل گیا تھا۔ وہ امیر آدمی کی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ رہائش گاہ کیا تھی۔ اچھی خاصی حویلی تھی۔ امیر آدمی تک رسائی حاصل کرنے کے لئے دو ملازمین نے رہنمائی کی تھی۔ ایک مہذب ملازمہ اُس کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اندر چلی گئی۔

پہلے چاے اور اسنیکس سے بھری ہوئی ٹرے آئی پھر وہ امیر آدمی نمودار ہوا۔ ایک خوبصورت سے گاون میں ملبوس۔ گاون کے اوپری حصے سے بالوں سے بھرا ہوا سینہ نمایاں تھا۔ خضاب زدہ بال سلیقے سے جمے ہوئے تھے۔ نعیم نے سلام کرنے میں پہل کی تھی۔ اس نے نعیم کے سراپے پر نظر دوڑائی اور پھر مسکرایا: ''آپ وکیل صاحب کے حقیقی بھائی ہیں؟ یقین نہیں آتا۔ دونوں میں بہت فرق ہے... زمین آسمان کا.....''

نعیم زیرلب مسکرادیا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ امیر آدمی نے یہ فقرہ کیوں کسا تھا۔ اُس نے یہ نہیں پوچھا کہ کون زمین ہے اور کون آسمان....؟

''بھائی صاحب کہہ رہے کہ آپ اپنے بچّوں کو قرآن پڑھانا چاہتے ہیں۔ حافظِ قرآن بنانے کا بھی ارادہ ہے!''

''ہاں'' امیر آدمی پھیل کر صوفے میں مزید دھنس گیا۔ ''اپنے ایک لڑکے کو حافظ بنانے کا ارادہ ہے۔ میں ان کو کسی مدرسہ میں شریک کرنا نہیں چاہتا۔ وہاں کا ماحول.... وہاں کا ماحول مجھ کو پسند نہیں....''

''جی، بہتر ہے۔'' نعیم نے مختصراً کہا اور خاموش رہا۔

امیر آدمی بولا۔ ''میرے دو لڑکے ہیں۔ دونوں کو قرآن پڑھانا ہے۔ ایک لڑکے کو حفظ کرنا ہے اس کا فیصلہ آپ کریں، جو ذہین ہے اُس کو حفظ کرائیے۔ لیکن آپ زیادہ سے زیادہ وقت دیں۔ کم از کم دو گھنٹے...''

''ایسا ہی ہوگا۔'' اس نے جواباً کہا۔ اس پر اضطراری کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ زندگی میں ایک دفعہ خاموش رہ کر اس کا انجام دیکھ لیا تھا۔ ایک ماہ کی محنت کا معاوضہ ڈھائی ہزار روپے ملے تھے اب مزید کوئی تجربہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے پوچھا: ''آپ کیا فیس دیں گے!''

''فیس؟'' امیر آدمی نے حیرت سے اس لفظ کو دہرا کر قہقہہ لگایا۔ جیسے اس نے کوئی احمقانہ بات کہہ

دی ہو۔''میں سنتا آیا ہوں کہ بہتر مومن وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔ میں سمجھا شاید آپ اسی پر عمل پیرا ہیں۔''

کچھ لمحے خاموش رہ کر امیر آدمی ہنسنے لگا۔''ارے بھئی آپ ایک وکیل کے بھائی ہیں فیس کا طلب کرنا خاندانی عادت ہے۔'' پھر وہ سنجیدہ ہو کر بولا: ''میں آپ کو تین ہزار روپے ماہانہ دیا کروں گا۔''

نعیم کے منھ سے کوئی لفظ نہیں نکل سکا۔ دو بیٹے، دو گھنٹے اور فیس تین ہزار روپے... اگر دو ہزار بھی کہہ دیتا تو وہ کیا بگاڑ لیتا۔ نعیم کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ عین اسی وقت ڈرائنگ روم کا بیرونی دروازہ کھول کر اندر ایک آدمی داخل ہوا اور بولا۔''ساب کار تیار ہے!''

نعیم نے اس آدمی کی طرف دیکھا۔ ہیئت سے ہی ڈرائیور معلوم ہو رہا تھا۔ امیر آدمی نے اس کو پانچ منٹ رکنے کا اشارہ کیا اور پھر سوالیہ نگاہوں سے نعیم کو دیکھنے لگا۔ نعیم کا موڈ بگڑتا جا رہا تھا۔ اس نے پوچھا: ''آپ ڈرائیور کو کیا تنخواہ دیتے ہیں؟''

امیر آدمی خشمگیں نگاہوں سے نعیم کو گھورنے لگا۔ وہ بولا۔''وہ میرا پرسنل ڈرائیور ہے۔ دس ہزار روپے ماہانہ تنخواہ دیتا ہوں۔ سال میں دو بونس اور یونیفارم...''

نعیم کو وہاں بیٹھے رہنا دوبھر لگ رہا تھا۔ نرم نرم گدے دار صوفہ، جس میں وہ کمر تک دھنس گیا تھا' اُس کو چبھ رہا تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے صوفہ کے اندر کسی نے ناگ پھنی بچھا دی ہو۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جاتے جاتے بلند آواز میں بولا۔''میرا مشورہ ہے کہ آپ اپنے لڑکوں کو ڈرائیوری سکھا دیں۔ کم از کم مستقبل میں دس ہزار روپے تو کما سکیں گے۔''

........☆........

بُوڑھے بھی تنگ کرتے ہیں

● صغیر رحمانی

'شرما وِلا' میں رہنے والے ایک ایک فرد کا چہرہ سوال بنا ہوا تھا۔

اے۔ پی۔ شرما..... ملازمت سے سبک دوش ہو چکے اُدھیڑ عمر پر ساد شرما شام پانچ بجے اوننگ واک کے لیے گھر سے نکلے تھے، اور ابھی رات کے دس بجے تک واپس نہیں لوٹے تھے۔ دو بیٹوں بڑے اور چھوٹے، دو بہوؤں بڑی اور چھوٹی اور سونو نام کے ایک پوتا والے اے۔ پی۔ شرما کا یوں تو یہ ان کی اپنی خاص طرز زندگی کا ایک حصہ تھا لیکن تشویش والی بات یہ تھی کہ اس بار کپکپا دینے والی سردی میں اے۔ پی۔ شرما یعنی کہ ڈیڈا اپنا اوور کوٹ اور ہیٹ ساتھ لے جانا بھول گئے تھے۔ اس کے بنا انھیں سردی لگ جائے گی، سانس کی پریشانی بڑھ جائے گی اور 'شرما وِلا' کی اینٹیں ہل جائیں گی۔

بڑے دو بار احمد بھائی کی چائے دکان کا چکر لگا آیا تھا۔ اکثر بیٹھا کرتے ہیں وہاں۔ ٹیکسی ڈرائیوروں کا اڈّا ہے۔ خوب چھنتی ہے ان کے ساتھ بُڑھؤ کی۔ کتنی بار منع کیا ہے، مت بیٹھا کریں وہاں.... کیسے بیٹھ لیتے ہیں، ماں کا.... بہن کا....... کرنے والوں کے ساتھ.... پر کہاں ماننے والے۔ بس ایک ہی جواب، دخل مت دیا کرو میرے معاملوں میں..... ٹھیک ہے بھئی، نہیں دیتے دخل...... کرو جو جی میں آئے.....

لیکن آج تو وہاں بھی نہیں تھے۔ چھوٹے نے ان کے سبھی ملنے والوں، جو انگلیوں کی گنتی بھر تھے، کو فون لگا کر پوچھ لیا تھا۔ کہیں نہیں تھے، کسی کے پاس نہیں تھے۔

ٹی۔ وی۔ پر موسم کا حال بتانے والی وہ لڑکی، جو ناک سے بولا کرتی تھی، بالکل پسند نہیں آتی تھی ڈیڈ کو، ان کے مطابق 'ممیاتے' ہوئے بتایا تھا، ٹیمپریچر پانچ ڈگری۔ کہنے پر یقین ہی نہیں کریں گے۔ نہیں کریں گے کہ انھیں اس کا 'ممیانا' پسند نہیں۔ ارّ..... رے... کسی کی ہنیانے جیسی آواز کیول ہونے سے حقیقت تھوڑے ہی بدل جائیگی۔ درجۂ حرارت پانچ ڈگری ہے تو وہ پانچ ڈگری بتائے گی۔ اس کی آواز سے کیا لینا دینا... لینا دینا تو پانچ ڈگری کے ٹیمپریچر سے ہے۔ اب اسے وہ ہنیا کر بتائے یا ہنہنا کر بتائے۔ پچھلے پانچ

سالوں کا رکارڈ توٹا ہے۔ ایسا کہرا اور سردی کہ گلی کے کتے کتیاں بھی دُبکے پڑے ہیں کونے کھدروں میں۔ بھئی کیا کریں... دبکیں نہیں تو..... کچھ ہُو ہَوا گیا تو انھیں کون لے جانے والا ہے ڈاکٹر حکیم کے پاس۔ یہاں تو یہ ہے کہ... ہم ہیں پڑے..... ایک ایک فرد..... ایک ایک پیر پر کھڑا..... یہ ڈاکٹر، وہ ڈاکٹر کرنے والا... سانس کے مریض کے لیے ٹھنڈک، دھول، دھواں تو ویسے بھی زہر ہے، لیکن کون سمجھائے..... سمجھایا تو سونو کو جاتا ہے... بچّے کو... ناتی، پوتا والے کو سمجھانا، کیا خود کو بے وقوف بنانے جیسا نہیں ہے۔ اور اگر کوئی سمجھانے کی جرأت کر بھی لے تو چھلاّ بنا کر سگریٹ کا دھواں ایسے اس کے منہ پر انگلیں گے جیسے..... کرلو، جو کرنا ہے.....

بُڈھوّ نے ایکدم سے ناک میں دم کر دیا ہے.....

بڑی کئی بار جھانک آئی تھی چینل سے باہر۔ سونو کو بھیجا کئی بار مفلر لفلر باندھ کر گلی کے موڑ پر، آنکھیں گڑا کر دیکھنے کے لیے کہرے میں۔ اوپر سے شال بھی لپیٹا۔ چوراہا ہے ٹپ ٹپ۔ جیسے اوس نہیں، پگھلے ہوئے اولوں کی بارش ہو رہی ہو۔

چھوٹی، شام سے ہی جو کھڑکی سے لگی کھڑی تھی، تو ہلی نہیں تھی۔ ابھی پچھلے سال آئی تھی وہ۔ اتنے دنوں میں ہی پہچان گئی تھی ڈیڈی کی آہٹ پر کان لگائے کھڑی تھی۔

بڑے سے رہا نہیں گیا۔ وِنڈ چیٹر کی ٹوپی باندھتا پھر نکلا بے چین من کو شانت کرنے۔ دل میں اندیشہ..... سردیوں میں اینٹھ کر کہیں گرے پڑے نہ ہوں..... بڑھاپے کی ہڈّیاں..... کہاں جھیل پائیں گی ہڈیوں میں چھید کر دینے والی کنکنی..... اور من میں کھیج بھی..... کیا ضرورت تھی ایسی سردی میں باہر جانے کی..... اور وہ بھی بنا گرم کپڑوں کے... سچ، بُڈھوّ نے ایکدم سے... کیا، کوئی اس طرح بھی پریشان کرتا ہے..... اور یہ اوس..... چہرہ بھیگ رہا ہے، جیسے اوس کی شکل میں پھوہاریں پڑ رہی ہیں۔

روزانہ کا معمول ہے۔ مارننگ واک اور اوننگ واک۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کی بیماریاں ہیں یہ سب۔ ریل میں تھے تو اناری کمپنی کرتے رہے۔ وہ جو پھرکی بندھی پیروں میں تو آج تک بندھی ہے۔ کتنی بار کہا، تھک گئے ہیں..... آرام سے رہیے..... محلّے کے اور بوڑھوں کو دیکھیے..... آرام کر رہے ہیں..... ان سے کسی کو پریشانی نہیں ہوتی..... شام کو سب پارک میں جمع ہوتے ہیں..... لیکن انھیں تو دنیا کے سبھی بوڑھوں سے چڑھ ہے..... کیسی حقارت سے کہتے ہیں..... بلڈی اولڈ مین..... ہاں بھئی، اولڈ مین تو ہیں..... آپ بھی تو کوئی جوان نہیں ہو... سانس کے مریض ہیں..... پانچ بجے سے جو نکلے ہیں تو اس سردی میں ابھی تک کہاں ہیں، کچھ اتا پتا نہیں ہے۔

گلی کا موڑ مڑتے ہی چوراہے کی طرف جانے والی سڑک تھی۔ گھنگھور کہرے کی وجہ سے زیادہ دور تک دکھائی نہیں دے رہی تھی، بس کچھ دور تک دھواں بھرے پایپ ہول سی لگ رہی تھی۔

چوراہے پر دھند کے پیراہن میں لپٹے ایک ٹھیلے کے پاس ڈیڈ دہی بڑے کھاتے ہوئے نظر آ گئے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر تو بڑے کے پیروں کے نیچے سے جیسے زمین سرک گئی تھی۔

'ڈیڈ..... یہ کیا کر رہے ہیں.....؟' بے انتہا سردی اور بے انتہا خفگی..... اس کے منہ سے بھک بھک

بھاپ کے گولے نکلے۔

'دہی بڑے کھا رہا ہوں.... 'ڈیڈ پرسکون تھے۔ ٹھیلے والے سے اور مرچی ڈلوا رہے تھے۔

'اس موسم میں..... ؟' وہ اندر سے تقریباً اپنی پوری قوت کے ساتھ چیخ رہا تھا۔

'دہی بڑوں کا کوئی موسم ہوتا ہے.... ؟' ذرا رُکے تھے ڈیڈ، پہلے کی طرح پرسکون لہجہ میں بولے۔ 'دراصل یہاں تم دہی بڑا اور موسم کی بات نہیں کر رہے، تم ان دونوں کے چشمہ سے میری عمر کو دیکھ رہے ہو..... اکثر دیکھتے ہو... اکثر لوگ دیکھتے ہیں..... برخوردار.... جیون کا پہیا عمر سے نہیں من کی طاقت سے چلتا ہے...' ڈیڈ نے لکڑی کا چیچ دونے کے کونے کونے میں گھمایا تھا۔ 'پر تم' اتنی سردی میں، اتنی رات کو، کہاں جا رہے ہو..... ؟'

حالات بدل گئے تھے۔ جملے کو توڑ توڑ کر ڈیڈ نے جو الٹ بانسی کی تھی اس سے اس کا ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔ 'کہاں جا رہا ہوں... ؟' کہاں تو اسے اتنی دیر تک ان کے غائب رہنے کی وجہ پوچھنی تھی اور پوچھ کر اپنی کھیج کو شانت کرنا تھا، کہاں اب اسے اپنی صفائی سوچنی پڑ رہی تھی۔ اس مضحکہ خیز، بے بس حالات کے لیے وہ قطعی تیار نہیں تھا۔

'میں تو آپ کو دیکھنے نکلا تھا......'

'مجھے دیکھنے..... کیا میں بچہ ہوں..... سونو ہوں..... کیا میں اپنی دیکھ بھال بھی نہیں کر سکتا..... دیکھو مسٹر...'

'او کے...... او کے.... 'سپردگی کا تاثر۔ 'چلیے، گھر چلتے ہیں.... 'زبردست صبر و استقلال کا ثبوت دیتے ہوئے اس نے کہا۔ اس کی خواہش ہو رہی تھی، زور زور سے چیخے، چیخنے لگے۔

وہی ہوا تھا۔ ڈیڈ چھینکنے لگے تھے۔ چھینکنا شروع کرتے تو چھینکوں کی لڑی جھڑی لگا دیتے۔ بڑی نے جلدی جلدی جوشاندہ اوٹنا، چھوٹی لیکر کمرے میں گئی۔ سوچا، کمبل و مبل اوڑھ کر لیٹے ہوں گے ڈیڈ۔ لیکن ڈیڈ تو.... کمپیوٹر پر آرکٹ کھلا ہوا تھا۔ تھوڑا جھکے، مانیٹر پر آنکھیں گڑائے، ڈیڈ نیٹ سرفنگ میں مصروف تھے۔ جو شاندہ کا پیالہ ماؤس کے پاس رکھتے ہوئے وہ کن انکھیوں سے دیکھنے لگی۔ خوبصورت گھنے بالوں والی تھی وہ، جسکی پروفائل ڈیڈ غور سے پڑھ رہے تھے۔ اس نے ہڑبڑا کر پیالہ رکھ دیا اور جانے کے لیے مڑ گئی۔

'رکو.... 'ڈیڈ کی رعب دار آواز گونجتے ہی اس کے پیر زمین سے چپک گئے، کھڑی ہو کر ان کی آواز کی اگلی کڑی کا انتظار کرنے لگی۔

'برکھا اوستھی.... میری نئی فرینڈ.... گڑگاؤں کی ہے.... عمر ۳۱ سال..... انٹیریر ڈزائنر ہے۔ جانتی ہو، کل میں نے اسے فرینڈ بننے کے لیے انویٹیشن بھیجا تھا..... میرا انویٹیشن قبول کر اس نے مجھے 'ہائے' کہا ہے.... 'ڈیڈ مچل اٹھے تھے'... اور اسی کے ساتھ میرے نائنٹی نائین فرینڈ ہو گئے... 'ان کا جوش اور ولولہ دیکھنے کے قابل تھا۔

ڈیڈ مانیٹر پر کچھ اور جھک گئے تھے۔ 'ار.... رے... یہ کیا... ؟' ان کا جوش مزید بڑھ گیا تھا۔

برکھا آن لائین تھی۔ ڈیڈ کو چیٹ کی دعوت دے رہی تھی۔

'بیٹھو بیٹھو... چیٹ کرتے ہیں... 'ڈیڈ نے چھوٹی کا ہاتھ پکڑ کر پاس میں بیٹھا لیا تھا۔

'ہائے.... آپ کون ہیں؟' ادھر سے برکھا پوچھ رہی تھی۔

'میں اے۔ پی۔ شرما.... ' ڈیڈ میسیج باکس میں ٹائپ کرنے لگے۔ 'آپ نے میرا پروفائل دیکھا ہوگا.... ریٹائرڈ ریلوے ملازم ہوں.... دو بیٹے ہیں.... دہلی میں کچھ کچھ کرتے ہیں.... دونوں بہوئیں تعلیم یافتہ اور مہذب ہیں.... آپ کو دھرتی پر جنت اگر دیکھنا ہے تو میں آپ کو شرماولاَ آنے کی دعوت دیتا ہوں.... '

'رومانس....؟'

ڈیڈ پھڑک اٹھے تھے۔ چھوٹی کے کان کے پاس منہ لے جا کر پھسپھسائے، 'رومانس کے بارے میں پوچھ رہی ہے... ' اس قدر دھیمی آواز کہ برکھا سن نہ لے۔ 'بتاؤ..... بتاؤ کیا لکھوں اسے....؟'

چھوٹی اک بکا گئی۔ ڈیڈ کا منہ دیکھنے لگی۔ کیا کہے، اسے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا۔ ذرا دیر انتظار کے بعد ڈیڈ خود ہی جواب ٹائپ کرنے لگے تھے۔

'میرے خیال سے رومانس کوئی خاص واقعہ یا عمل نہیں ہوتا.... یہ ایک نظریہ ہے.... مثبت بھی... منفی بھی.... یہ آپ پر منحصر کرتا ہے کہ آپ زندگی میں مثبت ہیں یا منفی.... زندگی میں ملنے والا ہر درد.... ہر خوشی.... ہر جیت.... ہر ہار، عمر کا ہر پڑاو.... پوری کی پوری زندگی.... پیدا ہونے سے لیکر موت تک کا پورا سفر، رومانس ہے.... پوری زندگی ہی رومانس ہے.... اس کی وسعت کو کسی دائرے میں محدود کرنے کے حق میں، میں نہیں... اسے اس کی حقیقی شکل.... '

چھوٹی کو نیند آرہی تھی۔ بار بار منہ پھاڑ کر جمائی لے رہی تھی۔ نہ جانے ڈیڈ کا یہ دوستانہ کب تک چلنے والا تھا۔ دروازہ پر آکر چھوٹے کئی بار اشارہ کر گیا تھا، اپنا سر پیٹ گیا تھا۔ ڈیڈ بھی جو ہیں نا.... خود تو اس عمر میں.... آج تو بری طرح پھنس گئی تھی وہ۔ اس نے قصداً منہ کو پورا پھیلا کر جمائی لی۔ 'ڈیڈ.... بارہ بج گئے.... ' ڈیڈ کا ذہن وقت کی جانب مبذول ہوا۔ 'ارے ہاں' جاؤ جاؤ، سو جاؤ.... ' ڈیڈ نے ایسے کہا تھا جیسے اسے جانے کی اجازت دیکر اس پر بڑا سا احسان کیا ہو۔

رات میں سردی بارش بن کر برس گئی تھی۔ صبح سب کی آنکھیں کھلیں تو تیز بھیگی ہوئی، کنکنی ہوا چل رہی تھی۔ گھر آنگن، گلی محلہ کیچ کیچ ہو رہا تھا۔ ڈیڈ کے کمرے میں دیکھا گیا تو ڈیڈ نہیں تھے۔ مارننگ واک پر نکل گئے تھے۔ بڑے کا دماغ گرم ہو گیا تھا۔

'بتاؤ تو.... پوری رات کھائیں کھائیں کیے ہیں.... اور اتنے خراب موسم میں مارننگ واک سوجھ رہی ہے بڈھؤ کو..... میں تو کہتا ہوں، آج ہمیں انھیں اچھی طرح سمجھانا ہی ہوگا... دیکھو چھوٹے.... تمھیں بھی اگر چین سے رہنا ہے تو.... ہمیں منہ کھولنا ہی ہوگا.... ارے یار، اب تو حد ہوگئی.... اس طرح بھی کوئی.... '

جوتوں کی دھمک سنائی دی تھی۔ یقیناً ڈیڈ ہوں گے۔ ڈیڈ کے جوتوں کے علاوہ، ایسی دھمک کوئی اور پیدا کر ہی نہیں سکتا تھا۔ سب کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ آٹا چالتی بڑی، لوکی کترتی چھوٹی، داڑھی بناتا بڑے، استری کرتا چھوٹے اور دانت مانجھتا سونو۔ لمحہ بھر کے لیے سب کے ہاتھ جہاں تھے، وہیں رک گئے تھے۔ سب کی آنکھیں ایک دوسرے سے الجھ گئی تھیں۔ 'کھڑا کیا ہے...... جا کر دیکھ نا....' بڑی نے منہ سے کم آنکھوں سے زیادہ کہا تھا سونو سے۔ وہ گیا، آیا۔ ہاں میں گردن ہلائی۔ لوکی کترنا چھوڑ چھوٹی نے برآمدہ میں جھانکا تھا۔ چینل کے باہر ڈیڈ پیر پٹک کر جوتوں میں لگی کیچڑ جھاڑ رہے تھے۔

'اوف' اتنی کیچڑ.... پھر دلّی میں رہنے کا کیا فائدہ.... گاؤں ہی ٹھیک ہے.....'

محض اتنا ہی سن پائی تھی وہ۔ کلیجہ دھک... اب گاؤں جانا پڑے گا.... چینل کھول برآمدے میں آ کر ڈیڈ جوتا کھولنے لگے تھے۔ جھکا جھک سفید جوتا کیچڑ سے گدڑی بن گیا تھا۔ اس درمیان چھوٹی سے بڑی تک۔ بڑی سے بڑے تک، بڑے سے چھوٹے تک اور چھوٹے سے سونو تک پھس پھس کرتی لیکن تیز رفتار سے بات پہنچ گئی تھی، اب گاؤں جانا پڑے گا۔ کیوں رات میں بوندا باندی ہو گئی.... کیوں ڈیڈ اس موسم میں بھی ٹہلنے نکل گئے..... کیوں ان کے جوتوں میں کیچڑ لگ گئی..... کیوں..... اچانک نہ جانے کتنے سوال سبھی کے دل کو کچوٹنے لگے تھے۔

'بڑے.....' یہ ڈیڈ کی آواز تھی۔ ہو گئی چھٹی۔ اب باندھو بوریا بستر.....

'گاؤں جانا ہے ڈیڈ.....؟' سامنے حاضر ہوتے ہی بڑے نے پوچھا تھا۔

'گاؤں.... 'ڈیڈ اکھڑ گئے تھے گاؤں جا کر کیا کرو گے تم لوگ؟ گاؤں میں تم لوگوں کا گزارا ہوگا؟ چلے ہو گاؤں جانے.... تم تو اتنا کرو کہ میونسپل کمشنر کے نام ایک درخواست لکھو... وارڈ میں اتنی گندگی ہو گئی ہے کہ.... آخر ہم ٹیکس کس بات کا دیتے ہیں.....؟'

سبزی چھونکتی بڑی، ڈیڈ کا جوتا صاف کرتا چھوٹے، اور جوتے کی کیچڑ سے کچ کچ ہو گئی فرش پر پوچھا لگاتی چھوٹی کی ٹھہری ہوئی سانسیں چلنے لگیں۔ سب نے بیک وقت ایک ساتھ راحت کی سانس کھینچی۔

ڈیڈ نے اپنے کمرے میں فولڈنگ ڈال ایک اور بستر لگانے کا حکم دیا تھا۔ گاؤں سے گجا دھر چاچا آ رہے تھے۔ ان کے آنے کی خبر پا کر ڈیڈ میں بے انتہا جوش بھر گیا تھا۔ یوں تو گاؤں سے اکثر کوئی نہ کوئی آتا ہی رہتا تھا۔ ڈیڈ نے پورے گاؤں والوں سے کہہ رکھا تھا، جب بھی کسی کو، کسی کام سے دہلی آنا پڑے، اسے 'شرما ولا' کو چھوڑ کر کہیں اور رکنے ٹھہرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اوپن ٹنڈر کی طرح اس کھلی دعوت کا فائدہ گاؤں والے خوب اٹھاتے تھے۔ کوئی کام کی تلاش میں، کوئی علاج کرانے کی غرض سے، کوئی قطب مینار، لال قلعہ دیکھنے..... خواہ جس کسی غرض سے دہلی آتا ہو، ٹھہرتا تھا 'شرما ولا' میں ہی۔ اور جتنے دن تک ٹھہرتا تھا، اس کی خاطر تواضع میں 'شرما ولا' کا ایک ایک فرد لگا رہتا تھا۔ ان کے کھانے پینے سے لے کر ہگنے موتنے تک پر توجہ دینی پڑتی تھی۔

گجادھر چاچا کو لے کر ڈیڈ زیادہ حساس تھے۔ ڈیڈ کی دانت کاٹی روٹی کھانے والے تھے۔ بچپن میں، ڈیڈ کے ساتھ اونچے اونچے، سفید چکنے پیڑوں پر چڑھ کر کٹیا اور کھیتوں میں سے بھٹا چرانے والے صرف ایک وہی بچے ہوئے تھے۔ ڈیڈ آج بھی ان کٹنیوں کی سہرن پیدا کر دینے والی ترشی اور بھنے ہوئے بھٹوں کی نرم نرم گرمی اپنے دانتوں کی جڑوں میں محسوس کیا کرتے تھے۔ باڑھ کا پانی اترنے کے بعد ندی میں پیلا مینگرا اور کالا کالا کینکڑا پکڑنے میں جو پورا کا پورا دن گزرتا تھا، اس کا بکھان کرتے ہوئے ڈیڈ اتنا جذباتی ہو اٹھتے تھے کہ آنکھوں کی کوروں سے پانی رسنے لگتا تھا۔

گجادھر چاچا دہلی آ رہے تھے۔ وہی گجادھر چاچا، جو کبھی ٹرین پر نہیں چڑھے تھے۔ چڑھتے ہی نہیں تھے۔ کہتے، 'دو انچ کی پٹری پر چلے لے ٹرینوا... ایکر کا بھروسہ...' کہیں آنا جانا ہوتا تو بس وَس سے ہی، ورنہ نہیں۔ پہلی بار ڈیڈ نے انہیں ٹانگ ٹونگ کر طوفان اکسپریس میں بٹھایا تھا اور دتی لے کر آئے تھے۔ گجادھر چاچا پورا سفر دَم روکے ہوئے تھے۔ جب صحیح سلامت دتی پہنچ گئے تو ایسا تاثر ان کے چہرے پر تھا جیسے غضب ہو گیا ہو۔ لیکن چسکا بھی لگ گیا گجادھر چاچا کو۔ جب جی میں آتا، من کرتا 'تو پھنوا' پر چڑھ جاتے۔ پھر ڈیڈ اور گجادھر چاچا، دونوں جب ملتے تو لگتا دنیا انگی ٹھوکروں پر آ گئی ہو۔ پورا پورا دن قطب مینار، لال قلعہ، جامع مسجد، ہمایوں کا مقبرہ... نہ جانے کہاں کہاں گھمگڑی کرتے، چوکڑی بھرتے رہتے۔ آنے سے قبل گجادھر چاچا جب مطلع کرتے تو ڈیڈ کہتے 'ستو الیتے اَیہا... ایہی لئی چوکھا لگاوے کے....'

گجادھر چاچا ستو لیکر آتے تھے اور ڈیڈ پورے گھر کو ناچ نچا کر رکھ دیتے تھے۔ نہ جانے کہاں کہاں سے لٹی چوکھا کے لیے کنڈے کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔ گجادھر چاچا جب تک رہتے، ڈیڈ ایکدم سے بدلے ہوئے رہتے۔ ان کا ایک ایک پل گجادھر چاچا کے نام منسوب ہوتا۔ دو دو بجے رات تک اور کبھی کبھی تو صبح ہو جایا کرتی، لیکن گاؤں اور گاؤں کے لوگوں کی باتیں ختم نہیں ہوتی تھیں۔ گاؤں کی سڑک پکی ہو گئی ہے... مکھیا کے چناؤ میں گاؤں دو پھانک ہو گیا ہے..... دلتوں نے غیر مزروعہ زمین کے پٹا کے لیے بلاک کا گھیراؤ کیا.... نہ جانے کتنی باتیں، کوئی اُور چُھور نہیں ہوتی تھی۔ اور آخر میں بات پھر وہیں آ جاتی تھی، ترنئے میں کھجور کے پیڑوں پر لٹکتی ہوئی تاڑی کی لبنی... اَدھواڑ سے اس پر نشانہ لگانا... تیز پُرَوَیا میں تاڑی کا چھر چھرا کر گرنا اور اسے چلو میں بھر کر سُٹر سُٹر پینا...

لیکن تھے تو ڈیڈ کے لنگوٹیا یار ہی۔ بہت ساری یکسانیت رکھتے تھے۔ سب سے زیادہ تکلیف وہ ہوتا تھا، صبح صبح مرانڈا کی دو لیٹری بوتل میں پانی بھر کر بس میں بیٹھا کر ان کو دور لے جانا۔ یہ ایک ایسا کام تھا کہ دن بھر طبیعت مچلاتی رہتی تھی۔ دراصل گجادھر چاچا ٹائلٹ میں 'فریش' نہیں ہو پاتے تھے۔ انہیں بس کے ذریعہ دور کھلے میں 'جھاڑا' کے لیے لے جانا پڑتا تھا۔ وہ کھلے میں ہی صبح کے معمول سے فارغ ہو پاتے تھے۔ ظاہری بات تھی، اس نیکی کے لیے اکثر چھوٹے ہی مہیا ہوا کرتا تھا۔ خود کو ٹھیل ٹھال کر جاتا تھا، بھنبھناتا تھا، 'ایک کیا کم تھے جو یہ دوسرے بھی...'

گجادھر چاچا آئے تو گھر میں ہلچل بڑھ گئی۔ 'کا ہو چھوٹکا بَبُوا... کا ہو بڑ کا ببُوا... کا حال با تو ہر لوگن کے....' ان کی زبان سُن چھوٹی پورے منہ میں ساڑی کا پلّو ٹھونس ہنسی روکنے کی کوشش کرتی۔ سوٹو نقل اتارتا تو بڑی جھڑکتی۔ بڑے بھی جھلاتا۔ ڈیڈ جو ہیں نا... سوچنا چاہیے، گھر میں ایک بچہ ہے....

سچائی یہ تھی کہ گھر میں اس وقت دو اور بچّے تھے۔ رات کے بارہ بجے لوڈو کھیل رہے تھے۔ ڈیڈ نے پاسا پھینکا... چھکّا... ایک..... دو... تین.... چار... پانچ.... اوؤ رہی چھ.... مار دیلی.... چل گھر میں گھس جا.... گوٹی پٹ جانے سے گجادھر چاچا کا منہ لٹک گیا تھا جب کہ ڈیڈ زور زور سے تالیاں پیٹ رہے تھے، 'اے... اے..... گجوا... منہ دیکھا اپنا.... کیسن لٹک گئیل با ہو...'

اب باری گجادھر چاچا کی تھی۔ پاسا پھینکا تو چار آیا۔ ایک ... دو...... تین.... اوؤ رہی مرنی چار.... اتفاق سے ڈیڈ کی گوٹی بھی پٹ گئی۔ گجادھر چاچا تو جیسے اچھلنے کودنے لگے۔ 'آ ہو بڑ کا ببوا... آ ہو چھوٹکا ببوا... تنی شیشا لے آ وہُو... بابو کے منہ دِکھاد.....'

بغل والے کمرے میں بڑے پھرکی کی طرح ناچ رہا تھا، 'یہ گھر ہے یا چڑیا گھر... ؟ خود تو سوتے نہیں، دوسروں کا آرام بھی حرام کیے ہوئے ہیں....'

نہیں رہا گیا اس سے۔ ڈیڈ کے کمرے میں پہنچا۔

'ڈیڈ....'

دونوں حلق پھاڑ کر ہنس رہے تھے۔ 'اچھا ہوا تم آ گئے بڑے...' نہیں تھم رہی ہنسی کو تھامنے کی محض کوشش سی کرتے ہوئے ڈیڈ نے کہا، '... دو کپ چائے کے لیے بڑی سے کہہ دو.... اور تم، ابھی تک سوئے نہیں..... ؟ تمھیں صبح کام پر نہیں جانا کیا؟' پھر ہنسی کا اُبال۔ بڑے پھین کی طرح بہتا ہوا کمرے سے باہر نکلا، سارا غصہ بڑی پر نکلا، 'انھیں چائے کیوں نہیں دے آتی....'

بڑے کا منہ دیکھتے رہ جانے کے علاوہ بڑی کے پاس دوسرا کوئی چارہ نہیں تھا۔

ایک ہفتہ رہنے کے بعد گجادھر چاچا گاؤں لوٹ گئے تھے۔ پر ڈیڈ کے اندر نہ جانے کتنی توانائی بھر گئے تھے۔ اب انھیں موسم کی نرمی گرمی کی رتّی برابر بھی پروا نہیں رہ گئی تھی۔ ساری بندشوں، رُکاوٹوں کو تہس نہس کر جس طرح بے لگام دریا بہتا ہے، اسی طرح ڈیڈ بہہ رہے تھے۔

اس دن بڑے کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ سگریٹ کی بو آ رہی تھی۔ اس نے نتھنوں کو سکوڑا، پھیلایا۔ سگریٹ کی بو ہی تھی۔ ڈیڈ کے کمرے سے آ رہی تھی۔ اسے سمجھتے دیر نہیں لگی، ڈیڈ سگریٹ پی رہے ہیں..... کمرے میں دھواں اور اس کی کسیلی گندھ بھری ہوئی تھی۔

ڈیڈ نے ضد بھری نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

'ہم لوگ تنگ آ گئے ہیں ڈیڈ.... آخر کیا چاہتے ہیں آپ....؟'

'تم لوگ کیا چاہتے ہو..... 'ڈیڈ کی الٹ بانسی۔ لیکن بڑے مضطرب نہیں ہوا۔
'محلّے میں اور بھی بوڑھے ہیں.....'
'ہاں سچ مچ..... وہ بوڑھے ہیں...'
'ڈیڈ آپ.....'
'ٹھیک ہے.....'

اس رات سانس کی بیماری نے زور پکڑ لیا تھا۔ ڈیڈ پوری رات نہیں سو سکے۔ پوری رات ایک ایک فرد، ایک ایک پیر پر کھڑا رہا۔ بڑی تیل گرم کر کر کے مالش کرتی رہی، چھوٹی انہیلر کی پچکاری دیتی رہی، بڑے پیٹھ دباتا رہا، چھوٹے چھاتی سہلاتا رہا، سانس لینے میں کافی دشواری..... سوتو گہری سانسیں چھوڑتا رہا... پلنگ سے نیچے پیر لٹکائے، دونوں ہاتھوں کو بستر پر ٹکائے، اکھڑی اکھڑی سانسوں کو پکڑنے کی کوشش کرتے رہے ڈیڈ..... رات کے آخری پہر میں ڈیڈ کی آنکھ لگ گئی، پھر نہیں کھلی۔

اے پی۔ شرما..... ارزدہ پر ساد شرما یعنی ڈیڈ نہیں رہے۔ نہیں رہے تو 'شرما ولا' میں بہت ساری حرکتیں بھی نہیں رہیں۔ ڈیڈ کے سبب ایک ایک کی، جو جسمانی اور ذہنی مصروفیت بنی رہتی تھی، اس سے ایک ایک کو نجات پانے جیسا احساس ہونے لگا۔ ایک ٹھہراو... سکون جیسا کچھ محسوس ہونے لگا۔ سر پر سے کوئی وزنی سی چیز ہٹ جانے سا لگنے لگا۔ ذہن کو آرام کا سا گمان ہونے لگا۔ پُرسکون، آرام دہ صبح اور اسی طرح کی رات۔ بڑے اور بڑی، چھوٹے اور چھوٹی اپنے اپنے کاموں میں، اپنی اپنی مصروفیت میں.....

اس دن..... اس وقت..... بڑی کچن سے نکلی، چھوٹی اپنے کمرے سے..... بڑے چھت پر سے بھاگا، چھوٹے برآمدہ سے.....

سب ایک ساتھ ڈیڈ کے کمرے میں تھے۔
ڈیڈ کی آواز سنائی دی تھی:
'بڑے، میرا ہیٹ کہاں ہے؟'
'چھوٹی، ایک کپ چائے دینا'
'بڑی، جوشاندہ کا کیا ہوا؟'
'چھوٹے، میرا جوتا صاف ہوا کہ نہیں؟'

ڈیڈ کا بستر..... ڈیڈ جس پر بیٹھے ہوتے تھے، خالی تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ سب نے ایک دوسرے کو دیکھا، سب کی آنکھوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔ بڑے دھم سے ڈیڈ کے بستر پر بیٹھ گیا۔ ہتھیلیوں سے چہرہ ڈھک پھپھک پڑا، 'بہت تنگ کرتے ہیں بُڈھو.....!'

........☆........

رشتے ناتے

● غزال ضیغم

کانوں میں چاندی کے تاروں کی بالیوں میں موگرے کی تازی کلیاں پروئے، جوہی اور بیلے کے گجروں سے مہکتی، جھریوں والے چہرے پر سفید پاؤڈر پوتے، سوتی غرارہ جمپر سٹکائی، جیسے ہی حویلی کے صدر دروازے سے پُھیا آنگن میں داخل ہوئیں، ابا کی شرارتی آواز بلند ہوئی:

''جہنمی آئے گئیں تم۔ ہم تو تمھارا فاتحہ بھی پڑھوا چکے۔'' ابا وضو کی چوکی پر بیٹھے۔ بیٹھے پُھیا کو چھیڑتے۔

وہ دعاؤں کے ٹوکرے برساتیں۔

''ہزار سال جیو مورے بھیا........ بچّوں کا سہرا دیکھو.............. ہرا بھرا باغ رہے.......... پُھولو پھلو........'' ''کہا۔ کہاں کی سیر کر آئیں بوڑھی.........'' ابا چڑھاتے۔

''ارے بھیا کا بتائی....... اُوندڑی (بڈی) پار علی پور کا پُوروا میں قاسم بھیا رہت ہیں نا؟ ان کے پوتے کے لڑکے کی خالہ کی پرنانی بیمار رہیں بہت........ انکو ہمری بڑی جرورت تھی ہُوا ان گئے۔ پھر رحیم میاں کے دادا کے ننہال میں انکے سالے کی لڑکی کی نانی کے پوتے کا ختنہ تھا وہاں یہ جوڑا املا رہا۔''

وہ نیا نیا معمولی کپڑے کا سوتی جمپر دکھانے لگتیں۔ ''اچھا....... اب رہنا........ پھر یہی کرنا۔ اپنی پسند کا جوڑا بنوانا۔ نئی چپل بھی خرید لینا۔''

ابا انکی چپلوں کی حالت بھی دیکھ لیتے جو چلتے چلتے گھس چکی تھی، اور آخری سانسیں لے رہی تھیں۔

''ہاں بھیا بالکل..........''

وہ اپنے جھولے تھیلے سب اپنی جھلنگی چارپائی پر رکھتیں۔ دالان کے بڑے طاق میں الم۔ غلم بھرتیں اور پھر گاؤں بھر کی خیریت دریافت کرنے نکل پڑتیں۔

پھُنیا ہمارے گھر میں کب سے رہ رہی ہیں مجھے یاد نہیں۔شاید میرے پیدا ہونے سے بھی پہلے سے رہ رہی ہیں۔

ابا مشترکہ خاندانی نظام کی روایت کو مضبوطی سے نبھا رہے تھے اور انھوں نے بہت سے مفلوک الحال شرفا کو حویلی میں برسوں سے رہنے کی جگہ بھی دے رکھی تھی۔جن کا کوئی وارث نہیں ایسے ایسے کئی لوگ اپنوں کی طرح ہمارے یہاں برسوں سے رہ رہے تھے۔جن کو ہم چچا...بابا.......چچی.......خالہ.....ماموں.........کے القاب سے جانتے تھے۔پھُنیا بھی ان میں سے ایک تھیں۔لیکن یہ لگا تار ایک جگہ رہ نہیں سکتی تھیں۔ان کا جی گھبرانے لگتا تھا۔ہولی ہونے لگتی تھی۔اپنے ان دیکھے ماجایوں کی یاد ستانے لگتی تھی اور وہ انجان سفر پر نکل پڑتی تھیں۔

کوئی بھی گاؤں ہو شہر ہو.......سب انکے اپنے رشتے دار تھے۔ان کا خون کا رشتہ سب سے تھا۔پھُنیا کہاں سے آئی تھیں۔کہاں کی رہنے والی تھیں۔ان کا کوئی اپنا تھا یا نہیں۔انجان شخص بھی ان کا رشتہ دار تھا۔جس گاؤں یا شہر میں پہنچ جاتی تھیں اپنے حُسنِ اخلاق سے سب کا دل جیت لیتی تھیں۔

بے حد خوش ذائقہ کھانے پکاتی تھیں۔آٹا پانی جیسا پتلا گوندھتی تھیں۔گلگلے سا آٹا لگتا۔بچّے اکثر پنجا مار دیتے وہ نہیں پڑتیں۔باریک ملائم چپاتیاں پکاتیں۔نرم اور سرخ چتّی دار،جو ٹھنڈی ہونے پر بھی نرم رہتیں۔

قورمہ،قلیہ ان کے مخصوص مسالوں،گوشت کے جوہر اور دیسی گھی کے تارکی وجہ سے بے حد لذیذ ہوتا۔شامی وگلاوٹ کے کباب زبان پر رکھتے ہی گھل جاتے۔موسم کے لحاظ سے کھانے پکاتیں۔سبزی ترکاری بھی بڑے اہتمام سے پکاتیں۔ایک۔ایک ترکاری کو کئی کئی ڈھنگ سے پکا کر سبزی خوری میں نئی لذت پیدا کردیتیں۔ باکمال ورقی پراٹھے خستہ۔خستہ پکاتیں۔دو پیازہ۔قیمہ مٹر،کوفتے،بریانی،یخنی پلاؤ لاجواب تیار کرتیں۔

ان کی ہر ہانڈی کا ذائقہ الگ رہتا۔پکانے کا ڈھنگ،مسالوں کا انتخاب اور ان کے استعمال میں ایک خاص تناسب کا لحاظ رکھتیں۔وہ کھانوں کو مزے دار اور لذیذ بنانے کے گُر جانتی تھیں۔

رنگ،مزا،خوشبو لاجواب،سبھی کھانے وہ مدھم آنچ پر پکاتیں اور اصرار کر کر کے کھلاتیں،ہاں ترکیب وہ لاکھ پوچھنے پر بھی نہ بتاتیں۔

فیرینی مٹی کے تازے سکوروں (مٹی کے پیالوں) میں جما دیتیں اس کی سوندھی مہک ہمیں آج بھی یاد ہے۔ابا کے لیے خاص طور پر آنولے کا مربہ بناتیں۔دماغ کی فرحت اور ہاضمہ کی طاقت بڑھانے کی اچوک تاثیر رکھتا ہے،وہ کہتیں۔

جس طرح مزے مزے کے قسم قسم کے کھانے پکوان پکاتیں،اتنی ہی طرح کے رشتے بھی نبھاتیں۔کسی کی دادی کسی کی نانی۔اماں۔بڑی اماں۔کاکی۔بہن۔بھانجی۔بھتیجی۔چاچی۔چچی۔تائی۔

خالہ۔ پھوپھی۔ پرموپرمو۔ پُھپیا بنی ہوئی تھیں۔

وہ محبت کا سرچشمہ تھیں۔

کبھی کبھی کھیتوں کی پگڈنڈی پر پیدل چلتے۔ چلتے تھک جاتیں تو کسی بھی سائیکل سوار کو روک لیتیں۔

''تم تو ہمرے پھُپا کے چچا کے بھتیجے ہونا؟ کیا خوب پہچانا بھیا............جیت رہو......اچّھے ہونا؟ گھر میں سب امن چین ہے نا؟ بہو ٹھیک ہے.............گدھرا (بچّے) نیک (اچھے) ہیں..........''

''جی سب کھیرت (خیریت) ہے''

اب بزرگ سفید بالوں والی پیاری سی بوڑھی سے کون بحث کرتا۔

''ممّور بھیا............ سائیکل کے پیچھے بیٹھ جاوٗں............ اگلے گاوٗں میں ہمرے ماموں کی بھتیجی کے بیٹے کی پوتی کی رسم ہے۔ آج لڑکے والے اُویا (آنے والے) ہیں۔ جائے کا جروری ہے۔'' (جانا ضروری ہے)

وہ بیچارہ بیس کوس سائیکل پر انکو خوشی۔ خوشی ڈھوتا۔ وہ لاکھوں دعائیں دیتیں:

''جیت رہو۔ کھُس رہو۔ خوب کماوٗ............ پھولو پھلو............'' رکشہ میں۔ بس میں۔ ٹرین میں بغیر ٹکٹ بھی دعاوٗں کے سہارے کہاں سے کہاں پہنچ جاتیں۔ چائے والا مفت میں چائے پلا دیتا۔ خوانچے والا اپنے پکوان چڑھا جاتا۔ ہندو مسلم میں کبھی فرق نہ کرتیں۔ گنگا جمنی تہذیب کا زندہ نمونہ تھیں وہ۔ سب انکے بھائی بھتیجے بن جاتے۔ گاوٗں کے گاوٗں ان کے عاشق تھے۔ وہ چلی جاتیں تو لوگ پوچھنے آتے۔ کبھی کسی شہر میں پہنچ جاتیں۔ کسی کے یہاں باورچی بن کر کھانا پکاتیں۔ کہیں بچوں کو نماز پڑھنا سکھاتیں۔ کپڑے سیتیں، گھریلو نسخوں سے دوائیں بناتیں۔ زچہ بچہ کو سنبھالتیں۔ شادی بیاہ، عقیقہ، ختنہ، بیماری، موت ہر طرح کا کام سنبھال لیتیں۔ وہ بھی بے حد ایمانداری اور جانفشانی اور دل سے۔ بزرگوں، ضعیف، بیمار لوگوں کی تیمارداری کرتیں۔ ان کی دعاوٗں میں اثر تھا اور ہاتھ میں شفا۔ لوگ جلد صحت یاب ہو جاتے۔ پھر انکو ڈھونڈھتے رہتے۔ وہ غائب ہو جاتیں۔ سفید جھرّیوں دار چہرہ۔ بچّوں سی چمکتی بوڑھی آنکھیں۔ سفیدی مائل رنگت۔ سوتی غرارہ جمپر اور چادر نما دوپٹہ سر سے ڈھکا ہوا۔ جس میں ہمیشہ ہاتھ کی بنی کروشیے کی رنگین بیل ٹکی ہوئی یا باڈر۔ دوپٹہ ہمیشہ خوب رنگ کر چُن کر اوڑھتیں۔

ہم سب کے لیے ست رنگے دوپٹے رنگتیں۔ ابرق لگاتیں پھر بڑے اہتمام سے چُنتیں۔ ہار سنگھار کے پھولوں کی نارنجی ڈنڈیاں پانی میں اُبال کر زعفرانی رنگ سے مہکتا دوپٹہ بناتیں۔ چائے کی پتی ابال کر آتشی رنگ تیار کرتیں۔ چاول سے کلف بناتیں۔ چقندر، گاجر، ہلدی، پالک، گڑہل کے پھول، سرسوں کے پھولوں سے رنگ نکالتیں کبھی۔ کبھی تو ایسا رنگ بنا لیتیں کہ سب دانتوں میں انگلیاں دبا لیتے۔

پھول پودوں کی بھی بے حد قدر کرتیں۔ کیاریوں میں دھنیہ پودینہ ٹماٹر مرچ لگاتیں۔ ادرک اور ہلدی بھی

زمین میں کھود کر لگاتیں۔ موسمی پھولوں کے پودے لگاتیں۔ انکی دیکھ بھال کرتیں۔ پانی کھاد سب وقت پر دیتی رہتیں۔
چڑیوں کو بھی دانا پانی دیتیں۔
سجنے سنورنے کی بھی بے حد شوقین تھیں پھُپیا۔
چقندر کے ٹکڑے ہونٹوں پر رگڑ کر لالی لگاتیں تازہ بالائی اور مکھن چہرے پر لگاتیں۔ تیل پھولیل لگاتیں۔ نیم کا بنا دیسی گھی کا کاجل بناتیں اور موٹا موٹا لگاتیں۔
پھر تانبے کے قلئی کیے جھلملاتے کٹورے میں اپنا چہرہ دیکھ کر خوب ہنستیں۔ خود بھی بیلا، چمیلی، جوہی کے مہکتے گجرے پہنتیں اور گھڑے صراحیوں کو بھی پہناتیں، پاؤڈر لپ اسٹک کی بھی خوب شوقین تھیں۔
''ارے بٹیا جرا سا پاؤڈر اسنو دوگی کیا؟ اللہ تمکو خوش رکھے۔'' باجی سے فرمائش کرتی رہتیں۔ باجی کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور وہ مائیکے آئی ہوئیں تھیں۔ روز نئے نئے خوبصورت کپڑے اور زیور پہنتیں اور میک اپ کرتیں۔ جگر مگر کرتیں۔ پھُپیا انکی بلائیں لیتی نہ تھکتیں اور روز نظر اتارتیں مرچ سے۔ ایک تپتی گرم دوپہر میں پھُپیا چپکے سے انکے کمرے میں داخل ہوتیں۔ دیکھا باجی سو رہی تھیں۔ حالانکہ باجی نے بتایا کہ وہ جاگ رہی تھیں۔ پھُپیا کو دیکھ کر سوتی بن گئیں۔
پھُپیا کئی روز سے ان سے کریم مانگ رہی تھیں۔ باجی بے حد گوری چٹی گلاب سی رنگت والی تھیں پھُپیا کا کہنا تھا کہ ''بٹیا کا رنگ ایگریجی (انگریزی) کریم لگانے سے ایگریج (انگریز) جیسا گلابی ہوگیا ہے'' باجی کی سنگار میز پر طرح طرح کے لوشن اور کریمیں رکھی تھیں کچھ شادی میں آگئیں، کچھ خریدیں تھیں۔
پھُپیا نے لپک کر ایک شیشی اٹھائی۔ باجی نے دھیرے سے آنکھ کھول کر دیکھا کہ پھپیا نے کیا اٹھایا۔
چاہا کہ منع کریں تب تک پھُپیا نے جھٹ پٹ خوب ڈھیر ساری کریم ہتھیلی پر رکھ کر اپنے پچکے گالوں پر مل ڈالی۔
''ہائے اللہ............ میں مرگئی......... زہر ہے زہر............ اے بٹیا شیشی ہی زہر رکھے ہوکا؟'' وہ چلاّنے لگیں۔ باجی ہنسی کے مارے بستر پر ہی لوٹنے لگیں۔
پھُپیا کی چیخ سن کر سارا خاندان جمع ہوگیا۔ ابّا بھی دوڑ کر آگئے۔
''کیا ہوا؟'' کا شور مچا۔
پھُپیا نے بڑی معصومیت سے آنسو بھری آنکھوں سے باجی کو دیکھ کر کہا ''اے جانے شیشی میں کیا دھرے تھیں آگ لگ گئی آگ........''
وہ اپنا منھ پیٹ رہی تھیں۔
باجی نے ہنستے۔ ہنستے بتایا کہ ''پھُپیا نے Vicks (وِکس) لگالی ہے منھ پر کریم سمجھ کر اس لیے منہ جل رہا ہے، تھوڑی دیر میں ٹھنڈک پڑ جائے گی۔''
ابّا کا فلک شگاف قہقہہ گونجا:

"واہ ری جنتی ...."

کچھ عرصہ پہلے وہ اپنے دانت 'Vim' (ومِ) سے مانج چکی تھیں کہ جھل مل ستاروں جیسے دمک جائیں گے۔ جیسے اسٹیل کے برتن چماچم ہو جاتے ہیں۔ دانت تو دانت مسوڑھے تک کٹ گئے تھے پھیّا کے۔ تب بھی ایسا ہی ہنگامہ ہو چکا تھا۔ ابا خوب ہنستے تھے......... برسوں سے حویلی سونی پڑی ہے۔ وہاں کے مکیں رواداری بھول چکے ہیں۔ اب کوئی قہقہہ وہاں نہیں گونجتا۔ پھیّا بھی برسوں سے واپس نہیں آئیں۔

شاید اپنے کسی پیارے بھائی یا بہن کے پاس ہوں گی یا شاید اس فانی دنیا سے کوچ کر گئیں ہوں۔ کسی کو نہیں معلوم...........

خدا کرے پھیّا اپنے جس بھی خالہ کے چچا کی نانی کے بھتیجی کی پوتی کے نواسے کے یہاں ہوں، خوش و خرم ہوں!!

........☆........

شہرِ اشتراک

معزز گستاخ

● انتون چیخوف

ترجمہ: رفیق شاہین

ایکس کلب ہیں امدادی امور کے تعلق سے فینسی ڈریس رقص جاری تھا۔ اس انداز کا رقص طبقۂ اشرافیہ سے وابستہ اعلیٰ و معزز خاندان کی نوخیز لڑکیوں میں ''بال پارٹی'' کے نام سے موسوم تھا اور اُسے خاصی مقبولیت حاصل تھی۔

رات کے بارہ بجے کا عمل تھا۔ وہ دانشور حضرات جنھیں رقص میں دلچسپی نہیں تھی اور نہ جن کے چہرے ڈھکے ہوئے تھے، تعداد میں پانچ تھے، وہ مطالعہ گاہ کی وسیع و عریض میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ اور اُن کی ناکیں اور داڑھیاں اخبارات کے اوراق میں چھپی ہوئی تھیں۔ مطالعے کے دوران اُونگھتے ہوئے وہ سینٹس پیٹرس برگ سے شائع ہونے والے اخبارات کی آزادانہ اور غیر جانبدارانہ صحافت کی تعریف میں تبادلۂ خیال فرما رہے تھے۔ رقص گاہ میں گونجتی تیز موسیقی کی ترنم ریز ترنگیں لہر در لہر یہاں بھی سُنائی پڑ رہی تھیں۔ ساتھ ہی خدمتگاروں کے ادھر سے اُدھر گردش کرتے وقت ان کے قدموں آوازوں اور ٹرے میں بوتلوں اور گلاسوں کے باہم ٹکرانے کا شور بھی کچھ کم نہ تھا۔ البتہ مطالعہ گاہ کی اپنی خاموشی اپنی جگہ برقرار تھی۔

''یہ جگہ خاصی پُر سکون اور آرام دہ معلوم ہوتی ہے۔'' یہ سرگوشی گھٹی گھٹی اور مدھم مدھم سی آواز چمنی سے برآمد ہوتی سی محسوس ہوئی۔ ''اندر آؤ بچیو!..... یہاں..... اس طرف.....''

اور اس کے ساتھ ہی ''دھاڑ'' سے دروازہ کھلا اور ایک کشادہ شانوں والا ایک ادھیڑ مرد جو قد آور بھی تھا اور جو اُس وقت کوچوان کا لباس زیب تن کیے ہوئے تھا اور جس کے چہرے پر نقاب بھی پڑی تھی ایکا ایکی مطالعہ گاہ میں گھس آیا۔ اُس کے ہیٹ پر مور کے پر سجے تھے اُس کے پیچھے دو خواتین اور بھی تھیں جن کے چہرے اُسی کی طرح

پوشیدہ تھے وہ بھی اندر آ گئیں اور جس کی ٹرے میں شراب کی بوتلیں اور گلاس تھے وہ خادم بھی اندر چلا آیا۔

''یہ کمرہ تو بڑا پُر سکون اور آرام دہ ہے.... ٹرے میز پر رکھ دو.... اور ہاں میری چہکتی بلبلو تمھارے بیٹھنے کا انتظام ابھی کرتا ہوں....'' اتنا کہہ کر وہاں بیٹھے دانشوروں کا جائزہ لے کر اُس نے درشت لہجے میں کہا۔

''ہاں تو شریف لوگو! وہ رہا باہر جانے کا راستہ۔ اُٹھو..... کباب میں ہڈّی مت بنو..... اب یہاں ہماری بُلبلیں اپنے حُسن کے جلوے لُٹائینگی۔'' اتنا کہہ کر اس نے اپنے دراز ہاتھوں سے سارے اخبار میز کے ایک کنارے سمیٹ دیے۔

''یہ کتب بینی کی جگہ نہیں ہے.... اپنی صحافیانہ موشگافیاں اور سیاسی تبصرے اپنے دفتروں یا ڈرائنگ روموں میں بیٹھ کر کرو اور بلا تاخیر یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤ..... چھٹو.....''

''دیکھیے میں عرض کروں گا کہ آپ شور نہ کیجیے۔'' دانشوروں میں سے ایک نے جو آنکھوں پر عینک چڑھائے تھا، اپنی نظریں دراندازکے نقاب پر مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ ''محترم آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ مطالعے کا کمرہ ہے۔ یہ شراب پینے کے لیے بار نہیں ہے۔ بہتر ہوگا آپ لوگ بار میں تشریف لے جائیں۔ یہاں شغلِ مے نوشی ممنوع ہے۔'' ''کیوں ہے ممنوع؟ کیا یہاں کی میزیں موم کی بنی ہیں کہ پگھل جائیں گی یا چھت کمزور ہے کہ سر پر گر پڑیگی۔ بہت ہو گیا منہ سے پائپ نکالو اخبار باہر پھینکو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ بہت ہو گیا مطالعہ۔ بہت کر لیا قابلیت میں اضافہ۔ آنکھوں کی بینائی سے اور ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ اب چلتے بھی بنو، مجھے انتظار سے نفرت ہے۔ سمجھے آپ لوگ۔''

بیرے شراب کی ٹرے میز پر رکھ دی اور پونچھے کا سفید کپڑا کلائی پر ڈالے دروازے کے قریب کھڑا ہو گیا۔ خواتین جن کا بے صبراپن اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا، ایکا ایکی شراب پر بُری طرح ٹوٹ پڑیں۔ مور کے پروں سے مزین ہیٹ والا درانداز جو بوتل سے گلاس میں اپنے لیے شراب انڈیل رہا تھا دانشوروں کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہوئے بُرا سا منہ بنا کر بڑبڑانے لگا۔

''ان لوگوں کو کوئی خبط الحواس ہی دانشور تسلیم کریگا جو شراب پر اخبار کو ترجیح دیتے ہیں اور اے یکتائے روزگار دانشورو، سچ بات تو یہ ہے کہ آپ حضرات اخبار بینی پر قانع اس وجہ سے ہیں کہ اس گلگوں رخسار پری شراب کو شیشے میں اتارنے کے لیے آپ تہی دست اور قلاش ہیں۔ بولیے کچھ غلط تو نہیں کہا میں نے ہا....... ہا...... ہا اس نے قہقہے لگا کر کہا :

''ہاں تو اے عقل کے دشمنو! اپنی دانشوری کے جھوٹے، فرضی اور تصوراتی قلعوں کے حصار و امصار کو توڑ کر باہر نکلو اور بہتر ہوگا کہ یہ گورکھ دھندا چھوڑ کر شراب پیو۔ صبح پیو اور شام پیو....... اور اس کے ساتھ ہی اُس نے عینک والے دانشور کے ہاتھ سے اخبار جھپٹ لیا۔ اُس کی اس بیہودہ حرکت پر اُس کا چہرہ پہلے سفید اور پھر ایک دم لال بھبھوکا ہو اٹھا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور ساتھیوں نے اُس ہیٹ والے کی طرف۔

''جناب والا! مجھے پھر کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ غلطی پر ہیں۔ آپ مطالعہ گاہ کو شراب خانے میں تبدیل کیے دے رہے ہیں۔ آپ کا طرزِ عمل غیر مہذبانہ اور غیر مخلصانہ ہے۔ ذلت آمیز ہے۔ آپ شرفا کے ہاتھ سے اخبار چھین کر پھاڑ رہے ہیں۔ میں اس بیہودہ حرکت کی اجازت آپ کو ہرگز بھی نہیں دوں گا جناب والا! آپ جانتے ہیں آپ اس وقت کس سے مخاطب ہیں؟ میں زیستا کوف ہوں۔ بینک منیجر۔''

''ہوا کریں۔ ہونگے زیستا کوف۔ اس سے میری صحت پر تو کچھ فرق نہیں پڑتا اور رہی اخبار پھاڑنے کی بات تو یہ لیجیے۔'' اتنا کہہ کر اُس نے سارے اخبار اُٹھا کر اُن کو دھجیاں دھجیاں کرنا شروع کر دیا۔

''اے شریف آدمی! آخر یہ سب کیا ہے؟ کیوں کر رہے ہو ایسا؟'' زیستا کوف نے چراغ پا ہو کر کہا۔

''یہ اشتعال انگیز ہے۔ غیر شریفانہ ہے۔ جارحانہ ہے۔ آپ مجھے غصہ دلا رہے ہیں۔'' ''ارے واہ! ہمارا بونا سُورما غصے میں ہے.... ڈر گیا ہوں...... خوف زدہ ہو گیا ہوں....... دل دھڑک اُٹھا ہے...... ارے میری تو ٹانگیں بھی کانپ رہی ہیں۔ معزز شریف آدمی! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ سے ہمکلام ہونے کا مجھے ذرا بھی شوق نہیں ہے۔ مجھے تنہائی چاہیے تاکہ خلوت میں اپنی ان بلبلوں کو اپنی آغوش میں لے سکوں۔ کباب میں ہڈی مجھے اچھی نہیں لگتی۔ درد سر مت بنو۔ جاؤ یہاں سے بہلوخین جاؤ۔ اب آپ سوچنے بیٹھ گئے..... بند کرو یہ ڈرامہ جاؤ۔ میری بات سمجھ میں نہیں آئی؟۔ میں کہہ رہا ہوں دفع ہونا پسند کرو گے یا پھر میں آپ لوگوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے باہر پھینکوں؟''

''میں کہتا ہوں یہاں یہ ہو کیا رہا ہے؟'' یتیموں کی عدالت کے خزانچی بہلوخین نے شانے اُچکا کر کہا۔ ''میری سمجھ میں تو یہی نہیں آتا کہ اچانک ہی ایک لفنگا دروازہ کھول کر جبریہ اندر گھس پڑتا ہے اور شروع کر دیتا ہے غنڈہ گروی..... آخر یہ ہے کیا۔؟''

''یہ کیا لفظ بولا ''لفنگا''۔ مشتعل ہو اُٹھنے والے دراندازنے غیض وغضب کی حالت میں اتنی زور سے میز پر مُکا مارا کہ میز پر رکھی ٹرے کے گلاس ٹرے سے اُچھل کر میز پر لڑھکنے لگے۔

''بے وقوف عقلمندو! تم سمجھتے ہو میں نقاب میں ہوں اس لیے تمھیں مجھے بُرا بھلا کہنے کا اجازت نامہ مل گیا ہے۔ بس بہت ہو چکا۔ مسٹر بینک منیجر اپنے ساتھیوں کو اپنے ساتھ لو اور بلا تاخیر یہاں سے دفع ہو جاؤ۔'' ''دیکھتے ہیں ہمیں یہاں سے کون نکالتا ہے۔ بس ایک منٹ میں پتہ چل جائے گا۔'' زیستا کوف نے جس کی عینک کے شیشے پسینے سے دھندلا چکے تھے، انتہائی برہم ہو کر کہا۔ ''ابھی اس بدتمیزی کا مزا چکھاتا ہوں۔ کلب کے منیجر کو بلاؤ۔'' ایک ہی منٹ میں لال بالوں والا پستہ قد منیجر وہاں پہنچ گیا۔ اس کے کوٹ کے کالر پر نیلا پیلا بلا لگا ہوا تھا۔ شاید وہ رقص میں شامل رہا ہوگا۔ اُس کی سانسیں بے ترتیب تھیں اُس نے آتے ہی روئے سخن دراندازوں کی طرف کر کے کہا:

''مہربانی کر کے آپ لوگ یہاں سے تشریف لے جائیں اور اگر شراب کا شغل کرنا ہے تو کسی بار میں

جا کر بیٹھیں۔ یہ مطالعہ گاہ ہے کوئی میخانہ نہیں ہے۔''

''ارے واہ! آپ کہاں سے آٹپکے۔ میں نے تو آپ کو بلایا نہیں تھا۔ بولیے بلایا تھا کیا؟ دراندازنے شوخی کا مظاہرہ کیا۔ ''بدتمیزی مت کیجیے۔ اور جیسا میں نے کہا ہے ویسا ہی کیجئے۔ اسی میں آپ کا بھلا ہے۔'' منیجر نے چڑ کر کہا۔

''مذاق بند کرو منیجر۔'' درانداز شخص نے کہا۔ ''منیجر ہونے کے ناطے تم ایک بااختیار شخصیت ہو۔ اب میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے اختیارات کو بروئے کار لا کر ان تمام مسخروں کو ایک منٹ کے اندر یہاں سے چلتا کر دو کیوں کہ میرے ساتھ یہ جو پیکرِ شباب ہیں۔'' اس نے اپنے ساتھ والی خواتین کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ بلبلیں بڑی شرمیلی واقع ہوئی ہیں اور اُن کو غیر متعلقین کی موجودگی ایک آنکھ بھی نہیں بھاتی ہے۔ ان کی حجاب شکنی میرے ذمّے ہے کیوں کہ ان پر میں بہت سی دولت صرف کر چکا ہوں اور اس کے بدلے میں اب جام شراب و شباب سے سیراب و شاداب ہونا چاہتا ہوں۔''

''یہ اجڈ گنوار تو یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ مطالعہ گاہ نہ تو کوئی میخانہ ہے اور نہ ہی کوئی قحبہ خانہ ہے۔'' زیستا کوف نے چیخ کر کہا۔

''ایوسترات اسپریدونچ کو بلاؤ۔'' تھوڑی ہی دیر میں پولس کی وردی میں ملبوس ایک قبیلہ فرتوت سے متعلق بوڑھا وہاں آموجود ہوا۔ ''بکواس بند کیجیے اور یہاں سے فوراً دفع ہو جائیے۔'' وہ بہت تپا ہوا تھا اور غصّے کے عالم اس کے گل مچّھے مرتعش ہو اُٹھے تھے۔ اور غیض و غضب سے اُس کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر نکلی پڑ رہی تھیں۔

''ارے واہ! تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔'' درانداز شخص نے اس کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔ ''میں خوف زدہ ہو گیا ہوں۔ خدا کی قسم تم نے تو مجھے اتنا زیادہ ڈرا دیا ہے کہ مارے دہشت و ہیبت کے میری تو جان ہی نکلی جا رہی ہے۔ ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ واللہ کیا شکل و صورت پائی ہے۔ ایسی مضحکہ خیز صورت دیکھنے سے تو مر جانا کہیں اچھا ہے۔ بلّی کے سے گل مچّھے اور بحری قزاق کی سی دہشتناک وحشی آنکھیں۔ ہا..... ہا..... ہا۔''

''بند کرو یہ بے ہودگی اور بدتمیزی۔'' ایوسترات نے اپنی بے جان سی دہاڑ میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا جس سے اس کا سارا جسم بڑی قابل رحم حالت میں بُری طرح لرز اُٹھا۔ اُس نے پھولی سانس کے وساتھ ایک بار پھر اپنی چلاّہٹ میں جان ڈالنے کی کوشش کر ڈالی۔

مطالعہ گاہ میں قیامت کا شور برپا ہو گیا۔ بے ہنگم شور و شرابے سے کمرے کے در و دیوار گونج رہے تھے۔ لرز رہے تھے۔ اسپریدونچ کا چہرہ عالمِ غیض و غضب میں اُس بلّی کا سا نظر آ رہا تھا جس کا چہرہ کبوتر کے خون سے لال ہو گیا ہو۔ وہ ہیجانی اور ہذیانی کیفیت میں بار بار اپنے پیر زمین پر پٹک رہا تھا۔ زیستا گوف چلاّ رہا تھا۔ یبلوخین چلاّ رہا تھا۔ سارے دانشور چیخ چلاّ رہے تھے مگر یہ ساری کی ساری آوازیں درانداز شخص کی بھاری اور

گونجدار آواز کے وزن تلے دبی کچلی جارہی تھیں۔ اس ہنگامے اور شوروغل کا علم کلب میں موجود بھی لوگوں کو ہو چکا تھا۔ اور موجودہ نازک صورتحال کے پیش نظر رقص کا سلسلہ ختم کردیا گیا تھا اور اب مہمان حضرات رقص گاہ سے باہر آکر مطالعہ گاہ کی طرف جوق در جوق آنے لگے کہ دیکھیں وہاں کیا تماشہ ہو رہا ہے۔

ایوسترات اسپریدونچ نے جب دیکھا کہ پولس والی دھونس اور دانٹ ڈپٹ مدّ مقابل پر بے اثر ہو چکی ہے تو اُس نے فوراً ہی بہت سے پولس والوں کو اپنے پاس بلالیا اور اُس شخص کے خلاف رپورٹ لکھنے بیٹھ گیا۔

''لکھو لکھو رپورٹ.... ضرور لکھو۔'' نقاب پوش نے قلم کے نیچے اپنی ہتھیلی لگاتے ہوئے تمسخر کیا۔ اب مجھ بے آسرا لاچار اور بے یارو مددگار کا کیا حشر ہوگا.... میرا تو دل ڈوبا جارہا ہے... سر چکرا رہا ہے... اُف گیا.... میں تو گیا..... ہا..... ہا'' پھر اُس نے یک بیک سنجیدگی اختیار کرلی۔ ''میں آپ کے کام میں مخل نہیں ہونگا آپ شوق سے لکھیے رپورٹ..... اچھا تو لکھ گئی رپورٹ۔ ہو گئے سب کے دستخط؟...... اب باادب باملاحظہ ہوشیار.... ایک دو تین.... اور پھر فوراً ہی اپنے چہرے سے نقاب اُلٹ کر اپنے اس عمل کے ردِ عمل کا وہاں موجود لوگوں کے چہروں پر جائزہ لینے لگا۔ دراصل وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اُس کی شناخت کو لوگ کس رنگ میں قبول کرتے ہیں۔ نشے میں دھت تو وہ تھا ہی وہ کرسی سے گرتے گرتے بچا اور اپنی اس حالت پر پھر سے قہقہہ زن ہو اُٹھا۔ ہا .... ہا......... ہا.........۔''

اُس کی نقاب کشائی کا ردِ عمل واقعی حیرت انگیز اور قابلِ دید تھا۔ دانشوروں کے چہرے فق تھے۔ اُن پر عجیب سی بوکھلاہٹ طاری تھی۔ وہ یا تو ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے یا پھر اضطراری کیفیت میں پہلو بدلتے ہوئے اپنی گدھیاں کھجلا رہے تھے۔ ایکا ایکی پیاتی گوروف کی صدائے سرزنش سے طلسمِ تحیّرات کا شیرازہ بکھر گیا۔

''آپ لوگ اب ایک دوسرے کا منہ تکنا بند کیجیے اور بلا تاخیر یہاں سے باہر تشریف لے جائیے۔''

''اتنا سنتے ہی دانشور حضرات بنا چوں چرا کیے اور دم سادھے مطالعہ گاہ سے باہر چلے گئے۔ ایوسترات اسپریدونچ بار بار کھانس بھار رہا تھا اور گدھی کھجلا رہا تھا جیسے انجانے میں اُس سے کوئی بڑا قصور سرزد ہو گیا ہے۔ یہ سارا ہنگامہ جس شخص نے کھڑا کیا تھا اُس کے نقاب الٹتے ہی اب سبھی نے اُسے اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ وہ پیاتی گوروف تھا جو طبعاً ستیزہ کار اور جھگڑالو ہونے کے باوجود چیرٹی شوز برائے قومی امدادی فنڈ کے اہتمام وانعقاد میں پیش پیش رہا کرتا تھا۔ علاوہ ازیں محکمہ تعلیم وتعلّم میں بھی اس کا خاصہ عمل دخل تھا۔ مقامی اخبارات اس کی تعریفوں کے پُل باندھتے تھکتے نہیں تھے۔

دانشوروں کے چلے جانے کے بعد پیاتی گوروف نے فوراً ہی مطالعہ گاہ کا دروازہ اندر سے مقفل کرلیا تھا۔ اور کچھ وقفے کے بعد جب کلب کا خدمت گار مشروب سے بھری ٹرے ہاتھوں میں تھامے مطالعہ گاہ کی طرف جارہا تھا ایوسترات اسپریدونچ نے اُسے راستے میں ہی روک لیا اور اُسے قہر آلود نگاہوں سے گھورتے ہوئے ترش لہجے میں کہا:

"تجھے تو معلوم تھا کہ وہ کون ہیں پھر تو نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟"
"مجھے بتانے کے لیے منع کر دیا گیا تھا۔"
تجھے تو جیل میں ڈال کر جب تجھ پر ڈنڈے بجاؤں گا تب سمجھے گا کہ مجھے نہ بتانے کا مطلب کیا ہوتا ہے...... بدمعاش کہیں کا..... چل بھاگ یہاں سے۔" پھر وہ مطالعہ گاہ کے باہر سراسیمہ سے کھڑے دانشوروں سے مخاطب ہو گیا:

"اور آپ لوگوں نے تو غیر ذمے داری اور نادانی کے سارے رکارڈ ہی توڑ دیے اور ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ مطالعہ گاہ آپ کا ڈرائنگ روم تو ہے نہیں۔ وہاں سے دس منٹ کے لیے ٹل جاتے تو کیا بگڑ جاتا۔ یہ صورتحال آپ ہی کی بگاڑی ہوئی ہے اب اپنی گلوخلاصی آپ خود ہی کیجیے۔ آپ کے طور طریقے میری سمجھ سے تو بالاتر ہیں۔"

دانشور حضرات پریشاں حال اور خجل سے بار ندامت سے سر جھکائے کلب کے احاطے میں چہل قدمی فرما رہے تھے۔ انجانے میں انہوں نے پیاتی گوروف سے جو بدسلوکی روا رکھی تھی اس کے دوررس نتائج کے بارے میں سوچ سوچ کر وہ پریشان ہوا ٹھے تھے۔ یہ بات اُن کے علم میں اچھی طرح آ چکی تھی کہ پیاتی گوروف اُن سے ناراض ہے اور انتقام لینے کا تہیہ کر چکا ہے۔ انہیں یہ بات بھی پتہ چل چکی تھی کہ جیسے ہی اُس کی بیویوں اور بیٹیوں کو معلوم ہوا کہ کلب میں پیاتی گوروف کی بے عزّتی کی گئی ہے احتجاجاً وہ فوراً ہی کلب چھوڑ کر گھر چلی گئی تھیں۔

رات دو بجے نشے کی حالت میں جھومتا لڑکھڑاتا پیاتی گوروف مطالعہ گاہ سے باہر نکلا تو اُس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ اسی حالت میں وہ جیسے تیسے بال روم میں پہنچا اور وہاں پیانو پر سر رکھ کر زور زور سے خرّاٹے بھرنے لگا۔

"موسیقی بند کیجیے۔" منتظمین نے پیانو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ دیکھتے نہیں پیاتی گوروف صاحب محوِ خواب ہیں۔"

"حضور والا!" یبلوخین نے امیر زادے کے کان میں سرگوشی کی۔ "کیا آپ گھر تشریف لے جانا پسند فرمائیں گے؟"

پیاتی گوروف کے لب کچھ یوں مرتعش ہوئے جیسے وہ پھونک مار کر ناک پر بیٹھی مکھی کو اڑانے کی کوشش میں لگا ہے۔

"یوار ایکسیلینسی! کیا آپ کو گھر پہنچا دیا جائے؟" یبلوخین نے مکرّر ارشاد فرمایا— "اگر آپ رضامند ہوں تو ہم آپ کی حویلی سے گھوڑا گاڑی منگوالیں۔"

"ایہہ! کون ہیں آپ؟......... کیا چاہتے ہیں؟"

"حضور والا! خادم یہ عرض کر رہا ہے کہ کیا آپ کو گھر پہنچوا دیا جائے؟"

"آں..... ہاں ہاں...... گھر...... مجھے گھر پہنچوا دیجیے۔"

یبلوخین نے خوشی خوشی اُسے اُس کے قدموں پر کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ موقع غنیمت جان کر باقی کے دانشور بھی لپک کر وہاں پہنچ گئے اور اس کام میں یبلوخین کی مدد کرنے لگے۔ اور بالآخر سب مل کر اُس اعلیٰ خاندان کے بگڑے رئیس کو کسی نہ کسی طرح سہارا دے کر گاڑی تک پہنچانے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ اسے گاڑی میں سوار کرانے کے بعد زیستا کوف نے غلامانہ اور خادمانہ چاپلوسی اور قصیدہ خوانی کا راگ الاپتے ہوئے کہا:

''حضور والا! آج تو آپ نے تاریخی نوعیت کا جلال وکمال دکھا کر ہم سبھی کو ورطۂ حیرت میں ڈالدیا ہے۔ بیک وقت اتنے سارے لوگوں کو بے وقوف اور احمق ثابت کر کے رکھ دینا کوئی بچّوں کا کھیل نہیں ہے، لوہے کے چنے چبانا ہے۔ یہ انتہائی مشکل کام تو کوئی آپ جیسا ہنر یافتہ اور منجھا ہوا فنکار ہی کر سکتا ہے۔ ہم سبھی غچا کھا گئے تھے۔ اور میرے تو ہاتھوں کے طوطے ہی اُڑ گئے تھے...... لگ ہی نہیں رہا تھا کہ حضور والا مذاق فرما رہے ہیں...... اور اب تو ہنسی ضبط کرنا بھی محال ہو رہا ہے۔ ہا...... ہا...... ہا...... مجھے تو کبھی تھیٹر تک میں ہنسی نہیں آئی تھی مگر اب حضور کی بدولت آ رہی ہے تو آئے ہی چلی جا رہی ہے۔ ہا...... ہا...... ہا...... بہر کیف آج کے یہ تاریخی لمحات جو میرے ذہن پر نقش ہو چکے ہیں میں تاحیات فراموش نہ کر سکوں گا۔''

پیاتی گوروف کی گھوڑا گاڑی اب حرکت میں آ چکی تھی۔ گاڑی کی روانگی پر سبھی دانشوروں نے چین کی سانس لی۔ وہ شدید ذہنی تناؤ جس کا ان کے دلوں پر مسلسل دباؤ پڑ رہا تھا اس کے اچانک دور ہو جانے پر وہ لوگ اب بڑی راحت اور سکون محسوس کر رہے تھے۔ اُن کے چہروں کی رونق بحال ہو گئی تھی۔

''شاید آپ کو یہ نہیں معلوم'' — زیستا کوف نے ڈینگ چھوڑی۔ چلتے وقت اُنھوں نے مجھ سے مصافحہ بھی تو کیا تھا۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو کہ ان کا دل ہماری طرف سے صاف ہو جائے۔ اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔'' ایواسترات اسپریدونچ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا:

''چونکہ ان کے طور طریقے تہذیب و اخلاق سے مبّرا ہیں اس لیے ہم انہیں ایک اچھا انسان تو نہیں کہہ سکتے پھر بھی ہمیں یہ بات ہرگز فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ وہ طبقۂ اشرافیہ سے وابستہ ایک بارسوخ رئیس زادے اور ہمارے محسن بھی ہیں۔''

☆☆☆

☆ نوٹ: خاندانی رئیس اور معزز شہری ہونا اُنیسویں صدی کے روس میں اعلیٰ درجے کا ایک سرکاری منصب تھا جس کے اختیارات بے حد وسیع ہوتے تھے۔ (ر۔ش)

......❀☆❀......

"A certain uneasiness seems justified, partly because there are different types of cognition, and one of them might be more appropriate than another for the attainment of this goal, so that we could make a bad choice of means; and partly because cognition is a faculty of a definite kind and scope, and thus, without a more precise definition of its nature and limits, we might grasp clouds of error instead of the heaven of truth."

● G.W.F. Hegel: Phenomenology of Spirit, Translated by: A. V. Miller, Pub. by Motilal Banarsidass, 1998, Page - 46

افسانے کا منصب

● وہاب اشرفی

تقریباً ایک صدی پہلے فریڈرک بی پرکنس نے افسانے کے منصب پر اپنے خیالات قلم بند کیے تھے جو اس کی کتاب "Devil Puzzlers And Other Studies" میں پیش لفظ کے طور پر شریک ہیں۔ پرکنس انیسویں صدی کے اواخر میں معیاری رسالوں کے مدیر کی حیثیت سے کافی مشہور تھا اور اس کی رائیں اپنے وقت میں مستند تصور کی جاتی تھیں۔ افسانے کی فنی حیثیت ناول کے مقابلے میں، اس کے وقار نیز اس کے متعدد دوسرے اوصاف سے متعلق اس کے خیالات آج بھی قابل غور ہو سکتے ہیں۔ اس کے جملے ہیں:

> ''میں افسانے کے فن کے بارے میں بہت اونچے خیالات رکھتا ہوں۔ ایسے لوگ زیادہ نہیں ہیں جو اچھے افسانے لکھ سکتے ہوں، مختصر افسانے کی حیثیت طویل (یعنی ناول) کے مقابلے میں وہی ہے جو پہاڑ کے مقابلے میں ہیرے کی ہے۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ نہ تو ایڈگر الن پو کے افسانوں کے مجموعے زیادہ فروخت ہوئے اور نہ ہی ہتھنیل ہاتھورن کے۔ لیکن اس کے بعد بھی انگریزی ادب کی صنف کے یہ دو لکھنے والے سب سے اچھے ہیں......''
>
> ''......افسانے کا فن جس عظمت کا مستحق ہے، اس کی طرف توجہ نہیں دی گئی ہے۔ ایسی بات نہیں کہ افسانہ نثر کی عظیم ترین صنف ہے، جس طرح یہ نہیں کہا جا سکتا کہ لیرک شاعری کی بہترین صنف ہے۔ لیکن لیرک ہی کی طرح افسانے کا مقام بلند ہے۔ لیرک کی جو حیثیت رزمیہ یا بیانیہ یا ڈرامائی نظموں کے مقابلے میں ہو سکتی ہے، افسانے کی وہی حیثیت نثر کی دوسری صنفوں کے مقابلے میں ہے۔ لیرک ہی کی طرح ایک اچھا افسانہ عظیم، غیر معمولی اور کم یاب ذہن کی پیداوار ہوتا ہے......''

ممکن ہے کہ مغربی ادب کے بعض واقف کار پرکنس کے انسائیکلو پیڈیائی ذہن کے قائل ہوتے ہوئے بھی اسے پرکاش پنڈت کی صف میں کھڑا کر دیں اور افسانے کے بارے میں اس کے خیالات کو قابلِ اعتنا تصور نہ کریں۔ لیکن میرے خیال میں ایڈگر الن پو کی رائیں اتنی آسانی سے رد نہیں کی جاسکتیں اس لیے بھی کہ جدیدیت کے بہت سے رجحانات کا منبع عالمی شہرت کے مالک کئی دوسرے فن کاروں کے علاوہ پو کی نگارشات بھی ہیں، خصوصاً علامت نگاری کے ضمن میں اس کے کارنامے کبھی فراموش نہیں کیے جاسکتے۔ اس کی عظمت کے قائل تو ملارمے اور بودلیئر بھی تھے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی ''فلاسفی آف کمپوزیشن'' شعری محاسن کے تعین میں اس حد تک معاون ہوئی ہے کہ اب ہم کسی شعر کے مفہوم کی تلاش میں اس کی صوتی کیفیت اور حواس خمسہ پر اس کے اثرات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ بہر حال افسانے یا کہانی کے بارے میں پو نے اپنے تاثرات ہاتھورن کی کہانیوں کے جائزے میں بیان کیے تھے اور اب یہ اس کی ''کمپلیٹ ورکس'' میں چھپ گئے ہیں، وہ لکھتا ہے:

''... ہماری رائے میں اس امر سے اختلاف نہیں ہوسکتا کہ اعلیٰ ترین ذہن کی بہترین جائے ورزش نثری حصے میں کہانی ہی ہے... شاعری کی تمام صورتوں میں تاثر یا اثر کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے اور یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ یہ وحدت اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی، جب تک کہ ہم کسی تخلیق کو ایک ہی بیٹھک میں نہ پڑھ ڈالیں.... تمام اعلیٰ جذبے لازمی طور پر گزراں ہوتے ہیں، لہٰذا طویل نظم فریب محض ہے..... رزمیہ آرٹ ناپختہ ذہن کی پیداوار ہے اور اس کا عہد ختم ہو چکا ہے اس طرح کوئی نظم جو ضرورت سے زیادہ چھوٹی ہوتی ہے وہ واضح اثر تو قائم کر سکتی ہے لیکن شدید اور بسیط نہیں اس لیے غایت اختصار عیب ہے لیکن غایت طوالت ناقابلِ معافی گناہ.... ناول اپنی طوالت کے باعث قابلِ اعتراض صنف ہے اور چونکہ یہ ایک ہی نشست میں نہیں پڑھا جاسکتا اس لیے اثر کی طاقت کھو دیتا ہے.... مطالعے کے وقفوں کی وجہ سے دوسری دنیاوی دلچسپیاں مخل ہو جاتی ہیں اور کتاب کے مجموعی تاثر کو یا تو تبدیل کر دیتی ہیں یا مسخ کر دیتی ہیں.....''۔

فکشن کے ایسے نقادوں کی کمی نہیں جو پرکنس اور پو کی طرح افسانے کو ناول پر ترجیح دیتے ہوں۔ ایسے نقادوں میں برینڈر میتھیوز کا نام خاصا مشہور ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں یہ ڈرامہ نگار، نقاد اور افسانہ نگار کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اس کی کتاب ''فلاسفی آف دی شارٹ اسٹوری'' کافی مشہور ہوئی تھی اور اس کے چھپتے ہی ناول اور افسانے کے تقابلی منصب کے بارے میں اچھی خاصی بحث چھڑ گئی تھی۔ اس کی رائے آج بھی قابلِ اعتنا ہے۔ اسی نے لکھا ہے:

''...... لیکن کئی چیزیں جو افسانہ نگار کے لیے ضروری ہیں، ناول نگار کے لیے ضروری نہیں۔ ناول نگار بہت وقت لے سکتا ہے، اسے چکر کاٹنے کی کافی گنجائش ہے لیکن

افسانہ نگار کو تو لازمی طور پر اختصار، جامعیت اور غایت جامعیت سے کام لینا ہے......
پھر ناول نگار کے یہاں عمومیت ہو سکتی ہے، وہ اپنی بہترین قوتوں کو حقائق کی تصویر کشی کی طرف راغب کر سکتا ہے۔ اگر وہ حقیقی زندگی کی جھلک دکھا دیتا ہے تو ہماری تسکین ہو جاتی ہے، پر افسانہ نگار کے یہاں اپج اور کاریگری ہونی ہی چاہیے...... سچ بات تو یہ ہے کہ ایسا شخص جس کے یہاں اختراع کی صلاحیت، جامعیت اور کاریگری نہیں ہے، کبھی افسانہ نگار کی حیثیت سے کامیاب نہیں ہوا......۔''

ظاہر ہے کہ برینڈر کے سامنے جوائس، پروست، کامیو، کافکا یا سارتر جیسے ناول نگاروں کی مثالیں نہیں تھیں، ورنہ وہ ناول کے ضمن میں عمومیت، بہتر اپج اور صناعی کے فقدان کی باتیں نہیں کرتا۔ لیکن ناول نگاروں کے چکّر کاٹنے والی بات تو آج بھی سچی معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ کتنے ہی معیاری ناول محض اپنی طوالت کے باعث پڑھے نہیں جاتے، اس لیے مختصر کر دیئے گئے ہیں اور ناولوں کو مختصر کر کے فروخت کرنا ناشروں کی ایک مخصوص پالیسی بن گئی ہے۔ ایسی ابرجڈ صورت سے کسی ناول پر کیا کچھ صدمہ پہنچتا ہے۔ یہ ایک الگ بحث ہے۔ لیکن مختصر کیے ہوئے ناول خوب مقبول ہیں، پر افسانے کے ساتھ ایسا کبھی نہیں کیا جاتا۔ اگر افسانے کو جہاں تہاں سے کاٹ دیا جائے تو اس کا وجود ہی معدوم ہو جائے گا، اس لیے کہ افسانے کا مختصر سانچہ افسانہ نگار کو ''چکّر کاٹنے'' کی قطعی اجازت نہیں دیتا۔ افسانہ نگار کو بہر صورت اختصار اور جامعیت سے کام لینا ہی ہے اور یہ کام کتنا مشکل ہے، اس کا اندازہ ہنری جیمز جیسے عظیم فن کار کو بھی ہوا ہے۔

افسانے کے بارے میں ہنری جیمز کے خیالات اس کے مضمون "On The Genesis of The Real Thing" میں ملتے ہیں۔ یہ مضمون اس کی کتاب ''نوٹ بکس'' میں شریک ہے۔ جیمز اس امر کا اظہار کرتا ہے کہ افسانے کا فن ایک مشکل فن ہے۔ مختصر سانچے میں باتوں کا بیان سخت ریاض چاہتا ہے۔ اس نے اپنی مشکل کا اظہار کیا ہے کہ سات ہزار سے دس ہزار الفاظ کے حدود میں افسانے لکھنا اس کے لیے ایک طرح کی آزمائش تھی۔ جیمز افسانے کو ''خوبصورت، چمک دار، تیز اور نمایاں ہیرا'' تصور کرتا ہے اور موپاساں کے افسانوں کی مثال پیش کرتا ہے۔ افسانے کا مختصر سانچہ کتنا ریاض چاہتا ہے۔ اس کا اندازہ چیخوف کی بھی نگارشات سے ہو سکتا ہے۔ چیخوف نے غالباً افسانے پر تفصیلی اور مدلّل کوئی مضمون نہیں لکھا۔ لیکن اس نے اپنے بعض خطوط میں افسانے کی فنّی عظمت کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ اس کے تمام خطوط کتابی صورت میں شائع ہو گئے ہیں۔ وہ اپنے ایک خط میں اس بات پر زور دیتا ہے کہ افسانہ چھوٹی چیزوں کو زندہ بنا دینے کا دوسرا نام ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ افسانہ نگار دوسرے اوصاف کے علاوہ فن کے اسرار و رموز سے آگاہ ہو۔ چنانچہ وہ ایک افسانہ نگار کی کہانیوں پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتا ہے:

''تمہارے افسانوں مین وہ جامعیت نہیں ہے جو چھوٹی چیزوں کو زندہ بنا ڈالے۔

تمہارے افسانوں میں ہنر مندی بھی پائی جاتی ہے، ذہانت اور ادبی احساس بھی، لیکن
ان میں آرٹ بہت کم ہوتا ہے..... ایک پتھر سے چہرہ بنانے کے معنی یہ ہیں کہ اس
میں سے وہ تمام حصے کاٹ کر پھینک دیئے جائیں جو چہرہ نہیں ہیں۔"

چیخوف کے آخری جملے سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ افسانے کا فن سخت قسم کے فن کارانہ ردّ و انتخاب کا فن ہے اور افسانہ نگار کو اِدھر اُدھر بھاگنے کی قطعی اجازت نہیں دیتا۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ عظیم نقاد اور ناول نگار ناول کو نئی عظمت دینے پر آمادہ نظر نہیں آتے اور سرے سے اُسے آرٹ کی دنیا سے خارج کر دینے پر اصرار کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک نمایاں نام ایچ جی ویلز کا ہے۔ یوں تو اسے اس بات کا احساس ہے کہ آج کی الجھی ہوئی اور پیچیدہ زندگی کی تصویر کشی کسی ذریعہ سے ہو سکتی ہے تو وہ ذریعہ ناول کا ہے۔ لیکن ویلز کو تامّل ہے کہ ناول کو آرٹ کا نام دیا جائے۔ ٹھیک اسی طرح ورجینا وولف جیسی عظیم ناول نگار کو بھی ناول کو فن تسلیم کرنے میں عار ہے، وہ لکھتی ہے:

"......یوں تو ناول نے اپنے ارتقاء میں انسان کے ہزاروں معمولی احساسات جگائے
ہیں لیکن ایسے سلسلہ کو آرٹ سے وابستہ کرنا فعل عبث ہے.... آج کا کوئی نقاد یہ نہیں
کہہ سکتا کہ ناول فن کی ایک شاخ ہے اس لیے اس کا فنی جائزہ لینا چاہیے......"

ویلز یا ورجینا وولف کے خیالات پر تنقید کی جاسکتی ہے اور ان کی رائے سے اختلاف کی کافی گنجائش ہے، لیکن اتنی بات تو تسلیم کی جاسکتی ہے کہ وہ اصول اور ضابطے جو دوسرے فنونِ لطیفہ کا معیار و مقام متعیّن کرتے ہیں وہ ناول پر بہت کم منطبق ہوتے ہیں۔ اس کی حقیقی وجہ اس کی طوالت ہی ہے جو اسے جامع بنانے میں ہر قدم پر مخل ہوتی ہے جب کہ افسانے کی جامعیت اور اس کا اختصار فنی نوک پلک کی آراستگی کا کافی موقع فراہم کرتا ہے۔ جس کی بنیاد پر ایڈ گرالن پو افسانے کو ناول پر فوقیت دینے میں تذبذب محسوس نہیں کرتا۔ لہٰذا یہ امر محتاج ثبوت نہیں رہتا کہ افسانے کی فنی حیثیت ناول کے مقابلے میں کم تر نہیں ہے۔

افسانے کی فنی حیثیت کے بارے میں ایک غلط فہمی یہ بھی ہے کہ محض اس صنف کے بل بوتے پر بین الاقوامی مقبولیت اور شہرت کا حصول محال ہے۔ اس غلط فہمی سے یہ مفروضہ بھی جنم لیتا ہے کہ کسی فن کار کی عظمت کے تعیّن میں یہ عنصر بھی بہت اہم ہے کہ جس صنف سے وہ خود کو وابستہ کیے ہوئے ہے اس کی اپنی حیثیت کیا ہے یعنی غیر اہم صنف کا سہارا لینے والا فن کار عالمی شہرت کے حصول میں ناکام رہے گا لیکن ایسی مثالیں بھی ہمارے سامنے ہیں کہ غیر اہم صنفوں سے وابستگی کے باوجود کچھ ادباء و شعراء ساری دنیا میں مشہور ہو گئے ہیں اور ان کی حیثیت عالمی ادب میں محفوظ ہو گئی ہے۔ غزل کلیم الدین احمد کے قول کے مطابق ایک نیم وحشی صنف سخن ہے۔ لیکن غالبؔ کی شہرت کا تنہا راز اسی نیم وحشی صنف میں غیر معمولی اور انفرادی کارگزاریاں ہیں۔ فرانسیسی شعراء بودلیئر، ورلین، لافورگیو، کلوویل، پال ولیریؔ، ریں بو، رونسار یا جرمنی شعراء ہولدرلن، ارشفن جارج، رلکے یا اطالوی

شعراء لیوپارڈی، پسکوکی، کیاتا، کسمید و یا انگریزی شعراء ڈن، بلیک، یٹس یا فارسی شعراء حافظ، بیدل، رومی، عمر خیام وغیرہ نے کسی زمانے کی اس عظیم ترین صنف میں شاعری نہیں کی جسے ایپک کہتے ہیں۔ لیکن کیا آج کا نقاد ملٹن کو ملارمے پر صرف اس لیے فوقیت دینے پر آمادہ ہوسکتا ہے کہ ملارمے نے کوئی ایپک نہیں لکھی۔ دراصل کوئی مخصوص صنف کسی شاعر یا ادیب کو اہم یا غیر اہم نہیں بناتی بلکہ متعلقہ صنف میں اس کی اپنی کارگزاری اسے اہم یا غیر اہم بناتی ہے۔ لہٰذا بالفرض محال یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ افسانے کی صنف ناول کے مقابلے میں کم تر ہے تو بھی یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ صرف افسانے کے سہارے کسی افسانہ نگار کا عالمی ادب میں مقام حاصل کرنا محال ہے۔ ذیل کی چند مثالیں اس حقیقت کو مزید واضح کریں گی۔

چیخوف کی شہرت کا باعث اس کے افسانے بھی ہیں اور اس کے ڈرامے بھی۔ لیکن وہ ڈرامے کی طرف اس وقت راغب ہوا جب وہ بیشتر افسانے لکھ چکا تھا اور اس کی شہرت اور عظمت عالمی سطح پر محفوظ ہوگئی تھی۔ اس کے چھ ڈرامے، Uncle vanya, The seagull, The Cherry Orchard The Three Sisters اور Ivanov ڈرامے کی نئی جہتوں کی طرف اہم قدم ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ چیخوف ان ڈراموں کے بغیر بھی عالمی ادب میں اتنا ہی عظیم رہتا جتنا آج ہے۔ اس کی شہرت ۱۸۸۶ء تک مسلّم ہو چکی تھی، جب اس کے افسانوں کا مجموعہ "Particoled Stories" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ چیخوف نے ڈرامے اپنی زندگی کے آخری چند برسوں میں لکھے۔ ایک دوسرا روسی افسانہ نگار بونن محض اپنے افسانوں کی وجہ سے ہی زندہ ہے۔ میرے خیال میں تاثراتی، قنوطی اور گہری داخلیت کے انداز کے افسانے لکھنے والوں میں بونن کا مقام پہلی صف کے افسانہ نگاروں میں ہوگا۔ اس کے افسانے دی گرامر آف لو، دی جنٹل مین فروم سان فرانسسکو اور سن اسٹروک دنیا کے مشہور افسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ بونن نے کسی اور فن کا سہارا نہیں لیا لیکن آج وہ دنیا کا جانا پہچانا فن کار ہے۔ گورکی نے ڈرامے بھی لکھے اور ناول بھی۔ لیکن اس کی شہرت کی بنیاد اس کا افسانہ "Twenty Six Men and a Girl" ثابت ہوا۔ وہ چوروں، لٹیروں اور پس ماندہ افراد پر مسلسل افسانے لکھتا رہا۔ یہ افسانے ۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۰ کے درمیان شائع ہوئے اور اس کی دائمی شہرت کا باعث بنے۔ گورکی نے ناول اور ڈرامے بہت بعد میں لکھے۔ موپاساں کا قائل تو ہنری جیمز بھی تھا اور اس نے متعدد بار اس کا اظہار کیا ہے کہ موپاساں کے انداز کے افسانے لکھنا سخت فنی ریاض چاہتا ہے۔ موپاساں فلابیئر اور زولا کی صحبتوں کے بعد بھی بنیادی طور پر افسانہ نگار ہی رہا۔ اس کے چھ ناول، متعدد سفری خاکے اور دوسری نگارشات اس کے افسانوں کے منصب تک نہیں پہنچتیں اور ان کی حیثیت اس کے افسانوں کے مقابلے میں ضمنی ہے۔ ترگنیف کے افسانے ۱۸۴۷ء اور ۱۸۵۱ء کے درمیان شائع ہوئے۔ اس کے افسانوں کا مجموعہ ''اسپورٹس مین اسکیچز'' ۱۸۵۲ء میں چھپا اور اس کی شہرت کی سبیل بن گیا۔ اس سے پہلے اس نے شاعری بھی کی لیکن اسے بحیثیت شاعر کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ افسانہ نگاری کی حیثیت سے معروف ہوجانے کے بعد ترگنیف ناول نگاری کی طرف متوجہ ہوا۔ پشکن کی شاعرانہ عظمت سے کسی کو انکار نہیں ہو

سکتا لیکن اس کا افسانہ ''دی کیپٹن ڈاوٗٹر'' اس کی ادبی عظمت میں مزید اضافے کا سبب بنا۔ امریکی افسانہ نگار اوہنری (ولیم سڈنی پورٹر) کی ساری شہرت اس کے افسانوں کی مرہون منّت ہے۔ کیتھرین این پورٹر مسلسل افسانے لکھ رہی ہے اور جدید افسانہ نگاروں میں اس کا ایک خاص مقام ہے۔ کچھ سال پہلے اسے فورڈ فاؤنڈیشن انعام مل چکا ہے۔ نئے ذہن کے معماروں میں مارسل پروست کا نام فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ حقیقت ہے کہ تیرہ جلدوں پر مشتمل اس کا طویل ناول "In Search of Lost Times" اپنی تہہ داری کے باعث اس صدی کا عظیم شاہ کار ہے۔ لیکن خود پروست کو اپنے افسانے "Filial Sentiments of a Paradise" پر بڑا ناز تھا۔ ۱۳ صفحات کا یہ افسانہ پروست نیز نئے ذہن کو سمجھنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس افسانے کے آخری جملوں میں پروست کا ذہن و دماغ چھپا ہوا ہے:

''..... کیسی خوشی جیئے جانے کی کون سی وجہ، کیسی زندگی ایسی خود آگہی کا مقابلہ کر سکتی ہے؟ کون سچ ہے خود آگاہی یا زندگی کی خوشی؟ دونوں میں سچ کون ہے؟''

کیتھرائن مینسفلڈ نے ۳۵ برس کی مختصر عمر پائی لیکن ادبی لحاظ سے ہمیشہ زندہ ہے۔ اس کی عظمت اور شہرت کی وجہ صنف افسانہ ہی ہے کوئی دوسری صنف نہیں۔ اطالوی ادیب پیرانڈیلو نے افسانے بھی لکھے، ڈرامے اور ناول بھی، لیکن افسانوں اور ڈراموں کے مقابلے میں اس کے ناول کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ یہ درست ہے کہ اس کا فکری نظام اس کے ڈراموں ہی سے تشکیل پایا۔ لیکن ابتدا میں اس کی شہرت اس کے افسانوں ہی کے باعث ہوئی۔ کاموجب کافکا کے فکری محور کا جائزہ لیتا ہے تو اس کے ناول ''ٹرائل'' اور ''کسیل'' کے ساتھ ساتھ اس کے افسانے ''میٹا مورفوسس'' کو بھی اہمیت دیتا ہے۔ اردو کے کئی نئے افسانوں میں ''میٹا موفورسس'' کے اثرات نمایاں ہیں۔ رابرٹ ٹاب مین، میٹا مورفوسس کو ''بیسویں صدی کا عظیم تخیلی شاہکار'' کہتا ہے اور ٹرائل اور کسیل کو اس کے مقابلے میں کم تر سمجھتا ہے۔ جرمن ناول نگار اور افسانہ نگار ٹامس مان نے جرمنی تہذیب کے کھوکھلے پن کے اظہار کے لیے افسانے بھی لکھے اور ناول بھی۔ لیکن اس کی شہرت میں دونوں ہی صنفیں یکساں معاون ہوئی ہیں۔ کاموکے ناول ''دی پلیگ''، ''دی آوٹ سائڈر'' اور ''دی فال'' عظیم ادبی شاہکار ہیں۔ لیکن اس کا افسانوی مجموعہ ''اکسائل اینڈ دی کنگڈم'' کے چھ افسانے اپنی فنی عظمت کے باعث ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ فلپ تھوڈی نے اس کی وضاحت کی ہے کہ کس طرح اس کے افسانے اس کے ناول کے مقابلے میں ''دوسرے درجہ کی چیز نہیں ہیں''۔ جیمز جوائس کی عظمت "Dubliners" کے پندرہ افسانوں کے بغیر نامکمل ہوتی۔ ڈبلینرز کی اہمیت اسی سے واضح ہے کہ ازرا پاوٗنڈ نے اس پر ایک مستقل مضمون لکھا ہے۔ ایلیٹ نے پاوٗنڈ کے مضامین یکجا کر کے شائع کر دیے ہیں۔ اس مجموعۂ مضامین میں ڈبلینرز پر پاوٗنڈ کا وہ مضمون شریک ہے۔ اس کے علاوہ خود جیمز جوائس کی نظر میں اس کے افسانے انتہائی اہم تھے۔ کیا کوئی ایسی دھاندلی کر سکتا ہے کہ لارنس کے نظریہ کی تشکیل میں صرف اس کے ناولوں کو زیر بحث لائے اور اس کی انفرادیت کے حامل افسانوی مجموعہ "Prussian Officers" کو

نظرانداز کردے؟ اردو کے افسانہ نگار پریم چند، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور اجندر سنگھ بیدی کے افسانے اگر دنیا کی اہم زبانوں میں مسلسل ترجمہ ہوتے رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ انھیں عالمی ادب میں کوئی مقام حاصل نہ ہو۔ اسی طرح افسانے کی نئی تکنیک میں لکھنے والوں میں انتظار حسین، انور سجاد، سریندر پرکاش اور مین را کے افسانے دنیا کی عظیم زبانوں میں منتقل کیے جاتے رہیں تو عالمی سطح پر بھی یہ نام جانے پہچانے نظر آئیں۔ ممکن ہے میری اس رائے کو مبالغہ سمجھا جائے لیکن سنجیدگی سے عالمی ادب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں۔ کیتھرین این پورٹر اور غیاث احمد گدی کے افسانوں کی فنی جہتیں ایک سی ہیں۔ لیکن اردو افسانے کے ارتقائی جائزے میں بھی غیاث احمد گدی کو نظرانداز کرنے سے لوگ نہیں چوکتے جب کہ پورٹر کی بین الاقوامی حیثیت مسلم ہوچکی ہے۔

افسانے پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اس میں تجربے کی گنجائش بہت کم ہے۔ اس کو زمان و مکاں کے حدود میں بہر حال رہنا ہے اور اس کا بیانیہ انداز اتنا اٹل ہے کہ اس سے انحراف کی کوششیں بے معنی ہیں۔ ممکن ہے صرف اردو افسانوں کو پیش نظر رکھ کر یہ بات کہی گئی ہو لیکن یہ اعتراض بھی وزنی نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس صنف میں برابر تجربے ہورہے ہیں اور تکنیک کی نئی صورتیں سامنے آئی ہیں۔ تکنیک کے بہت سے نئے تجربے پڑھنے والوں کو اکثر ناگوار اس لیے ہیں کہ ہم رسمی اور روایتی افسانے پڑھنے کے عادی ہیں۔ پھر مغرب میں لکھے جانے والے نئے افسانوں سے بے خبر رہنے میں عافیت محسوس کرتے ہیں۔ اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ ابھی تک ہمیں Initiation (بدایتی) افسانوں سے واقفیت نہیں ہے۔ انتھراپولوجی کی یہ اصطلاح ایک خاص قسم کے نئے افسانے کی تخلیق کا باعث بنی ہے۔ کسی کم عمر کے ارتقائے شعور کے مرحلے میں کوئی واقعہ اتنا شدید ہوسکتا ہے کہ اس کے ردِعمل میں زندگی کا کوئی بالغ تصور اس کے سامنے آجائے اور اس کے مستقبل کی زندگی پر اس کا گہرا اثر قائم رہے۔ ہیمنگوے کا افسانہ ''دی کیلرس'' کیتھرائن مینسفلڈ کا ''دی گارڈن پارٹی'' فاکنر کا ''دی بیر'' بدایتی افسانے ہیں۔ اردو میں ایسے افسانوں کا کال ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانہ ''بھولا''، منٹو کے ''جی آیا صاحب'' اور کلام حیدری کے افسانے ''غلطی'' میں انی سیئشن کے کچھ عناصر ملتے ہیں لیکن افسانے کی اس نئی قماش کے بارے میں اردو فکشن کے نقاد بالکل خاموش ہیں۔ حالانکہ مغرب میں انی سیئشن افسانے قریب تیس برس پرانے ہوچکے ہیں۔ البتہ اردو کے نئے افسانے کی بحث میں ''شعور کی رَو'' پر اچھی خاصی روشنی ڈالی جاتی رہی ہے۔ لیکن مجھے شبہ ہے کہ اردو میں نصف درجن افسانے بھی شاید ہی اس تکنیک پر پورے اتریں گے۔ اس لیے کہ ہمارے افسانہ نگار زیادہ دیر تک صبر نہیں کرسکتے اور ذہن کی ترنگ پر روک لگا کر اچھی خاصی عبارت آرائی میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ''شب خوں'' مارچ ۱۹۷۱ء میں غیاث احمد گدی کا افسانہ ''نارمنی'' غالباً ''شعور کی رَو'' کی تکنیک میں لکھا گیا ہے لیکن غیاث زیادہ دیر تک خاموش نہ بیٹھ سکے اور جہاں تہاں ذہن کے بہاؤ پر روک لگانے میں منہمک ہوگئے۔ ہاں سریندر پرکاش کا افسانہ ''تلقارمس'' شعور کی رَو کی تکنیک پر ہر لحاظ سے پورا اترتا ہے۔ افسانہ نگار کو خواب میں کسی نے اسی نام سے پکارا تھا۔ یہ بیان Surrealism کی تحریک کی اسی بنیاد کی یاد دلاتا ہے کہ کس طرح آندرے

بریتون (Andre Breteon) کے ذہن مین یکا یک یہ جملہ عود کر آیا : "A man is cut in half by the window"، شعور کی رَو کے افسانے کوئی سرَ یلسٹ ہی لکھ سکتا ہے۔ اس لیے کہ سرریلزم کے منشور میں اس کی تعریف جس طرح کی گئی ہے "شعور کی رَو" پر منطبق ہوتی ہے :

> "A pure psychicautomatism, by which it is intended to express, verbally, in writing or by other means. The real process of thought. Thought's dictation in the absence of all control exercised by the reason and outside all aesthetic or moral pre-occupations."

اسی طرح علامتی افسانے کے بارے میں کچھ نئے افسانہ نگار سخت غلط فہمی کے شکار نظر آتے ہیں۔ ہمارے یہاں علامت کا مفہوم یہ مان لیا گیا ہے کہ کسی ایک چیز کے لیے کوئی دوسری چیز مخصوص کر لیں۔ مثال کے طور پر طوائف کی کہانی لکھنی ہو تو اس کے لیے سڑک کا لفظ منتخب کر لیں اور پھر جہاں جہاں طوائف لکھنا ہو وہاں وہاں سڑک لکھتے جائیں اور بس علامتی افسانہ تیار ہو گیا۔ حالانکہ علامت نگاری ایک طرح سے رومانی نظریہ کے تخلیقی تصور پر مبنی ہے جس میں فطرت اپنی تسلیم شدہ خدوخال، عادات واطوار میں نہیں دیکھی جاتی بلکہ تخیل کے آئینہ میں کچھ اور ہی شئے بن جاتی ہے، لہٰذا اردو کے بہت کم افسانے علامتی افسانے بن پاتے ہیں۔ چنانچہ یہ کہنا کہ افسانے میں تبدیلی کے امکانات کم ہیں، صحیح نہیں۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اردو افسانے ابھی تک اپنی قدیم ڈگر سے ہٹتے نظر نہیں آتے۔ یہی وجہ ہے کہ "A Portait in black and blood" جیسا نیا افسانہ ہمارے لیے ناقابلِ فہم بن جاتا ہے اور بڑی بے تکلفی سے اسے ناقابلِ اشاعت کہہ دیتے ہیں۔

افسانے میں تبدیلی کی اتنی ہی گنجائش ہے جو کسی دوسری اہم صنف میں ہوسکتی ہے، لیکن اس کے لیے شرط ہے کہ اس کے روایتی خدوخال کو اٹل نہ سمجھا جائے Sherwood Anderson نے تقریباً ساٹھ برس پہلے اپنے ایک مضمون "Form, not plot" میں اس کا اظہار کیا تھا کہ پو، موپاساں اور او ہنری نے افسانہ نگاروں کی ایک اچھی خاصی ذہین نسل کو ماجرا نگاری کا مصنوعی تصور دے کر زندگی سے دور کر دیا ہے۔ انڈرسن نے ایک اہم نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ ہماری بے تکلف روازانہ زندگی میں کوئی ہموار پلاٹ نہیں ہوتا "ایسے میں پلاٹ پر مبنی افسانے صرف مصنوعی ہو سکتے ہیں" انڈرسن کی رائے کو تسلیم کرنے کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ماجرا نگاری افسانے کے لیے ہمیشہ غیر ضروری رہی ہے، لیکن اتنی بات تو ماننی پڑے گی کہ پلاٹ کو جتنی خدمت انجام دینی تھی، دے چکا۔ حقیقت نگاری کے نئے تصور کا تقاضا ہے کہ اب اسے پلاٹ سے آزاد کیا جائے اور نئے رنگ وآہنگ سے ہم کنار کیا جائے۔ پلاٹ پر مبنی افسانے کا تصور سال خوردہ تصور ہے۔ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ اس سلسلہ میں Bonard Overstreet نے اپنے مضمون "Little story what now?" میں چند قابلِ غور نکتوں کی طرف اشارے کیے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

"..... ہماری حالیہ صدی کا ڈرامہ وہ ڈراما ہے جو ہمارے ذہنوں میں ہوتا رہتا ہے۔
خارجی عمل (چاہے وہ ہاتھ کی کوئی معمولی جنبش ہو یا ایک قوم کا دوسری قوم پر سفّا کانہ
حملہ) اسی حد تک اہم ہے کہ کہاں تک اس کا ردِّ عمل ہماری ذہنی اور جذباتی کیفیات پر
ہو رہا ہے....."

"...... اس صدی میں افسانے کا کیا ہوگا؟ اس کے مستقبل کے بارے میں یہ پیش گوئی
اتنی ہی مشکل ہے جتنی مشکل تمام اداروں کے مستقبل کے بارے میں اظہارِ خیال کرنا۔
لیکن اتنی بات تو کہی جاسکتی ہے کہ گزشتہ چند دہائیوں سے افسانہ انسانی ذہن کی گتھیوں
کو سمجھنے اور سمجھانے کا موثر ذریعہ ہے۔ ہمارے ذہن کے نہاں خانوں میں کیا کچھ ہو رہا
ہے اس کی عکاسی کا معیاری آلۂ کار افسانہ ہی ہے...."

ظاہر ہے کہ انڈرسن کی طرح اوور اسٹریٹ بھی سی امر پر زور دے رہا ہے کہ انسان کے نفسیاتی عوامل ایک سیدھی لکیر میں ترتیب نہیں دیئے جاسکتے اس لیے حقیقی افسانے Plotless ہی ہو سکتے ہیں۔ افسانے کے نقادوں میں آج اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ افسانے کے ڈھانچے میں جو تبدیلی آئی ہے وہ فنی اعتبار سے اس کی عظمت بڑھانے میں معاون ہے۔ مغرب میں افسانے بہ قول اوور اسٹریٹ Poison-plot سے نجات پا چکے ہیں اور اپنی سال خوردہ مصنوعی آرائش وزیبائش کو ترک کر کے انتہائی فطری بن گئے ہیں۔ ایسے افسانے جن میں پلاٹ سازی کی جھلک ہے بھی تو وہ رسمی اور روایتی نہیں ہے بلکہ ذہنی عوامل کی عکاسی ہے۔ چنانچہ ڈی ایچ لارنس کے افسانے "Two blue birds" سیر دیاں کے "The Darling young man on the flying trapeze" فلپیز اوکونز کے "A good man is hard to find" ٹرومین کپوٹ کے "A tree of height" اور کیتھرائن این پورٹر کے "The theft" کو ایک ساتھ پڑھیے تو ان کے متنوع مزاج کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ایسے میں نیاز فتح پوری، پریم چند، ممتاز مفتی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اختر اورینوی، محمد حسن، عصمت چغتائی، شکیلہ اختر، سہیل عظیم آبادی، قرۃ العین حیدر، غیاث احمد گدی، رام لعل اور کلام حیدری کے افسانے اپنے اپنے عہد کے نمایاں فرق کے باوجود پلاٹ سازی کی حد تک روایتی ہی نظر آئیں گے۔ افسانے کے فارم کے بارے میں ان کا تصوّر بہت حد تک جامد ہی رہا ہے یہاں اس امر پر اصرار کیا جا سکتا ہے کہ نیاز فتح پوری کے مقابلے میں پریم چند کے افسانے نئے ہیں (اور ایک الگ اسکول ہی کے ہیں) اسی طرح پریم چند، اعظم کریوی، سدرشن یا سہیل عظیم آبادی کے مقابلے میں ممتاز مفتی کے اور ممتاز مفتی یا محمد حسن کے مقابلے میں منٹو یا انتظار حسین کے۔ مجھے ان باتوں سے انکار نہیں ہے لیکن ان افسانہ نگاروں میں بنیادی فرق موضوعات کا فرق ہے۔ مختلف موضوعات کی بنا پر فارم کی تھوڑی سی لچک کو ہیئتی تبدیلی نہیں کہتے۔ غالباً اردو افسانے کے روایتی سفر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بعض حضرات اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ افسانے میں تبدیلی ممکن نہیں ہے لیکن اردو کے افسانے کی

ایسی رفتار اس صنف کی کمزوری ثابت نہیں کرتی بلکہ اس کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ افسانے کے اجزائے ترکیبی کے سلسلے میں ہمارا موقف ناگوار حد تک روایتی رہا ہے۔ ویسے یہ صنف کتنی لچک دار ہے۔ اس کا اندازہ ایڈگر ایلن پو اور ولیم بروز کے افسانوں کی ہیئت کے تقابلی جائزے سے لگایا جاسکتا ہے۔ اردو افسانہ نگاروں کی نئی پود نے شاید اس کا اندازہ لگالیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انور سجاد، مین را اور سریندر پرکاش اردو افسانے کا مزاج بدلنے پر کمربستہ نظر آتے ہیں۔ لہٰذا افسانہ کوئی جامد صنف نہیں بلکہ انتہائی لچک دار تغیر پسند صنف ہے۔

صنف افسانہ کو دوسرے نثری اصناف کے مقابلے میں ایک امتیاز یہ بھی حاصل ہے کہ یہ شاعری سے بہت قریب ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے شعر کی بحث میں جدلیاتی الفاظ کے استعمال نیز ابہام اور اجمال کے اوصاف کو ناگزیر بتایا ہے۔ ہربرٹ ریڈ بھی قریب قریب ان ہی امور پر زور دیتا ہے۔ اب اگر نئے افسانوں کے مزاج پر غور کیجیے تو ایسا محسوس ہوگا کہ یہ خصوصیتیں ان میں موجود ہیں۔ چنانچہ یہ واضح ہوتا ہے کہ افسانہ شاعری سے بہت قریب ہے یا ہوسکتا ہے اس سلسلے میں Brickell کا مضمون "What Happend to the short stories" قابلِ مطالعہ ہے۔ بریکل نے نئے افسانے کی زبان کی بحث میں اس کی شاعرانہ خوبیوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ صرف افسانہ ہی نثر کی وہ صنف ہے جو شاعری کے مقابلے میں پیش کی جاسکتی ہے۔ ایڈگر ایلن پو کے عہد سے لے کر آج تک کسی نہ کسی طرح افسانے کی صنفی حیثیت کے اظہار میں شاعری سے اس کی قربت ثابت کی جاتی رہی ہے اور چونکہ فنونِ لطیفہ میں شاعری کی اہمیت ایک مسلمہ حقیقت ہے اس لیے افسانہ کی اہمیت کو ''ماڈست آرٹ'' کہہ کر ٹالا نہیں جاسکتا۔ عالمی شہرت کے حامل نئے افسانوں کو الگ بھی کردیجیے تو اردو کے کچھ نئے افسانے مثلاً ماچس (مین را) برف پر ایک مکالمہ (سریندر پرکاش)، بخی (کلام حیدری)، ساتویں کہانی (احمد ہمیش)، تج دوتج دو (غیاث احمد گدی)، ربط کا انعقاد (جوگندر پال)، کابوس (اکرام باگ)، غم زدوں کی برات (احمد یوسف)، کٹھ پتلیاں (شفیع جاوید)، نئی سڑک (ظفر اوگانوی)، آدمی (الیاس احمد گدی)، دستک (تسکین انصاری)، ایک آنکھ کا آدمی (محسن شمسی)، سباسہ ڈائل اور سیاہ ہاتھ (اختر یوسف)، سانپوں کی پٹاری (اقبال متین) وغیرہ اپنی شعریت کی وجہ سے بھی ''ماڈسٹ آرٹ'' کی صف میں نہیں رکھے جاسکتے۔

لہٰذا افسانے کی صنفی عظمت سے انکار ممکن نہیں۔ اس صنف نے انسان کے خارجی و داخلی احوال کی عکاسی میں اہم خدمات انجام دی ہیں اور اس کے بدلتے ہوئے تیور سے اندازہ ہوتا ہے کہ مستقبل میں نجی و ذاتی کوائف کے اظہار کا موثر ادبی ذریعہ یہی صنف ثابت ہوگی۔

کیفی اعظمی کی شعری جمالیات

● ابوذر ہاشمی

کیفی اعظمی کی شناخت ایک ترقی پسند شاعر کے طور پر کی جاتی رہی ہے۔ دانشوروں نے ان کے یہاں رومان کی کارفرمائی بھی دیکھی ہے۔ ایسے شاعروں کے یہاں، جن کی کاوشیں کم وبیش نصف صدی کے عرصے پر محیط ہوں، متوازی بلکہ متضاد پہلوؤں کا در آنا کوئی حیرت کی بات بھی نہیں۔ بلکہ تنوع اور تضاد کبھی کبھی بڑائی اور عظمت کے اظہار کی سبیل بھی بن جایا کرتا ہے۔ اس لئے شاعری میں متضاد خیالات یا رجحانات کا شمار عیب کے طور پر نہیں کیا جانا چاہئے۔ لیکن ہر بڑے شاعر کا ایک فکری اور حسی سرچشمہ ضرور ہوا کرتا ہے اور وہی سرچشمہ اس کی شعری جمالیات کا رخ متعین کرتا ہے۔ اس شاعر کی جمالیات کی صحیح تفہیم کے لئے اس کے سرچشمے تک پہنچنا ضروری ہے۔ کیفی کی رومان پسندی اور ترقی پسندی یا انقلابی آواز کو پرکھنے کے لئے بھی ضروری ہے کہ اس سرچشمے پر ایک نظر ڈال لی جائے جس نے ان کی جمالیات کو مہمیز لگایا۔

کسی قلم کار کے ذہن وفکر کی تشکیل میں مقامی، قومی اور بین الاقوامی سطح کے اثرات ہو سکتے ہیں۔ کیفی کی ذہنی اور فکری تشکیل میں بھی مقامی ماحول اور قومی و بین الاقوامی حالات اثر پذیر ہوئے ہوں گے۔ کیفی نے ۱۹۱۸ء میں ایک ایسے جاگیردارانہ ماحول میں آنکھیں کھولیں جہاں طبقاتی کشمکش کو دیکھنے، برتنے اور پرکھنے کا موقع تو تھا ہی، ساتھ ہی شعر وادب کی ایک سازگار فضا بھی تھی۔ انہیں زبان وادب کا شعور آنکھیں کھولتے ہی ورثے میں ملا۔ پورا گھر شعر وشاعری کی فضا میں ڈوبا ہوا تھا۔ والد شاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے، ان کے تمام بھائی بھی شاعر تھے۔ کیفی نے بھی بچپن میں ہی فطری طور پر شاعری شروع کر دی تھی۔ قومی سطح پر یہ دور متضاد کیفیات کا حامل تھا۔ اردو شاعری میں اصلاحی تحریکیں چل پڑی تھیں۔ غزل کی اصلاح کی کوششیں جاری تھیں۔ شاعری کی اصلاح کی کوششوں نے ایک تحریک کی صورت تو اختیار کر لی تھی، لیکن اس کے باوجود عشق وعاشقی کے دیوانے شاعروں کی

بھی دھوم مچی تھی۔ اسی ماحول میں اقبال کی شاعری نے بھی لوگوں کو اپنے حلقے میں لے لیا تھا۔ گیا دورِ سرمایہ داری گیا' تماشہ دکھا کر مداری گیا' یا سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ 'کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو' کی آواز بھی دلوں میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کر رہی تھی۔

بین الاقوامی سطح پر دیکھئے تو روس کے انقلاب نے سارے عالم کو متاثر کیا تھا۔ کیفی کی تو پیدائش ہی انقلاب روس کے بعد ہوئی۔ ایسے میں ترقی پسند نظریے میں ہر دردمند دل کو انسانی ابتلا اور طبقاتی تقسیم کا علاج نظر آیا۔ یہ معاملات اور نظریات ایسے نہ تھے جو حساس دل پر کاری ضرب نہ لگاتے۔ ان حالات نے کیفی کو بھی متاثر کیا۔ ان کی شاعری میں بھی وہ خصوصیتیں در آئیں جو رومانی شاعری یا ترقی پسند نظریات کی پیروی میں ہو سکتے تھے۔ تاہم ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ موضوعات اور مسائل کیفی کی شاعری کے لئے مخصوص ہیں یا یہ ان کی شاعری کا نشانِ امتیاز ہیں۔ دیگر شعرا بھی اشتراکی نظریات کے اسیر ہوئے ان کے یہاں بھی رومان اور حقیقت کا امتزاج ملتا ہے۔ بلکہ فیض کی شاعری میں رومان اور انقلاب کے حسنِ امتزاج نے ایک ایسا خوبصورت روپ دھار لیا کہ اشتراکی شاعروں میں انہیں فوقیت حاصل ہوگئی۔ اس لئے شاعری میں اشتراکی فکر یا انسانی دکھ درد کے احساس کا بیان یا رومان کی وادی میں گاہے گاہے سیر کے عمل کو کیفی کی شعری جمالیات کی اساس قرار نہیں دیا جانا چاہئے۔

کیفی کی اصل شناخت تک پہنچنے کے لئے قومی اور بین الاقوامی نظریات اور حالات نیز خارجی عوامل کے تجزیے کے ساتھ ساتھ ان کے داخلی محرکات کو سمجھنے کی بھی ضرورت ہے۔ عرض ہوا کہ ان کے پورے خاندان میں شعروادب کا ماحول تھا۔ لیکن اس سے بھی اہم نکتہ یہ ہے کہ کیفی بھی نہ صرف انیسیوں میں شامل تھے بلکہ خود میر بھی تھے۔۔ یعنی میر سید طاہر حسین رضوی۔۔ کیفی کے کسب شعور کے زمانے میں میرو مرزا کے موازنے کا زبردست رجحان رہا ہے۔ کیفی بھی اس عمل میں شریک رہے ہیں۔ بلکہ میر انیس کے دیوانوں میں رہے ہیں۔ انیس و دبیر کے مرثیے مجلسوں میں بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جاتے تھے۔ ممکن نہ تھا کہ ان مجلسوں میں شریک ہونے والا کوئی حساس انسان اثر قبول نہ کرے۔ کیفی نے بھی اس کا زبردست اثر قبول کیا۔ ایسا اثر کہ ان کی پوری شاعری میں اس کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ کیفی خود بھی انیس کے مرثیوں کے اچھے حافظ تھے۔ دبیر پر انیس کو ترجیح دیتے تھے۔ شبلی کے موازنہ انیس دبیر کے متعلق کیفی نے ایک جگہ لکھا ہے:

> ''اردو تنقید نے ایک مدت تک مرثیے کو قابلِ اعتنا سمجھا' نہ اردو شاعری میں اس کے مقام کا تعین کیا۔ ہمارے تذکرے جو غزل کو اردو شاعری کا کل سرمایہ سمجھتے اور پرکھتے رہے۔ انہوں نے پہلی مرتبہ مرثیے کی طرف اس وقت توجہ کی جب شبلی نے موازنہ لکھا۔ موازنے نے صرف انیس کو ہی نہیں مرثیے کو بھی اردو شاعری میں بلند درجہ دیا۔''

انیس کا مقام اردو شاعری میں یقیناً بلند ہے اور مرثیے کے مقام کے متعلق بھی ہمیں کچھ نہیں کہنا۔ مگر اتنا کہ مرثیے کی صنف سے غیر معمولی رغبت کی بنا پر کیفی کے یہاں فصاحت اور بلاغت کا شعور ابتدا سے ہی جاگ اٹھا

تھا۔ انہوں نے موازنے کے حوالے سے انیس کو بلند درجے پر فائز کیا تو فطری اور غیر شعوری طور پر فصاحت کو اپنی شاعری کا ہنر بنایا۔ یہی فصاحت ان کی شاعری کا امتیازی وصف ہے۔ کیفی کی شعری جمالیات میں مواد اور موضوعات کی بجائے اسلوب اور طرزِ اظہار کی خاص اہمیت ہے۔ اگرچہ کسی شاعر کی بنیادی شناخت میں ہیئت یا طرزِ اظہار ہی سب کچھ نہیں۔ مواد اور موضوعات کی اہمیت بھی اپنی جگہ ہے۔ بلکہ شاعر کی اصل شناخت تو ہیئت اور مواد کے سلیقہ مند گھال میل سے وجود پذیر ہوا کرتی ہے۔ کیفی کی اصل شناخت بھی اسی سلیقۂ اظہار کی رہین ہے۔ کیفی کو یہ سلیقۂ اظہار مرثیے' بلکہ بطور خاص انیس کے مرثیوں' سے ملا ہے' اسلوب کی سطح پر بھی اور مواد کی سطح پر بھی۔ بلکہ ہمیں یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ کیفی کے یہاں مرثیے خوانی کی مجلسوں نے اشتراکیت کے نظریے کی پذیرائی کے لئے بھی راہ ہموار کی۔ مرثیہ کی صنف تو بنیادی طور پر ظلم کے خلاف ایک احتجاج ہے۔ سانحۂ کربلا ملوکیت کے خلاف اعلانِ جنگ ہی تو ہے۔ کیفی نے بھی غیر شعوری طور پر ملوکیت کے ہتھکنڈوں کے آگے سینہ سپر ہونا مرثیے سے ہی سیکھا ہے۔ اشتراکیت کے نظریے اور روس کے انقلاب نے ملوکیت کی بدلی ہوئی اصطلاح سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان کشاکش کو تیز کر دیا۔ کیفی مرثیے کے وسیلے سے غیر شعوری طور پر بچپن سے ظالم و مظلوم کی دلدوز داستان سے اثر قبول کر رہے تھے۔ انقلابِ روس نے انہیں مظلوم کی لڑائی میں شعوری اور فکری سطح پر شریک کر لیا۔

اشتراکیت کے نظریے سے کیفی کی وابستگی میں مرثیے کے کردار کی اہمیت مسلم ہے۔ کیفی کی شعری جمالیات کی شناخت انیس کی سلاست اور فصاحت سے اثر پذیری میں پوشیدہ ہے۔ کیفی نے غیر شعوری طور پر انیس سے گہرا اثر قبول کیا۔ انیس کا تخیل اگر موجِ آب پر ماہی کو کباب کر سکتا ہے' تو کیفی کا تخیل بھی ہوا کے جھونکوں میں برف بچھا سکتا ہے' مارے ٹھنڈ کے کھڑکیوں کو 'بِچّھو' بنا سکتا ہے۔ کہتے ہیں:

جھونکے ہوا کے برف بچھاتے تھے راہ میں
جلوے سما رہے تھے سمٹ کر نگاہ میں
دھوکے سے چھو گئیں جو کبھی سرد انگلیاں
بِچّھو سا ڈنک مارنے لگتی تھیں کھڑکیاں

نظم 'ماہتاب' سے ماخوذ درج ذیل اشعار بھی ملاحظہ کریں اور دیکھیں کہ کیفی کے یہاں انیس کی وراثت کس طرح منتقل ہوئی ہے۔ یہاں ضرورت اس بات کی تھی کہ انیس کے کچھ بند بھی نقل کئے جاتے اور تقابل کیا جاتا۔ طوالت کے خوف نے صرف کیفی کے چند اشعار پیش کرنے پر مجبور رکھا ہے:

بے نور ہو کے ڈوبنے والا تھا ماہتاب
کہرے میں کھپ گئی تھی ستاروں کی آب و تاب
قبضے سے تیرگی کے سحر چھوٹنے کو تھی

مشرق کے حاشیے میں کرن پھوٹنے کو تھی
کہرے میں تھا ڈھکے ہوئے باغوں کا یہ سماں
جس طرح زیرِ آب جھلکتی ہوں بستیاں
بھیگی ہوئی زمیں تھی نمی سی فضا میں تھی
اک کشتِ برف تھی کہ معلق ہوا میں تھی

تیرگی کے قبضے سے سحر کے چھوٹنے' بستیوں کے زیرِ آب جھلکنے اور کشتِ برف کے ہوا میں معلق ہونے میں استعارے کی نادرہ کاری اور سلاستِ بیان' اک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے پر قادر ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔ جی چاہتا ہے کہ کیفی کے یہاں انیسؔ کے زورِ بیان اور فصاحت کی کارفرمائی کے لئے چند رومانی نظموں سے مثالیں پیش کی جائیں۔ لیکن پھر وہی طوالت کا خوف مانع ہے۔ تاہم اتنا اشارہ ضروری ہے کہ بانسری کا لہرہ' برسات کی رات دوشیزہ مالن' نیز ان کی دیگر ابتدائی بلکہ بعد کی رومانی نظموں میں بھی زورِ بیان' خطابت 'اور سادگی کی کیفیت مرثیے سے ان کے گہری وابستگی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ خلیل الرحمن اعظمی نے بھی کیفی اعظمی کی مرثیوں سے اس وابستگی کو محسوس کیا تھا۔ وہ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک میں اس طرف ہلکا سا اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''کیفی کے اسلوبِ بیان میں انیسؔ کے مرثیوں کی روایات کے بہت سے عناصر جذب ہو گئے ہیں''۔ لیکن اس حقیقت کے خلاف ایک نکتہ یہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ اگر کیفی مرثیے یا انیسؔ سے اتنے ہی متاثر ہیں تو ان کے شعری مجموعوں میں مرثیے کیوں نہیں ملتے' یا یہ کہ انہوں نے مرثیے کیوں نہیں لکھے۔ کیفی اعظمی کو قریب سے جاننے والوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے ابتدائی دور میں مرثیے بھی لکھے تھے' لیکن وہ مرثیے مجموعے میں شامل نہیں کیے گئے۔ شاید ایسا بھی ہے کہ کیفی نے انیسؔ کے کمال یا پانچویں پشت تک شبیر کی مداحی کے بعد ظالم و مظلوم یا سرمایہ دار اور مزدور کے معرکہ کرب و بلا میں عملی اور فکری طور پر شریک ہونا ضروری جانا۔ انیس کا یہ شعر بھی پیشِ نظر رہا ہوگا

بزم کا رنگ جدا' رزم کا میداں ہے جدا
یہ چمن اور ہے' زخموں کا گلستاں ہے جدا

زخموں کا گلستاں تو صرف مرثیوں کے حوالے سے نہیں بلکہ عملی زندگی میں قدم قدم پر کیفی کے سامنے تھا۔ ہر دردمند شخص انسانیت کے جسم پر ظلم کے زخموں کو محسوس کر سکتا تھا۔ روس کے کامیاب انقلاب نے ان زخموں کے اندمال کی ایک صورت سامنے لائی تھی۔ اس انقلاب نے بزم (مجلس) کی بجائے رزم کی اہمیت کو اجاگر کر دیا تھا۔ شبیر کی مداحی اور مرثیہ خوانی نے کیفی میں یہ جذبہ بھی پیدا کیا کہ دورِ حاضر کے میدانِ کرب و بلا میں شبیر کے مداحوں کا ساتھ دیں اور یزید کے پیروؤں سے فکری اور عملی سطح پر جنگ کریں۔ بین کرتے ہوئے صدیاں گزر یں تھیں۔ اب واقعی شمشیر بکف اور شعلہ نگاہ ہونے کی ضرورت تھی۔ کیفی خود کہتے ہیں:

اسلاف نے اڑائے تھے جو رزم گاہ میں
ہم نے اٹھالئے ہیں وہ شعلے نگاہ میں

انیس کی شاعری سے ہی کیفی نے رزم کے شعلے پائے۔ انہوں نے ظالم اور استبدادی قوتوں کے خلاف اس شعلے یا جوہر سے اپنی شاعری کو آب دیا۔ کیفی کا شعری جمال صرف بزم میں سانحۂ کربلا کے نوحہ کو پیش نہیں کرتا۔ ان کے یہاں زندگی کرب و بلا کی رزم گاہ ہے۔ اس لئے رزمیہ عناصر رومان و انقلاب کے اظہار میں در آتے ہیں۔ چند مثالیں دیکھئے کہ انقلاب اور رومان کا شاعر کس طرح رزم کے شعلوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ظلم کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ مختلف نظموں سے درج ذیل بند کے تیور دیکھیں اور ان میں مرثیے کے مزاج کو محسوس کریں:

شمشیر بکف، جنگ کے میداں کی طرف دوڑ
آندھی کی طرح آگ کے طوفاں کی طرف دوڑ
ہاں لٹتی ہوئی عظمتِ انساں کی طرف دوڑ

ہاں مٹتا ہوا حضرتِ آدم کا نشاں دیکھ
بھارت کے جواں اے مرے بھارت کے جواں دیکھ

نظم ''نوجوان'' کا یہ بند بھی دیکھئے:

زندگی ہم سے سدا شعلہ بیانی مانگے
علم و حکمت کا خزانہ ہمہ دانی مانگے
ایسی رفتار کہ دریا بھی روانی مانگے

جوش سینوں میں بھڑکتا ہے جوالہ جیسے
اتحاد اتنا منظم ہے ہمالہ جیسے

کیفی اعظمی کی شاعری سے ماخوذ یہ مثالیں ان کی شاعری پر مرثیے کے اثرات کی بین دلیل ہیں۔ ان میں وہی روانی، برجستگی، زورِ بیان اور رزمیہ کیفیت ہے جو مرثیے کا اساسی وصف ہے۔ لیکن کیفی کی شاعری اور مرثیے میں یہ فرق ہے کہ کیفی نے نوحہ اور بین کرنے کی بجائے آج کی زندگی کی رزم گاہ میں اپنی شاعری کو شمشیر کے طور پر استعمال کیا۔ ہمارے معاشرے نے انسانوں کو امیر و غریب، منعم و مزدور یا زمیندار اور کسان میں نہ صرف بانٹ رکھا، بلکہ ایسے نظام کو قائم رکھنے کے لئے ظلم و جور کے حربوں کا استعمال کرتا رہا ہے۔ معاشرے نے مذہب کو عملی سطح پر برتنے کی بجائے اسے صلوٰۃ و تسبیحات میں محدود کر رکھا تھا (بلکہ کر رکھا ہے)۔ ایسے ماحول میں حساس ذہن باغی ہو گیا اور شعر و ادب میں اس بغاوت کا کھل کر اظہار ہوا۔ کیفی نے بھی معاشی زبوں حالی اور تفریق کے خلاف آواز بلند کی۔ بلکہ ایک وقت ایسا آیا کہ وہ اسی کے اسیر ہو گئے۔

کیفی عقلی سطح پر اشتراکیت کے کچھ زیادہ اسیر اس لئے ہوئے کہ اشتراکیت کا نظریہ عملی زندگی میں زر

گری کے خلاف ایک بہتر نظام کا تصور لے کر سامنے آیا تھا۔ اشتراکیت عملی طور پر ایک ایسا تصور سامنے لے کر آئی تھی جس میں معاشی نابرابری کے خلاف آواز نعرۂ جرس لگ رہی تھی۔ کیفی کی آنکھوں نے بھی مختلف سطحوں پر انسانی زندگی کو عملاً معرکۂ کرب وبلا میں شامل پایا۔ معاشی نابرابری کا معاملہ تو ظاہر کی آنکھوں سے بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ پھر اس کے خلاف تحریکیں بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ ترقی پسند تحریک نے زندگی کے اس معرکے میں معاشی برابری کو نجات کی کنجی جانا تھا۔ کیفی کے شعور نے بھی اشتراکیت کو نجات کا واحد راستہ جانا اور وہ اس کے اسیر ہو گئے۔ چنانچہ ایک ایسا شاعر جسے ظالم ومظلوم بلکہ ظلمت وروشنی کے وسیع تر معرکۂ کرب وبلا میں روشنی کا وکیل اور نقیب بننا تھا وہ محض اس کی ایک کرن اور ایک پہلو یعنی معاشی جبر واستحصال کے خلاف آواز بلند کرنے والا شاعر بن کر رہ گیا۔ اس طرح ترقی پسند کازیا مزدوروں کی حمایت میں لکھی جانے والی نظموں میں جب کبھی وہ نعرے بازی پر اتر آئے' ان کی شاعری تخلیقی جہت سے عاری ہو گئی۔ نظم تلنگانہ کا ایک بند دیکھیں جو تخیل سے عاری ہے' اس لئے حقیقت کا ایک بے رس بیان ہو کر رہ گئی ہے:

چمک رہے ہیں گٹھیلے شانوں پہ پھاوڑے' بیلچے کدالیں
اڑا رہی ہیں ہوا میں چنگاریاں تفنگوں کی گرم نالیں
وہ گولیاں بے جھجک لہو میں جو بادشاہوں کے بھی نہالیں
وہ گونجیں تاج جو گرا لیں
یہ جست روس کے میدان نے سکھائی ہے
یہ فوج چین سے ہوتی دکھن میں آئی ہے

اس طرح کے مصرعے اس لئے شاعری میں شمار ہوں گے کہ وزن میں ہیں' انقلاب کا نعرہ ہیں' مگر بے رس۔ لیکن انقلابی شاعری میں جب تخیل کا عمل بھی داخل ہو جاتا ہے تو کیفی کی شاعری کا رنگ کس طرح نکھر جاتا ہے' نظم 'پہرہ' کے اس بند میں دیکھئے:

ہم وہ راہی ہیں جو منزل کی خبر رکھتے ہیں
پاؤں کانٹوں پہ' شگوفوں پہ نظر رکھتے ہیں
کتنی راتوں سے نچوڑا ہے اجالا ہم نے
رات کی قبر پہ بنیادِ سحر رکھتے ہیں
او اندھیرے کے خدا شمع بجھانے والے

دیکھئے کہ اندھیرے کے خدا سے مخاطبت میں راہی کا تخیل کانٹوں پہ پاؤں رکھنے کے ساتھ ساتھ شگوفوں پر نظر بھی رکھتا ہے۔ جب راتوں سے اجالا نچوڑ کر بنیادِ سحر رکھتا ہے' تو تخیل کا عمل جاگتا ہے اور شاعری شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن جب انقلابی یا اشتراکی شاعری تخیل یا یوں کہئے کہ رومان کی آمیزش سے عاری ہو جاتی ہے تو کھوکھلا نعرہ

بن جاتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ مزدور کے پسینے یا پھاوڑا' بیلچے اور کدال کا استعمال کر لیا تو شاعر مزدوروں کا وکیل اور نقیب بن گیا۔ نہ ہی یہ ہے کہ ان الفاظ کا استعمال کر لینا شاعری میں جرم ٹھہرا۔ الفاظ تو خیال کے اظہار کا سہارا ہوتے ہیں۔ الفاظ اگر تخیل کو تحریک دینے کا وسیلہ بن جائیں تو شاعری یا ادب پیدا ہوتا ہے ورنہ صحافت' خطابت یا شعر وادب کے علاوہ کچھ بھی بن کر رہ جاتا ہے۔ تخیل کی کارفرمائی کے وسیلے سے الفاظ معنی کی توسیع کے عمل سے گزرتے ہیں۔ دراصل تخیل رومان کا ہی ایک پہلو ہے اور رومان کے بغیر شاعری ممکن نہیں۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ اشیا کی حقیقت تک رسائی بھی تخیل کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی لئے کیفی کی وہ نظمیں جو اشتراکی نظریے کا خالی خولی پرچار ہیں دل کو چھو کر نہیں گزرتیں۔

لیکن اس کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ اشتراکیت سے فکری اور عملی وابستگی نے کیفی کو ایک معمول کے طور پر وہی کچھ کہنے پر مجبور رکھا جو تحریک یا اس کے منشور کا تقاضا تھا۔ مگر ان کے لاشعور میں مرثیے کی وساطت سے ایک بڑی شاعری اور انسانی زندگی کے اجالے کے نقوش ثبت تھے۔ ان کے یہاں انسان دوستی ہی بنیادی اہمیت کے لائق تھی۔ مرثیے نے بھی یہی کچھ ان کو دیا تھا۔ لیکن اشتراکیت نے اس انسان دوستی کے صرف ایک پہلو پر زور دیا۔ اس لئے وہ ان کے شعری وجدان میں پوری طرح جذب نہ ہو سکا اور ان کی ایسی شاعری اکہری معنویت کی شاعری ہو کر رہ گئی۔ تاہم جب کبھی ان کی انقلابی شاعری میں رومان بھی شامل ہو گیا تو اس شاعری میں بھی کشش پیدا ہو گئی دیکھئے کہ نظم عورت میں وہ رومان وانقلاب کے حسین سنگم سے اپنی آواز کو کس طرح انقلابی بناتے ہیں:

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبضِ ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں
اڑنے کھلنے میں ہے نکہت' خمِ گیسو میں نہیں
جنت اک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں

عورت کو نبضِ ہستی محسوس کرانے اور آنسو کی بجائے جہد کا درس دینے میں تخیل کی کارفرمائی شامل ہو گئی۔ کیفی کی شاعری میں اکثر ایسے علامت واستعارے سے پرہیز ملتا ہے جو تصوراتی اور ماورائی ہوں۔ اس کے باوجود ان کے یہاں محاکات آفرینی' پیکر تراشی' کا عمل بدرجۂ اتم ملتا ہے۔ یہ پیکر تراشی اور محاکات آفرینی بھی مرثیے کا ہی اثر ہیں۔ یہ بند تو ملاحظہ کیجئے:

پھولی شفق فضا میں حنا تلملا گئی
اک موجِ رنگ کانپ کے عالم پہ چھا گئی
کل چاندنی سمٹ کے گلوں میں سما گئی
ذرے بنے نجوم زمیں جگمگا گئی
چھوڑا سحر نے تیرگیِ شب کو کاٹ کے

اڑنے لگی ہوا میں کرن اوس چاٹ کے
مچلی جبینِ شرق پہ اس طرح موجِ نور
لہرا کے تیرنے لگے عالم میں برقِ طور
اڑنے لگی شمیم ، چھلکنے لگا سرور
کھلنے لگے شگوفے چہکنے لگے طیور

موجِ رنگ کے کانپنے اور عالم پہ چھانے' چاندنی کے گلوں میں سمانے' ذرّوں کے نجوم بننے' شب کی تیرگی کو کاٹنے، کرن کے اوس چاٹنے ،شمیم کے اڑنے ،سرور کے چھلکنے اور طیور کے چہکنے میں محاکات کا عمل تو ہے ہی 'ساتھ ہی بصری' لمسی اور حرکی پیکر بھی اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ اس کی دل کشی وارفتگی میں ڈھل گئی ہے۔ ایسی نظموں کے استثنا کے ساتھ جو انہوں نے وقتی ضرورتوں کے تحت لکھیں۔ کیفی کی اکثر شاعری میں محاکات اور پیکر تراشی کا عمل ملتا ہے۔ بلکہ ترقی پسند مسلک کے اظہار اور پرچار کے لئے لکھی جانے والی بعض نظموں میں بھی کہیں کہیں جزوی طور پر یہ شعری محاسن ان کے یہاں بول اٹھتے ہیں۔ یہ محاسن انیسؔ کی ہی عطا ہیں۔

البتہ جب کبھی وہ ہنگامی نوعیت کی شاعری کرتے ہیں تو ان اوصاف سے عاری ہو جاتے ہیں۔ہاں یہ ضرور ہے کہ کیفی کی شاعری ماضی کی کہانی کم کم سناتی ہے۔کیفی چونکہ حال کے مغنّی تھے اس لئے ان کے یہاں ماضی پرستی کا عمل نہیں۔ مرثیے کا فن اگرچہ ماضی کی یاد دلاتا ہے۔لیکن کیفی ماضی کی کس مپرسی کی بجائے حال کے انسانوں کا رزم نامہ پیش کرتے ہیں۔ان کی نگاہ ماضی میں دور تک نہیں جاتی۔وہ صرف حال کے ابتلا کو پیش کرتے ہیں۔ان کی ساری تگ و تاز اسے سنوارنے میں صرف ہوتی ہے۔ان کی رومانویت سے قطعِ نظر کر لیا جائے تو معاشرتی زندگی کا صرف ایک پہلو ان کے یہاں مدھم ٹھہرتا ہے۔انیسؔ سے لے کر اقبال تک اردو کے چار بڑے شاعروں پر ایک نظر ڈالنے پر اندازہ ہوگا کہ بڑائی کبھی اکہرے پن میں نہیں سمٹ پائی۔اقبالؔ نے اشتراکی نظام کی وکالت بھی کی۔لیکن اسی کے ہو کر نہیں رہ گئے۔دہقاں کو جس کھیت سے روٹی میسر نہ آئے اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلانے کا حکم تو انہوں نے لگایا۔لیکن مُزارع کے حقوق کی وکالت کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی سمجھا کہ دنیا مزرعۂ آخرت ہے۔مُزارع کے حقوق اور مزرعۂ آخرت کا تصور سماجی اور معاشی انصاف اور اعتدال کی بنیاد پر ہی تو قائم ہے۔غور کیجئے تو یہ نکتہ بھی سامنے آجاتا ہے کہ دنیا کے مزرعۂ آخرت ہونے کے نظریے میں مادی اشیأ سے اندیکھی روح یا طبیعات سے مابعد الطبیعات تک رسائی حاصل کرنے کا شعور بھی شامل ہے۔ادب بھی تو ہمیں مادّی اشیأ (یا حال) سے روح تک یا یوں کہئے کہ طبیعات سے مابعد الطبیعات تک لے جاتا ہے۔اقبال کے شعری سفر میں مادّے کا انکار تو نہیں ہوا' لیکن روحانی یا مابعد الطبیعاتی عوامل بھی شامل ہو گئے۔یعنی مزارع کے حق کی وکالت بھی ہوئی اور مزرعۂ آخرت کی حقیقت تک رسائی بھی۔کیفی نے مزدور اور مزارع کے درد کو تو محسوس کیا' لیکن ایک وسیع تر نظامِ عدل کے کمال اور جذبات و احساسات کی ارفع اور اندیکھی

دنیا کے جمال کو صرف ان لمحوں میں محسوس کیا جب وہ رومانی ہو گئے۔ اشتراکی نظریے کے زیر اثر وہ کاندھے پہ رکھ کے سرخ علم آن بان سے" کا نعرۂ انقلاب گنگنانے لگے۔ اس طرح انہوں نے جب جمہور کی ضرورت کے صرف ایک پہلو پر زور صرف کیا تو خود اپنی مضطرب روح کا اظہار پورے طور پر نہ کر سکے۔

دراصل معاملہ کچھ یوں بھی ہے کہ فلسفیانہ اندازِ نظر مرثیے کے مزاج کے بھی منافی تھا اور کیفی کی شاعری بھی کسی فلسفے کا بیان نہیں۔ مرثیہ کی صنف ملوکیت کے شب و ستم اور اس کے مظاہر اور دیگر متعلقات کو پیش کرتی ہوئی شبیر (یا حق پرستوں) کے عالمِ تنہائی تک جاتی ہے' لیکن ملوکیت اور خلافت کے فلسفیانہ مباحث پیش نہیں کرتی۔ کیفی کے یہاں بھی ترقی پسندی یا اشتراکیت کا کوئی فلسفیانہ بیان نہیں ملتا۔ اس لئے ان کی خالص ترقی پسند شاعری بھی نعرۂ انقلاب بن جاتی ہے۔ کیفی روح کے نغمہ گر تھے۔ لیکن ہدایات نے انہیں محدود رہنے پر مجبور رکھا۔ فیض نے شاعری کے گلوں میں ایک نیا رنگ بھرا تو اشتراکی نظریے کے پرچارک سے الگ بھی ان کی ایک شناخت بن گئی۔ مجروح نے بھی اپنی ایک الگ اہمیت بنائی بلکہ جذبی نے بھی۔ لیکن کیفی کی شاعری رومانی اندازِ نظر رکھنے کے باوجود اکثر اشتراکیت کے حصار میں مقید ہو گئی' اس لئے ان کے شعری جمالیات کی اصل شناخت بھی بھول بھلیاں میں کھو گئی اور وہ ایک ترقی پسند شاعر کے طور پر جانے گئے۔ ترقی پسند تحریک زوال پذیر ہوئی تو کیفی اعظمی کی اہمیت بھی کچھ کم سی ہو گئی۔ اس لیے ان کے اصل شعری وژن پر ایک دھندسی چھا گئی۔ ان کا وژن یا شعور مرثیے کی فضا میں پروان چڑھا تھا۔ اس لیے ان کی ترقی پسند اور ہنگامی شاعری بھی اس وقت کیفیت کی حامل ہو جاتی ہے جب اس میں محاکات' پیکر تراشی اور رزمیہ انداز در آتا ہے۔ اس لئے ہمیں اصرار ہے کہ کیفی کی شعری جمالیات کی اصل شناخت ترقی پسند تحریک کی وکالت میں پوشیدہ نہیں۔ انہیں ایک ترقی پسند شاعر کے طور پر دیکھنے کی بجائے ان کے طرزِ بیان کے پس منظر کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ان کی اصل شناخت موضوعات کی بجائے طرزِ اظہار میں پوشیدہ ہے اور یہ طرزِ اظہار مرثیے کی مجالس کا پروردہ ہے۔

........☆........

عصمت کے نسوانی کردار

(تانیثیت کے تناظر میں)

● ساجد ذکی فہمی

اردو کی افسانوی دنیا میں عصمت چغتائی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ جہاں زندگی کی بے رحم حقیقتوں کو واضح کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا وہیں حقوقِ نسواں کی حصولیابی کے لیے بھی جدوجہد کی۔ ماتحت طبقوں کو سماج میں ہر اعتبار سے خواہ ان کا تعلق تعلیم سے ہو، سماجی مساوات سے ہو یا معاشی و اقتصادی حقائق سے، نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ لہٰذا ان طبقوں کے ساتھ روا رکھے گئے سلوک کو ہندوستانی تاریخ کا بدنما داغ یا سیاہ باب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

اردو ادب میں تانیثیت (Feminism) کسی ادبی تحریک کی شکل میں نمودار نہیں ہوئی۔ جس کی وجہ سے نہ ہی اس کے اصول و ضوابط بنائے گئے اور نہ ہی اس پر باقاعدگی کے ساتھ لکھنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ یہ ضرور ہوا کہ اس ادب سے متعلق بعض مصنفین کی تحریریں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں۔ جن میں ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری اور پریم چند نے عورتوں کے اصلاحی پہلو پر زور دیا تو منٹو نے عورتوں کے جنسی مسائل کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ قرۃ العین حیدر نے اپنی تحریروں کے ذریعہ خواتین کی فکری اور نفسیاتی کیفیات کے ساتھ انھیں ایک احتجاجی شکل میں پیش کرنے کی سعی کی۔ لیکن عصمت چغتائی نے گھر کی چہار دیواری اور پردے میں رہنے والی خواتین کے مسائل کے ساتھ انسانی رشتوں کے نام پر مردوں کے ذریعہ کیے جانے والے مظالم کی بھرپور عکاسی کی۔ یہی نہیں بلکہ عملی طور پر انھوں نے اس کارزار میں حصہ بھی لیا۔

بعض حضرات شاید اب تک اس تذبذب میں پڑے ہیں کہ جو تخلیقات خواتین کے ذریعے پیش کی جاتی ہیں وہی تانیثیت ہے۔ حالانکہ اس طرح کے فرسودہ خیالات تانیثیت سے اپنی لاعلمی کا اظہار ہے۔ تانیثیت کو بطور تحریک مغربی ادب نے سب سے پہلے قبول کیا اور مارکسی کلچر کو بنیاد بنا کر ادب اور سماج میں اس کے مقام کو

متعین کرنے کی کوشش کی۔ لہٰذا اس کے مفہوم اور مقاصد کو سمجھنے کے لیے ہمیں مغربی ادب سے استفادہ کرنا ہوگا۔

مختصر طور پر تانیثیت کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے کہ "وہ ادب جس میں عورتوں کی فلاح و بہبود کی باتیں کی جائیں، سماج میں ان کی اہمیت کسی اعتبار سے کم تر نہ گردانی جائے، سماجی، معاشی، اقتصادی، ذہنی، جنسی غرض کہ ہر اعتبار سے انھیں مکمل آزادی دی جائے۔" چونکہ سماج میں رائج کردہ تمام اصول وضوابط مردوں کی ذہنی افتاد کا نتیجہ ہیں جس میں عورتوں کی ضروریات یا ان کے مسائل کو اپنی خواہش کے مطابق شامل کرنے کا جذبہ کارفرما ہے اس لیے ضروری ہے کہ عورتوں سے متعلق اصول وضوابط عورتوں کے ذریعہ انجام دیے جائیں۔ کیونکہ ایک عورت ذہنی، جذباتی، فکری یا جنسی اعتبار سے جس طرح کے مسائل سے دوچار ہوتی ہیں اس کا اندازہ کرنا مرد ادیبوں کے لیے ممکن نہیں۔

عصمت ایک ایسی افسانہ نگار ہے جس کے افسانوں نے گھروں کی چہار دیواری میں مقید عورتوں کو اپنے حقوق کی خاطر لڑنے پر آمادہ کیا، عصمت ایک ایسی ناول نگار ہے جس کی ناول نگاری نے سماج میں کھینچی گئی 'ٹیڑھی لکیر' کو متوازی شکل عطا کرنے کی حتی الوسع کوشش کی، عصمت ایک ایسی بے رحم حقیقت نگار ہے جن کی حقیقت نگاری نے انھیں گھر کی دہلیز سے عدالت کے کٹہرے تک پہنچا دیا۔ اس طرح نہ جانے کتنے بت عصمت نے مسمار کیے جو ترقی اور حقوق نسواں کی حصولیابی کی راہ میں مانع تھے۔

عصمت نے بچپن میں ہی عورتوں کو درپیش مسائل کے تعلق سے اتنے تجربے حاصل کر لیے تھے جس کا زبانی یا عملی طور پر اظہار کرنا ان کے لیے ناگزیر ہو گیا تھا۔ ان کے یہ تجربات، ان کی تخلیقات مثلاً چوتھی کا جوڑا، لحاف، ننھی کی نانی، بیکار، ضدی، معصومہ، ٹیڑھی لکیر وغیرہ میں اپنے عروج پر نظر آتے ہیں۔

عصمت نے جس طبقے کے لیے صدائے حق بلند کیا وہ آج سے نہیں صدیوں سے حق تلفی کے شکار تھے۔ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک یا یوں کہیے کہ پیدائش سے لے کر موت تک ان کے ساتھ سوتیلوں جیسا سلوک کیا جاتا رہا ہے۔ لڑکیوں کی پیدائش پر خاندان میں خوشی کا وہ ماحول میسر نہیں آتا جو لڑکوں کی پیدائش کے وقت دیکھا جاسکتا ہے۔ لڑکے بھی لڑکیوں کو اپنے سے کمتر سمجھتے رہے ہیں۔ غریبی تو ایسے ہی دنیا کی نظر میں ایک لعنت ہے اس پر مستزاد یہ کہ کسی غریب کے گھر لڑکی پیدا ہو۔ کیونکہ اس کے فوراً بعد اس کی شادی اور جہیز کا مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ مناسب رشتے کی تلاش میں وقت گذرتا جاتا ہے۔ ماں باپ تھک کر اللہ بھروسے بیٹھ جاتے ہیں۔ لڑکی جس کی زندگی میں جوانی کب رینگ کر گذر گئی، احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ طبقۂ نسواں سے متعلق ان تمام نکات پر عصمت کی گہری نگاہ تھی جس کی بھرپور عکاسی انھوں نے "چوتھی کا جوڑا" میں کی ہے۔ ایک جگہ کبریٰ کی ماں اپنے شوہر جو دمہ کے مریض تھے، کی پریشانی کو دیکھ کر کہتی ہے:

"کچھ دوا دارو کیوں نہیں کرتے۔ کتنی بار تم سے کہا ہے؟"

"بڑے شفا خانے کا ڈاکٹر کہتا ہے سوئیاں لگواؤ۔ روز تین پاؤ

دودھ اور آدھی چھٹانک مکھن کھاؤ۔''

''اے خاک پڑے ان ڈاکٹروں کی صورت پر۔ بھلا ایک تو
کھانسی اوپر سے چکنائی بلغم نہ پیدا کر دے گی۔''

''حکیم کو دکھاؤ کسی۔''

''دکھاؤں گا۔''

''ابا حقہ گڑگڑاتے اور اچّھو لگتا۔''

''آگ لگے اس موئے حقے کو۔ اسی نے تو یہ کھانسی لگائی ہے
۔ جوان بیٹی کی طرف دیکھتے ہو آنکھ اٹھا کر۔۔۔'' [۱]

کبریٰ کی ماں ایک وفادار اور جاں نثار بیوی کی طرح پہلے اپنے شوہر کو علاج کا مشورہ دیتی ہے لیکن خرچ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے فوراً توجہ کبریٰ کی شادی کی طرف موڑ دیتی ہے۔ جو جوانی کے حصار سے قدم آگے بڑھاتے ہوئے بڑھاپے کی دہلیز تک پہنچ چکی تھی۔ اس سفر کو عصمت نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''نہ جانے کیسی جوانی آئی تھی کہ نہ تو اس کی آنکھوں میں پریاں ناچیں، نہ اس کے رخساروں پر زلفیں پریشان ہوئیں۔ نہ اس کے سینے میں طوفان اٹھے۔ نہ کبھی اس نے ساون بھادوں کی گھٹاؤں سے مچل کر پریتم یا ساجن مانگے۔ وہ جھکی جھکی، سہمی سہمی جوانی جو نہ جانے کب دبے پاؤں اس پر رینگ آئی۔ ویسے ہی چپ چاپ نہ جانے کدھر چل دی۔ میٹھا برس نمکین ہوا اور پھر کڑوا ہو گیا۔'' [۲]

یہاں عصمت نے صرف کبریٰ ہی کی نہیں بلکہ متوسط طبقوں کے گھرانے میں پرورش پانے والی ہر اس لڑکی کی عکاسی کی ہے جو اپنی بے بسی، لاچاری، کمزوری اور شرم و حیا وغیرہ سے مجبور ہو کر اپنی خواہشات کو اپنے سینے میں ہی دفن کر دیتی ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ کبریٰ نے جوانی میں خواب نہیں دیکھے ہوں گے یا اس کے دل میں کبھی یہ خیال نہ گذرا ہوگا کہ کوئی اس کو بڑھ کر اپنے سینے سے لگا لے، لیکن وہ نسوانی شرم و حیا کی وجہ سے زبان کھولنے سے قاصر تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب راحت کے آنے کی خبر ملی تو بے انتہا خوش ہونے کے باوجود زبان سے اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی نہیں کر پائی اور نہ ہی راحت کے چلے جانے کے بعد اپنے غم کو غلط کرنے کی ہمت جٹا پائی۔ نتیجہ، موت نے اسے اپنے آغوش میں لے لیا۔ غور سے دیکھا جائے تو 'موت' کبریٰ کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی کیونکہ اس کی زندگی ایک مرگِ مسلسل سے کم نہ تھی۔ شادمانیاں، آسائشیں، راحتیں اور مسرتیں وغیرہ اس کی زندگی میں عنقا تھیں۔ غربت کی چکی میں پستے پستے، ازدواجی زندگی کے خواب بنتے بنتے وہ اس دنیا سے چلی گئی۔

''چوتھی کا جوڑا'' میں عصمت نے لڑکیوں کی شادی اور اس کے جہیز سے متعلق درپیش مسائل کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ لیکن انھیں اس بات کا بھی بخوبی علم تھا کہ شادی کے بعد شوہر کی بے التفاتی یا ہم جنسیت پرستی بیوی

کے لیے، جو اپنی ہر چیز قربان کر کے اس کی پناہ میں آتی ہے کسی ناسور سے کم نہیں۔ وہاں مناسب رشتہ نہ ملنے کی وجہ سے کبریٰ کی زندگی بے کیف تھی، یہاں (یعنی لحاف میں) شادی ہونے کے بعد بھی بیگم جان کی زندگی اس تحفے سے زیادہ نہ تھی جسے گھر کی زینت بڑھانے کے لیے طاق نسیاں کیا جاتا ہے۔

عصمت نے ''لحاف'' کے ذریعہ نسوانی ہم جنس پرستی (Lesbianism) سے اردو کو اس وقت روشناس کرایا جب ہندوستان میں چند مخصوص لوگوں یا طبقوں کو چھوڑ کر عوام میں اس فعل کا تصور ناپید تھا۔ لحاف کے ذریعہ عصمت نے ایک طرف مردوں کی اجارہ داری تو دوسری طرف عورتوں کی مجبوری، محرومی اور مظلومی کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستانی سماج میں عورتیں، شوہروں کو خوش کرنے کے لیے ہر ممکن کام کرتی ہیں یہی وجہ تھی کہ بیگم جان نے بھی نواب صاحب کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے چلّے کاٹے، منتیں کیں، مرادیں مانگیں، وظیفے پڑھے مگر نواب صاحب نوجوان گورے گورے پتلی کمر والے لڑکوں کے پیچھے دیوانے تھے۔ بالآخر بیگم جان نے بھی وہی راہ اختیار کی جس پر نواب صاحب گامزن تھے۔

ادب سے تعلق رکھنے والا تقریباً ہر شخص اس بات سے واقف ہے کہ ''لحاف'' پر اس کی فحاشی کی وجہ سے مقدمے چلے۔ لیکن پورے افسانے کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی آپ کسی ایک لفظ پر انگلی رکھ کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ فحش ہے۔ مثال کے طور پر ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''بیگم جان کا لحاف اندھیرے میں پھر ہاتھی کی طرح جھوم رہا تھا۔ اللہ آں میں نے مری ہوئی آواز نکالی لحاف میں ہاتھی چھلکا اور بیٹھ گیا۔ میں بھی چپ ہوگئی۔ ہاتھی نے پھر لوٹ مچائی۔ میرا روؤاں روؤاں کانپا۔ آج میں نے دل میں ٹھان لیا کہ ضرور ہمت کر کے سرہانے کا لگا ہوا بلب جلادوں۔ ہاتھی پھڑ پھڑا رہا تھا اور جیسے اکڑوں بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چپڑ چپڑ کچھ کھانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ جیسے کوئی مزیدار چٹنی چکھ رہا ہو۔'' ۳

اس اقتباس میں عصمت نے لحاف کا ہاتھی کی شکل میں ابھرنا، اکڑوں بیٹھنے کی کوشش کرنا، آواز دینے پر بیٹھ جانا، چپڑ چپڑ چٹنی چاٹنے کی آوازیں آنا۔ ان مبہم اشاروں کے ذریعہ اُس عمل سے روشناس کرایا ہے جو لحاف کے اندر انجام پاتے ہیں۔ اب ہر شخص اپنے فکر و بساط کے اعتبار سے اس کے نتائج برآمد کر سکتا ہے۔

اس افسانے میں جو بات قابلِ غور ہے وہ یہ کہ بیگم جان ابتدا میں اس فعل سے بالکل نابلد تھیں۔ لیکن شوہر کی بے التفاتی اور حرکات وسکنات کو دیکھ کر اپنی نوکرانی ربّو کے ساتھ ہم جنس پرستی میں اس قدر منہمک ہوجاتی ہیں کہ ربّو کا کھجانا ان کی ضروریاتِ زندگی میں داخل ہوجاتا ہے۔ بیگم جان کا کردار یہاں تانیثی تحریک کے بالکل عین موافق نظر آتا ہے۔ کیونکہ بیگم جان اپنے حقوق سے محروم ہونے کی وجہ سے اپنی آزادی، جو ہر انسان کا پیدائشی حق ہے، کو بروئے کار لاتی ہوئی وہ کام کر گذرتی ہیں جس کی وجہ سے انھیں جسمانی، ذہنی اور جنسی آسودگی حاصل

ہوتی ہے۔ یہاں ہمیں بیگم جان کے کردار میں سماج سے بغاوت کا عنصر بھی نظر آتا ہے۔ لوگوں کے درمیان چہ می گوئیاں ہونے کے باوجود بو کے ساتھ وہ اپنے رشتے کو من وعن برقرار رکھتی ہیں۔

عورتوں کے ساتھ ایک المیہ یہ رہا ہے کہ انھیں گھریلو کام کاج کے علاوہ دوسرے کاموں کے لیے نامناسب خیال کیا جاتا رہا ہے۔ اگر ضرورت پڑنے پر وہ کبھی باہر کے کام کی طرف قدم بڑھاتی ہیں تو اس پر اتنے اعتراضات یا الزامات تراشے جاتے ہیں کہ آج نہیں تو کل وہ تھک کر بیٹھ جاتی ہیں۔ بعض مرد بھی عورتوں کی کمائی کھانے پر ذلت محسوس کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہاجرہ بی نے جب اپنے شوہر سے نوکری کی بات کی تو انھوں نے کڑک کر جواب دیا:

''وہ کوئی اور الو کے پٹھے ہوں گے جو بیوی کی کمائی کھاتے ہوں گے۔'' ۴

پھر آگے چل کر تحریر کرتے ہیں:

''دیکھو جی اگر یہ آوارگی کرنا ہے تو طلاق لے لو اور مزے کرو میں دنیا کی لعنتیں نہیں سنوں گا۔'' ۵

غریب متوسط طبقے ابتدا سے ہی ایسے کشمکش میں گرفتار رہے ہیں کہ نہ تو ان کو اس کی ہمت کہ نچلی ذات والوں کی طرح ہر چھوٹا کام کر گذریں اور نہ ہی اتنی صلاحیت کے اپنے برابر والوں کے ساتھ قدم ملا کر چل سکیں۔ اپنی عزت بچانے کے لیے انھیں بھوکا مرنا گوارا ہے لیکن غیروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا یا گھر کی عورتوں کا باہر کام کرنا کسی صورت میں منظور نہیں۔ ان ہی وجوہات کے پیشِ نظر باقر میاں نے کہا تھا ''میں دنیا کی لعنتیں نہیں سنوں گا۔'' جہاں عورتوں کا گھر سے باہر نکلنا ہی معیوب سمجھا جاتا ہو وہاں اسکول میں ہاجرہ کی نوکری کیوں کر برداشت کی جاتی۔ چنانچہ لوگوں کا اشاروں کنایوں میں باقر میاں پر پھبتیاں کسنا جاری رہا۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''یار یہ ہمارے محلّے میں ایک سالی استانی ہے پیٹ بھر کے بدصورت، بکری کی سی کالی کالی ٹانگیں برقعے میں سے نکلی ہوئی جب میرے گھر کے سامنے سے گذرتی ہے میں لونڈوں سے کہتا ہوں لٹا دو سالی پہ کتا، یار بڑا مزہ آتا ہے۔ لنگڑے کوے کی طرح پھدکتی بھاگتی تھی۔ بڑی پارسا بنتی تھی، سالی کو پیٹ رہ گیا۔ نکالی گئی محلّے سے جوتا مار کے۔'' ۶

اس اقتباس میں جو بات غور طلب ہے وہ یہ کہ عورت کا پارسا بننا اور پیٹ سے ہونا۔ پارسا بننے کی بات صرف عورتوں کے ساتھ مخصوص کرنا درست نہیں کیونکہ مرد بھی اس ڈھونگ میں اسی طرح ملوث ہیں جس طرح عورتیں۔ اور جہاں تک پیٹ سے ہونے کا تعلق ہے تو اس فعل میں دونوں کی شرکت ناگزیر ہے۔ مرد کا اس سے فرار ممکن نہیں۔ لیکن آج تک الزام عورتوں کے سر رہا۔ مرد ہمیشہ اس سے بری الذمہ رہے۔ سماج میں رائج اس دو غلے رواج کے خلاف عصمت نے اپنی آواز بلند کی۔ اس ضمن میں ایک جگہ رقم طراز ہیں:

"ماں کی ممتا کا ساری دنیا ڈھول پیٹتی ہے۔ باپ کی باپتا کا
رونا کوئی نہیں روتا۔ عورت کی عزت لٹ سکتی ہے، مرد کی نہیں
لٹتی۔ شاید مرد کی عزت ہی نہیں ہوتی جو لوٹی کھسوٹی جا سکے۔
عورت کے حرامی بچہ پیدا ہوتا ہے مرد کے کچھ نہیں ہوتا۔" ۷

مختصر یہ کہ عصمت نے سماج میں رائج کردہ ان اصولوں پر طنز کرتے ہوئے عورتوں کو اس کی ترغیب دی کہ وہ اپنی شناخت، حقوق اور آزادی کے لیے بلند بانگ لگائیں اور عملی طور پر اس میں حصہ لیں۔

بالا سطور میں اس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے کہ ہندوستانی سماج میں عورتوں کو ہمیشہ کمتر گردانہ گیا، انھیں گھر کی چہار دیواری میں رہنے کی تلقین کی گئی ہے، ضروریات زندگی کی خاطر باہر نکلنا یا مردوں کے کاموں میں ہاتھ بٹانا ان کے لیے ممنوع قرار دیا گیا۔ نظریاتی، تعلیمی، فکری غرض کہ ہر اعتبار سے عورتوں کو مردوں سے مختلف تعلیم دی جاتی رہی ہے۔ حاشئے میں پڑے اس طبقے کے حقوق کی حصولیابی کے لیے عصمت نے قلم کا سہارا لیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عورتوں کا مرتبہ مردوں کے مقابلے کسی اعتبار سے کم نہیں۔ بلکہ یہ تفوقانہ خیال برسوں کی غلط تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے۔ ایک جگہ بیان کرتی ہیں کہ:

"لوگ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ عورتوں میں ممتا زیادہ ہوتی ہے۔ میں کہتی ہوں یہ
بات انہیں سکھائی جاتی ہے۔ میں جانتی ہوں کتنے مرد باپ ہیں وہ عورتوں سے کہیں
زیادہ اپنے بچوں کو پیار کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں لفظ ممتا تو موجود ہے مگر باپتا نام
کا کوئی لفظ نہیں۔" ۸

جانثار اختر کے انتقال کے وقت ایک عورت کی طرف سے "بیوہ کی چوڑیاں توڑ دو" کی آواز آئی تو عصمت نے اس کی مذمت کرتے ہوئے کہا:

"عورت ہی کو کیوں کہا جاتا ہے کہ فلاں بیوہ ہے۔ مرد کے لیے کیوں نہیں کہتے فلاں
رنڈوا ہے۔ اور فوراً جب وہ رنڈوا ہو تو کھینچ کر اس کی عینک اور گھڑی توڑ ڈالو۔" ۹

غرض کہ عصمت نے عورتوں کو سماجی، معاشی، سیاسی، اقتصادی، تعلیمی، جنسی اور فکری ہر اعتبار سے اپنے حقوق کی خاطر قدم بڑھانے کی تلقین کی۔ عصمت جبلی طور پر باغی واقع ہوئی تھیں۔ ان کی سرشت میں باغیانہ انداز روز اول ہی سے موجود تھا اور آخری سانس تک وہ اس پر کار بند رہیں۔ ان کی تحریروں سے متاثر ہو کر کئی خواتین تنقید نگاروں نے اپنی تنقیدوں میں تانیثیت کی طرف پیش رفت کی۔ ان میں ممتاز شیریں (معیار)، کشور ناہید (کچھ مضامین)، ساجدہ زیدی (تلاش بصیرت)، زاہدہ زیدی (رموز فکر و فن)، اور سیدہ جعفر (تنقید اور انداز نظر) وغیرہ اہم ہیں۔ ان لوگوں کے کارنامے دیکھ کر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ نئی نسل سنجیدگی کے ساتھ تحریری اور عملی دونوں صورتوں میں اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرے گی۔

حواشی:

۱۔ عصمت کے سو افسانے۔ جلد دوم۔ چوتھی کا جوڑا، کتابی دنیا، دہلی، ص۔309-308، سنہ۔ 2006

۲۔ عصمت چغتائی کے سوافسانے۔ جلد دوم۔ ص۔ ۳۰۹

۳۔ عصمت چغتائی کے سوافسانے۔ جلد چہارم۔ ص۔ ۸۴

۴۔ عصمت کے شاہکار افسانے۔ بیکار۔ ص۔ ۱۵۹

۵۔ ایضاً۔ ص۔ ۱۶۰

۶۔ ایضاً۔ ص۔ ۱۶۴

۷۔ آدھی عورت آدھا خواب۔ عصمت چغتائی۔ بیسویں صدی پبلی کیشنز (پرائیوٹ) لمیٹیڈ، نئی دہلی۔ ص۔ ۲۸

۸۔ عصمت کے شاہکار افسانے۔ اردو افسانوی ادب کی باغی خاتون عصمت چغتائی سے ملاقات۔ ص۔ ۲،۳

بک کارنر۔ ۱۹۸۹

۹۔ ماہنامہ۔ ''آجکل''، نئی دہلی۔ مضمون، لیڈی چنگیز خاں۔ قرۃ العین حیدر۔ ص۔ ۴،۵۔ جنوری ۱۹۹۲

........۞☆۞........

کراچی میں پُرانی کتابوں کا اتوار بازار

گوتم بدھ کی سرزمینِ معرفت [گیا] سے شائع ہوئی ایک کتاب

● راشد اشرف [پاکستان]

نوٹ : راشد اشرف صاحب کی یہ تحریر خصوصاً اہلِ بہار وعظیم آباد نیز تمام محبانِ اردو پر کسی ادبی احسان سے ذرا کم نہیں کہ اس کا ایک ایک لفظ ہماری متاعِ گم گشتہ کی بازیافت کے احساس سے لبریز ہے۔ اس کے لیے ان کا جتنا شکریہ ادا کیا جائے کم ہے! [ر۔ خ۔ ا]

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مظفر گیلانی، آئی۔اے۔ایس (انڈین سول سروس) گوتم بدھ کی جائے پیدائش 'گیا' [؟ نہیں، سرزمینِ معرفت] میں بیٹھ کر دسمبر ۱۹۸۸ میں ایک مختصر سی کتاب میں اپنی یادوں کو خاکہ نگاری کے ذریعے سمیٹیں، کتاب کا نام "ان سے ملیے" تجویز ہو، قیمت اس کی دس روپے مقرر کی جائے، مصنف اسے اپنے بڑے ماموں کے نام کریں، جنھوں نے مصنف کو ان کے والد کے انتقال کے بعد یتیمی کا احساس نہ ہونے دیا تھا، سید عبدالاحد گیاوی اس کی کتابت کریں، سبزی باغ، پٹنہ نمبر چار کے پاٹلی پترا لیتھو پریس سے کتاب کی طباعت کی جائے، گیا (بہار) کے مکتبہ غوثیہ والے اسے نیو کریم گنج سے شائع کریں اور ۲۲ برس بعد کتاب ہمیں کراچی کے فٹ پاتھ سے عمدہ حالت میں مل جائے۔

لیکن صاحب! پرانی کتابوں کے اتوار بازار میں سب کچھ ممکن ہے۔

مظفر گیلانی کس طرف سے آئے تھے، کدھر چلے، اور کیا ہوئے، خدا جانے۔ کوشش تو بہت کی کہ ان کا کوئی سراغ مل سکے لیکن نہ معلوم کیوں انٹرنیٹ پر پٹنہ کی ادبی شخصیات کی تفصیلات مرتب کرنے والوں نے بھی انھیں درخورِ اعتنا نہ جانا۔ حالانکہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، وائس چانسلر جیسے بڑے عہدوں پر تعینات رہنے والے مظفر گیلانی کی تصنیف "مضامین مولانا گیلانی" بہار اردو اکیڈمی سے شائع بھی ہوئی تھی۔ کتاب کے مطالعے سے یہ

ضرور معلوم ہوا کہ مظفر صاحب ۱۹۱۸ میں پیدا ہوئے تھے۔ پٹنہ میں مقیم ایک کرم فرما کو پیغام بھی بھیجا کہ ذرا کھوجیے تو گیلانی صاحب کو۔ لیکن صاحبو! بہار کے گیلانی صاحب ہوں یا پاکستان کے 'گیلانی صاحب'، دونوں اب ڈھونڈے سے نہیں ملتے!

۱۹۳۴ میں گیلانی صاحب پٹنہ مسلم کالج کے ہاسٹل میں بحیثیت طالب علم رہا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ڈرتے ڈرتے افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی ان کے دوست تھے اور ان کی لکھی بے ربط تحریروں کی نوک پلک سنوار دیا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ گزرا تو سہیل عظیم آبادی غم روزگار کا شکار ہوئے اور کبھی چھوٹا ناگپور کے جنگلوں میں کام کرتے رہے تو کبھی دلی تو کبھی کشمیر میں قسمت آزمائی کو جاتے رہے۔ ان کے اور مظفر گیلانی کے راستے جدا ہوئے۔ ۱۹۶۴ میں سہیل عظیم آبادی دتی میں نمودار ہوئے، اس مرتبہ ان کے قدم جم چکے تھے۔ انھوں نے آل انڈیا ریڈیو کے شعبۂ اردو کے سربراہ کی حیثیت سے اپنے دوست مظفر گیلانی کو طلب کیا اور حکم دیا کہ ریڈیو پر مولانا مناظر احسن گیلانی پر گفتگو کریں۔ ''ان سے ملیے'' ایسی ہی یادوں کا مرقع ہے۔ لیکن ٹھہریے! مرقع تو خاصا بھاری بھرکم لفظ ہے۔ مظفر گیلانی تو کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے اس کتاب کے بارے میں کہتے ہیں کہ'' مجھے اس کا احساس ہے کہ یہ کوئی ادبی پائیدار چیز نہیں ہے۔ میں ایک دیہات کا رہنے والا ہوں اور ایک دیہاتی کہاوت ہے کہ 'کانی کو کون سراہے تو اس کی نانی'۔ گیلانی صاحب سے جب کہا گیا کہ کتاب ضرور شائع ہونی چاہیے تو بولے ''بھائی! بڑے بڑے اونٹ دہائے جائیں اور بھیڑ یا پوچھے کتنا پانی؟'' ۔۔۔۔۔ لکھتے ہیں کہ ان کی ''یہ کتاب اچھی بری جیسی بھی ہے، آپ کے سامنے ہے، اگر اس کا کوئی مضمون آپ کو پسند آئے تو ہم لوگوں کے لیے دعائے خیر کیجیے گا اور اگر پسند نہ آئے تو لاحول پڑھ کر کسی کونے میں پھینک دیجیے، آپ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

مظفر گیلانی نے یہ کتاب کراچی کے کسی ''عزیزم جاوید سلمہ'' کو بصد شفقت و محبت ۱۲ مارچ ۱۹۸۹ کو پٹنہ سے بھیجی تھی۔ شاید 'سلمہ' صاحب اسے کہیں رکھ کر بھول گئے ہوں اور اسے حال ہی میں پڑھا ہو۔۔۔ شاید انھیں اس کتاب کا کوئی مضمون پسند نہ آیا ہو۔۔۔۔ تبھی تو کراچی کے فٹ پاتھ پر ایک کونے میں پھینک کر چلے گئے۔ خدا جانے انھوں نے لاحول پڑھا یا نہیں، البتہ ہم نے اسے اٹھاتے وقت الحمدللہ ضرور کہا۔۔!

آج اتوار بازار کے باب میں صرف اسی ایک کتاب کا احوال بیان کرنے پر مجبور ہوا ہوں کہ اس کے آگے دیگر تمام کتابیں ماندسی پڑ کر رہ گئیں ہیں۔

'ان سے ملیے' میں جن شخصیات کے خاکے شامل ہیں ان میں مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا عبدالماجد دریابادی، سر سید علی امام، سید عبدالعزیز، عبدالمنان بیدل، نجم الہدیٰ گیلانی، سچا نند سنہا، رام پرشاد کھوسلہ ناشاد، سید محمد حسن اور ماہ منیر خاں۔ کتاب کے آخر میں مصنف نے ''مظفر گیلانی مرحوم'' کے عنوان سے تحت اپنا خاکہ لکھا ہے۔ اس سے قبل بھی اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں جن میں مصنف نے اپنی زندگی ہی میں خود کو مرحوم تصور کر کے خاکہ لکھا، حمید اختر کا 'بے وقوف' آج بھی ذہنوں میں تازہ ہے۔ اشفاق احمد نے بھی اپنے

سفرنامے 'سفر در سفر' میں ایک باب اس موضوع پر باندھا تھا۔

مولانا مناظر احسن گیلانی ایک جید عالم دین تھے۔ زیر تذکرہ کتاب میں مظفر گیلانی کا مولانا پر لکھا خاکہ ایک طرح سے ان کی مختصر سوانح حیات کہلائے جانے کے قابل ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی مرض قلب کا شکار ہوئے اور ۱۵ اپریل ۱۹۴۹ کو عثمانیہ یونیورسٹی دکن کی اٹھائیس سالہ ملازمت سے مستعفی ہو کر اپنے گاؤں گیلان [گیلانی، سابق ضلع پٹنہ، موجودہ ضلع نالندہ] چلے گئے تھے۔ انھوں نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا ''۱۵ اپریل ۱۹۴۹ کو بالآخر حیدرآباد دکن سے آخری دفعہ خروج بالصدق کی نعمت میسر آئی۔ آج سے تین سال پہلے اسی مالک کے حکم سے اس شہر میں دخول بالصدق میسر آیا تھا اور اسی کے حکم سے خروج بالصدق بھی آسان کیا گیا۔''

'ان سے ملیے' کے مصنف مظفر گیلانی ۱۹۳۷ میں ایم اے کے طالب علم تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے پٹنہ کالج میگزین کے لیے ایک نظم لکھی جس کا عنوان تھا 'چھوٹا ناگپور کی لڑکیاں' اور ڈرتے ڈرتے اسے مولانا مناظر کے پاس اصلاح کے لیے حیدرآباد دکن بھیج دیا۔ چند روز بعد مولانا کا جواب ملا، انھوں نے مظفر صاحب کو شاعری کرنے سے سختی سے منع کیا لیکن ساتھ ہی ان کی دل جوئی کی خاطر بقول مظفر گیلانی ''اس لچر پوچ نظم کی نہ صرف اصلاح کر دی بلکہ دو چار شعر اپنی جانب سے بڑھا بھی دیے جس کا ایک شعر مجھے آج تک یاد ہے۔ سنیے گا؟ مولانا بھی تو کبھی جوان تھے:

یہ ابلتی لڑکیاں اس چل چلاتی دھوپ میں
سنگِ اسود کی چٹانیں آدمی کے روپ میں

مظفر گیلانی مزید لکھتے ہیں: ''جن لوگوں نے چھوٹا ناگپور کے پہاڑی علاقوں میں وہاں کی کالی کالی سنتھال لڑکیوں کو دھوپ میں کام کرتے دیکھا ہے، وہی کچھ اس شعر کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔''

یہ ۱۹۲۸ کی بات ہے جب مولانا مناظر احسن گیلانی نے مولانا عبدالماجد دریابادی کی رفاقت میں حج کیا۔ واپسی پر ایک نعت مکمل کی جس کو شروع تو اردو میں کیا گیا تھا لیکن بعد ازاں فارسی اور عربی میں مکمل کیا۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہر ایک سے ٹکرا کر ہر شغل سے گھبرا کر
ہر فعل سے شرما کر ہر کام سے پچھتا کر
آمد بدرت بنگر
اے خاتمِ پیغمبر
یا قاسمِ للکوثر اے سرور ہر سرور
اے رحم جہاں پرور آقائے کرم گستر
آمد بدرت بنگر

امروز چہ مہمانے　　　ناکارہ و نادانے
آلودۂ عصیانے　　　آغشتۂ دامانے

آمد بدرت بنگر

نے مونس و نے یادر

تو جوششِ رحمانی　　　تو سایۂ یزدانی
تو شاہدِ ربانی　　　تو جلوۂ سبحانی
ہر رنج و پریشانی　　　بنگر کہ مسلمانی
در ورطۂ ظلمانی　　　در فتنہ و طغیانی

مظفر گیلانی، مولانا مناظر کے سفرِ آخرت کے باب میں لکھتے ہیں: ''مولانا کا سفرِ آخرت بھی قابلِ رشک تھا۔ ۵ جون ۱۹۵۶ کی شب کو سوانح قاسمی کی تیسری جلد کے آخری باب کو مکمل کر کے بسترِ خواب پر دراز ہوئے۔ اپنے بھانجے روح اللہ سے فانی کی مشہور غزل ع: 'کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ' ترنم سے پڑھ کر سنانے کی فرمائش کی۔ پھر مولانا کو نیند آ گئی۔ صبح جب ان کے چھوٹے بھائی مکارم احسن نے، جو پاس ہی لیٹے تھے، اپنے محبوب بھائی کو جگانا چاہا تو خود اپنی غفلت پر سر پیٹ کر رہ گئے۔''

☆

'ان سے ملیے' کا اندازِ بیان دلنشیں ہے۔ اس کے مطالعے کے وقت یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ہم ایک ایسے شخص کی تحریر پڑھ رہے ہیں جو آج کی ادبی دنیا کے لیے ایک گمنام انسان ہے بلکہ وہ اپنے انداز بیاں سے بشکل ایک کہنہ مشق ادیب کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ مظفر گیلانی سر علی امام کے معتقد تھے۔ ان کے انتقال کے بعد مرحوم کی اہلیہ کے پاس پہنچے اور کئی واقعات سے لدے پھندے واپس لوٹے۔ 'سر علی امام کی کہانی لیڈی امام کی زبانی' کے عنوان سے لکھے گئے خاکے میں مظفر گیلانی نے سر علی امام کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو پڑھنے والوں پر آشکار کیا ہے۔ علی امام ۱۱ فروری ۱۸۶۹ کو بہار کے ایک گاؤں 'کرائے پرسرائے' میں پیدا ہوئے۔ علی امام کے والد شمس العلماء نواب امداد امام [اثر] تھے۔ عربی و فارسی کے جید عالم اور ایک ماہر طبیب۔ علی امام نے میٹرک کرنے کے بعد مراد پور میں کالج میں داخلہ لیا۔ تنگ دستی کے دن تھے۔ جیسے تیسے بسر ہو رہی تھی۔ ان کے چچا مولوی یوسف امام کو اکثر اپنی زمینداری کے مقدمات کی پیروی کے سلسلے میں 'کرائے پرسرائے' سے پٹنہ آنا پڑتا تھا۔ ایک روز وہ علی امام کے پاس آئے اور کہا کہ بیٹا، ان کاغذات کا انگریزی ترجمہ کر دو۔ علی امام نے دوسرے روز کاغذات اپنے چچا کے سامنے رکھے اور کہا کہ اگر اس مقدمے کے سلسلے میں جج صاحب کے سامنے ان نکات کو دہرائیں جو میں کہہ رہا ہوں، تو آپ یہ مقدمہ جیت جائیں گے۔ مولوی صاحب اپنے بھتیجے کی اس صلاحیت سے واقف نہ تھے، ہکا بکا رہ گئے۔ کچھ عرصے کے بعد انھوں نے علی امام کو بیرسٹری کی تعلیم کے لیے ولایت بھیج دیا۔ اس وقت علی امام کے والد زندہ تھے

لیکن وہ اس اعلی تعلیم کا بار اٹھانے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ علی امام ولایت سے لوٹے اور پٹنہ ہی میں وکالت شروع کر دی، اور ان کے دن پھر گئے۔ کچھ ہی عرصے میں حکومت نے انھیں ایک اعلی عہدے پر فائز کر دیا، پھر وائسرائے کونسل کے لا ممبر بنے اور نائب صدر ہوئے۔ ۱۹۱۰ میں سر کا خطاب ملا۔ اہل بہار ان کو اپنا محسن مانتے ہیں کہ انھی کے مشورے سے بہار، بنگال سے علاحدہ ہو کر ایک نیا صوبہ بنا۔ ۱۹۱۹ میں سر علی امام نظام حیدر آباد کی درخواست پر حکومت کی اجازت سے صدر اعظم ہو کر حیدر آباد چلے گئے۔ وہاں مؤید الملک کا خطاب ملا۔ دنیاوی ترقی ملتی گئی اور علی امام کی طبیعت میں انکساری بڑھتی گئی۔ پھر ایک وقت آیا جب سر علی امام لا ممبر تھے اور لارڈ ہارڈنگ پٹنہ آئے اور ان کی حسن منزل میں دعوت کی گئی۔ وہاں سخت فوجی پہرہ تھا۔ سر علی امام انتظامات میں مشغول تھے کہ گیٹ کی جانب سے ایک ہنگامے کی آواز سنائی دی۔ وہ لپک کر وہاں پہنچے۔ پھر لوگوں نے دیکھا کہ وہ نہایت ادب سے کھدر میں ملبوس، ہاتھ میں ڈنڈا تھامے ایک دیہاتی بزرگ کو اپنے ہمراہ لیے چلے آرہے ہیں۔ یہ بزرگ ان کے چچا مولوی یوسف امام تھے جن کو گیٹ پر فوجیوں نے روک لیا تھا۔ ان کے چچا کہہ رہے تھے کہ میاں! مجھے کیا معلوم تھا تمھارے یہاں یہ گڑبڑ مچی ہوئی ہے ورنہ کبھی نہ آتا۔ اور ادھر سر علی امام تھے کہ معافی پر معافی مانگ رہے تھے۔ بڑے ادب سے ایک ممتاز جگہ پر بٹھایا اور وائسرائے کی آمد پر ان سے یہ کہہ کر اپنے چچا کا تعارف کرایا کہ 'یہ میرے اپنے چچا صاحب ہیں۔ انھوں ہی نے مجھے اپنے اوپر بڑی تکلیف سہہ کر انگلینڈ بیرسٹری پڑھنے بھیجا تھا'۔۔۔

سر علی امام ایک مقدمہ کے سلسلے میں حیدر آباد جا رہے تھے۔ راستے میں ایک صاحب ریل گاڑی کے اسی ڈبے میں سوار ہوئے اور ہر اسٹیشن پر ان کی وہ خاطر مدارات ہونی شروع ہوئی کہ سب حیران تھے کہ آخر یہ کون ہے۔ دوران گفتگو ان صاحب نے سر علی امام سے پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں کہاں جا رہے ہیں؟ سر علی امام نے جواب دیا 'میں ایک مزدور ہوں، وکالت میرا پیشہ ہے اور اسی سلسلے میں حیدر آباد جا رہا ہوں'۔ وہ صاحب بولے کہ آپ تو کافی سمجھدار معلوم ہوتے ہیں، چھوڑیے اس وکالت کو، کسی طرح حیدر آباد کی تحصیلداری میں گھس جائیے۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ اس میں کتنی 'روغنیت' ہے۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ کچھ عرصہ بعد سر علی امام صدر اعظم ہو کر حیدر آباد دکن آگئے۔ ایک مرتبہ سرکاری دورے پر اسی ضلع جانا ہوا جہاں ریل گاڑی میں ملنے والے وہی صاحب تحصیلدار تھے۔ سبھی افسر حاضری کو آئے لیکن وہ صاحب غائب تھے۔ معلوم ہوا کہ بیمار ہیں۔ سر علی امام سب کو چھوڑا اور ان کی عیادت کو جا پہنچے۔ وہاں پہنچے تو ان صاحب کی حالت دیدنی تھی۔ سر علی امام کے پاؤں پر گر پڑے اور معافی مانگنے لگے۔ علی امام نے کہا: ''کوئی بات نہیں، میں اسی لیے تو آپ کے پاس آیا ہوں کہ وہ گاڑی والی بات کا بالکل خیال نہ کیجیے گا، اطمینان سے اپنا کام کرتے رہیں۔''

سر علی امام کی موت بھی قابل رشک تھی۔ تھا ولی پوشیدہ اور کافر کھلا۔ مرنے سے دو دو روز قبل رانچی گئے جہاں ان کی کوٹھی زیر تعمیر تھی۔ موٹر سے کچھ تھکے ہوئے اترے۔ عین اسی لمحے ان کو ایسا محسوس ہوا کہ وقت قریب

لکھتے ہیں کہ آج (۱۹۸۸) پروفیسر نجم الہدی کو بہار میں جاننے والے انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں لیکن چالیس برس قبل ان کے سیاسی کارناموں، پرکیف غزلوں، دل آویز نظموں اور دلچسپ لطیفوں سے بچہ بچہ واقف تھا۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے ایک مضمون میں پروفیسر نجم الہدی کے متعلق لکھا تھا کہ اگر وہ شاعری کی جانب توجہ کرتے تو آسمانِ شاعری پر ستارہ بن کر چمکتے۔ نکاح کی ایک تقریب میں ان سے سہرا پڑھنے کی فرمائش کی گئی، انھوں نے لاکھ انکار کیا لیکن لوگوں کے مجبور کرنے پر کھڑے ہوگئے۔ مظفر گیلانی کو اس 'خاصے کی چیز' کا ایک شعر یاد رہ گیا:

چار رہزن ہیں میں اب دل کو بچاؤں کیونکر

تارِ زر، تیرِ نظر، کاکلِ پیچاں سہرا

جس زمانے میں علامہ اقبال کی مشہور غزل:

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

شائع ہوئی تو پروفیسر نجم الہدی نے اسی ردیف وقافیہ میں ایک غزل کہی اور اس کو علامہ کے پاس بغرض اصلاح بھیجا۔ اس کا ایک شعر تھا:

خلشِ جگر نے دکھادیا کہ ہے چاکری میں بھی رہبری

کہ پڑی ہے ناقۂ غزنوی کی مہار دستِ ایاز میں

مظفر گیلانی کہتے ہیں کہ علامہ اقبال نے اس غزل کی تعریف کرتے ہوئے جواب میں صرف اتنا لکھا کہ آپ کو کسی اصلاح کی ضرورت نہیں ہے۔ مشق برابر جاری رکھیے۔ لیکن علامہ نے سید سلیمان ندوی کو خط لکھ کر دریافت کیا کہ آپ کے دیار کے یہ نجم گیلانی صاحب کون ہیں؟

پروفیسر نجم الہدی گیلانی کا انتقال ڈرامائی انداز میں ہوا۔ ان کی اہلیہ کا انتقال اچانک حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے ۲۰ فروری ۱۹۸۵ کو ہوا۔ پروفیسر نجم بیماری کی وجہ سے صاحب فراش تھے۔ جب ان کو خبر ہوئی تو ان کے منہ سے صرف یہ الفاظ نکلے "کیا ہوا" ۔۔۔۔ اور پھر فوراً ہی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ دونوں میاں بیوی نے ۶۵ برس کی رفاقت کا بھرم قائم رکھا۔

☆

پٹنہ کالج میں مظفر گیلانی کے پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ تھے۔ ناشاد تخلص کرتے تھے۔ یہ ۱۹۳۲ کا زمانہ تھا۔ استاد کی عزت کی جاتی تھی۔ کھوسلہ صاحب مظفر پور کالج سے پٹنہ کالج بھیجے گئے تھے۔ آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے تھے اور پٹنہ کالج کے پہلے ہندوستانی پرنسپل تھے۔ اس سے قبل یہ عہدہ انگریزوں کے پاس رہتا تھا۔ مذکورہ خاکے میں مظفر گیلانی نے ۱۹۳۴ کے پٹنہ کالج کی نادر روزگار شخصیات کو بھی یاد کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس دور کو جن لوگوں نے دیکھا ہے صرف وہی سمجھ سکتے ہیں۔ پٹنہ کالج میں اس زمانے میں اردو اور فارسی کے اساتذہ میں نامور شعرا

بھی شامل تھے۔ایسے کہ ہر اک اپنی ذات میں انجمن تھا۔آیئے، کچھ احوال مظفر گیلانی کے قلم کی زبانی پڑھتے ہیں:

''یہ دیکھیے ڈاکٹر عظیم الدین احمد اپنی فٹن سے ٹھیک دس بجے پرشین ڈپارٹمنٹ کے سامنے اتر رہے ہیں۔ایسے نحیف اور لاغر جسم پر انگریزی لباس کیسا جچ رہا ہے اور پھر وہ گھنی مونچھیں اور سر پر ایک بھاری بھرکم اجلے ہیٹ نے تو ان کی شخصیت کو اور بھی دوبالا کر دیا ہے۔آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی طرف چلے تو لڑکوں نے سلامی داغنی شروع کر دی۔یہ پٹنہ کالج 'بزم ادب' کے گویا مستقل صدر، اردو، عربی اور فارسی کے مشہور علاّم اور نقاد اور ساتھ ساتھ صاحب دیوان شاعر بھی ہیں۔''

''اور یہ رہے استاد الاستاد حضرت بیدل منان۔رمنہ محلہ سے خراماں خراماں کالج تشریف لا رہے ہیں۔ایسا شفیق استاد نہ پہلے دیکھا تھا اور نہ اب تک دیکھا ہے۔حضرت بیدل کی ڈانٹ ڈپٹ بھی مشہور تھی اور یہ ان کی ایک خاص چیز تھی۔ایک دن ایک لڑکے پر خوب ڈانٹ پڑی۔میں بھی نزدیک ہی کھڑا تھا، کہنے لگا، بھائی! جگر کے اس شعر کا مطلب اب سمجھ میں آیا:

تم کو آتا ہے پیار پر غصہ
مجھ کو غصّے پہ پیار آتا ہے

اور حضرت شمس زبیری [یا شمس منیری؟] کا کیا کہنا۔خوب یاد ہے اور شاید بہتوں کو اب تک یاد ہوگا کہ حضرت شمس زبیری نے بزم ادب کے ایک مشاعرے میں اپنی غزل کا جب یہ شعر پڑھا تو سارا مشاعرہ لوٹ پوٹ ہو گیا۔آپ بھی سن لیجیے:

اے رہروان کعبہ تمھیں میں ہیں ہم مگر
آگے نکل گئے ہیں ذرا کارواں سے ہم

ماہ منیر خاں کا نام خاکہ و طنز نگاری میں خاصہ بلند تھا۔ایک مرتبہ خاں صاحب پٹنہ کالج کے بزم ادب کے سالانہ مشاعرے میں اپنی ایک غزل پڑھ رہے تھے۔جب انھوں نے یہ شعر پڑھا:

اب آنکھ لڑائیں گے اس شوخ ستم گر سے
لاؤ تو لڑا دیکھیں پیانے سے پیانہ

تو لکھنؤ کی ٹکسالی زبان میں گویا 'پٹس' پڑ گیا۔ہر جانب سے تعریف و تحسین کا شور بلند ہوا۔اس وقت خاں صاحب دیکھنے کے قابل تھے۔جھک جھک کر اور اٹھ اٹھ کر جس طرح داد وصول کر رہے تھے، وہ منظر آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔مجمع سخن فہموں کا تھا اور شعر کا دوسرا مصرع بھی معرکتہ الآرا تھا۔

.........﴿☆﴾.........

لکھتے ہیں کہ آج (۱۹۸۸) پروفیسر نجم الہدیٰ کو بہار میں جاننے والے انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں لیکن چالیس برس قبل ان کے سیاسی کارناموں، پرکیف غزلوں، دل آویز نظموں اور دلچسپ لطیفوں سے بچہ بچہ واقف تھا۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے ایک مضمون میں پروفیسر نجم الہدیٰ کے متعلق لکھا تھا کہ اگر وہ شاعری کی جانب توجہ کرتے تو آسمانِ شاعری پر ستارہ بن کر چمکتے۔ نکاح کی ایک تقریب میں ان سے سہرا پڑھنے کی فرمائش کی گئی، انھوں نے لاکھ انکار کیا لیکن لوگوں کے مجبور کرنے پر کھڑے ہوگئے۔ مظفر گیلانی کو اس 'خاصے کی چیز' کا ایک شعر یاد رہ گیا:

چار رہزن ہیں میں اب دل کو بچاؤں کیونکر
تارِ زر، تیرِ نظر، کاکلِ پیچاں سہرا

جس زمانے میں علامہ اقبال کی مشہور غزل:

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

شائع ہوئی تو پروفیسر نجم الہدیٰ نے اسی ردیف وقافیہ میں ایک غزل کہی اور اس کو علامہ کے پاس بغرض اصلاح بھیجا۔ اس کا ایک شعر تھا:

خلشِ جگر نے دکھادیا کہ ہے چاکری میں بھی رہبری
کہ پڑی ہے ناقۂ غزنوی کی مہار دستِ ایاز میں

مظفر گیلانی کہتے ہیں کہ علامہ اقبال نے اس غزل کی تعریف کرتے ہوئے جواب میں صرف اتنا لکھا کہ آپ کو کسی اصلاح کی ضرورت نہیں ہے۔ مشق برابر جاری رکھیے۔ لیکن علامہ نے سید سلیمان ندوی کو خط لکھ کر دریافت کیا کہ آپ کے دیار کے یہ نجم گیلانی صاحب کون ہیں؟

پروفیسر نجم الہدیٰ گیلانی کا انتقال ڈرامائی انداز میں ہوا۔ ان کی اہلیہ کا انتقال اچانک حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے ۲۰ فروری ۱۹۸۵ کو ہوا۔ پروفیسر نجم بیماری کی وجہ سے صاحب فراش تھے۔ جب ان کو خبر ہوئی تو ان کے منہ سے صرف یہ الفاظ نکلے ''کیا ہوا''۔۔۔۔ اور پھر فوراً ہی اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔ دونوں میاں بیوی نے ۶۵ برس کی رفاقت کا بھرم قائم رکھا۔

☆

پٹنہ کالج میں مظفر گیلانی کے پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ تھے۔ ناشاد تخلص کرتے تھے۔ یہ ۱۹۳۴ کا زمانہ تھا۔ استاد کی عزت کی جاتی تھی۔ کھوسلہ صاحب مظفر پور کالج سے پٹنہ کالج بھیجے گئے تھے۔ آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے تھے اور پٹنہ کالج کے پہلے ہندوستانی پرنسپل تھے۔ اس سے قبل یہ عہدہ انگریزوں کے پاس رہتا تھا۔ مذکورہ خاکے میں مظفر گیلانی نے ۱۹۳۴ کے پٹنہ کالج کی نادر روزگار شخصیات کو بھی یاد کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس دور کو جن لوگوں نے دیکھا ہے صرف وہی سمجھ سکتے ہیں۔ پٹنہ کالج میں اس زمانے میں اردو اور فارسی کے اساتذہ میں نامور شعرا

بھی شامل تھے۔ ایسے کہ ہر اک اپنی ذات میں انجمن تھا۔ آیئے، کچھ احوال مظفر گیلانی کے قلم کی زبانی پڑھتے ہیں:

''یہ دیکھیے ڈاکٹر عظیم الدین احمد اپنی فٹن سے ٹھیک دس بجے پرشین ڈپارٹمنٹ کے سامنے اتر رہے ہیں۔ ایسے نحیف اور لاغر جسم پر انگریزی لباس کیسا جچ رہا ہے اور پھر وہ گھنی مونچھیں اور سر پر ایک بھاری بھرکم اجلے ہیٹ نے تو ان کی شخصیت کو اور بھی دوبالا کر دیا ہے۔ آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی طرف چلے تو لڑکوں نے سلامی داغنی شروع کر دی۔ یہ پٹنہ کالج 'بزم ادب' کے گویا مستقل صدر، اردو، عربی اور فارسی کے مشہور علام اور نقاد اور ساتھ ساتھ صاحب دیوان شاعر بھی ہیں۔''

''اور یہ رہے استاد الاستاد حضرت بیدل ملتان۔ رمنہ محلہ سے خراماں خراماں کالج تشریف لا رہے ہیں۔ ایسا شفیق استاد نہ پہلے دیکھا تھا اور نہ اب تک دیکھا ہے۔ حضرت بیدل کی ڈانٹ ڈپٹ بھی مشہور تھی اور یہ ان کی ایک خاص چیز تھی۔ ایک دن ایک لڑکے پر خوب ڈانٹ پڑی۔ میں بھی نزدیک ہی کھڑا تھا، کہنے لگا، بھائی! جگر کے اس شعر کا مطلب اب سمجھ میں آیا:

تم کو آتا ہے پیار پر غصہ
مجھ کو غصے پہ پیار آتا ہے

اور حضرت شمس زبیری [یا شمس منیری؟] کا کیا کہنا۔ خوب یاد ہے اور شاید بہتوں کو اب تک یاد ہوگا کہ حضرت شمس زبیری نے بزم ادب کے ایک مشاعرے میں اپنی غزل کا جب یہ شعر پڑھا تو سارا مشاعرہ لوٹ پوٹ ہو گیا۔ آپ بھی سن لیجیے:

اے رہروان کعبہ تمھیں میں ہیں ہم مگر
آگے نکل گئے ہیں ذرا کارواں سے ہم

ماہ منیر خاں کا نام خاکہ و طنز نگاری میں خاصہ بلند تھا۔ ایک مرتبہ خاں صاحب پٹنہ کالج کے بزم ادب کے سالانہ مشاعرے میں اپنی ایک غزل پڑھ رہے تھے۔ جب انھوں نے یہ شعر پڑھا:

اب آنکھ لڑائیں گے اس شوخ ستم گر سے
لاؤ تو لڑا دیکھیں پیمانے سے پیمانہ

تو لکھنؤ کی ٹکسالی زبان میں گویا 'پٹس' پڑ گیا۔ ہر جانب سے تعریف و تحسین کا شور بلند ہوا۔ اس وقت خاں صاحب دیکھنے کے قابل تھے۔ جھک جھک کر اور اٹھ اٹھ کر جس طرح داد وصول کر رہے تھے، وہ منظر آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ مجمع سخن فہموں کا تھا اور شعر کا دوسرا مصرع بھی معرکتہ الآرا تھا۔

☆

مطالعے کی میز سے

[خاص تبصرے]

● سید محمد عقیل

(۱)

سہ ماہی آمد (کتابی سلسلہ ۵) ملا۔ سرِ ورق پر ہی ابن صفی اور وہاب اشرفی مرحومین کی تصویریں شائع کی گئی ہیں جس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس شمارے میں انھیں حضرات سے متعلق مندرجات ہوں گے۔ اور یہی مجموعی طور پر ہے بھی کہ یہ شمارہ ایک طرح سے دونوں مرحومین کا خاص نمبر بن گیا ہے۔ وہاب اشرفی مرحوم میرے دوستوں میں سے تھے اور ابنِ صفی (اسرار ناروی) میرے ہم جماعت بھی تھے۔ ہم لوگ الہ آباد کے مشہور کالج ایونگ کرسچن کالج میں پڑھتے تھے۔ یہ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۸ء تک کا زمانہ ہے۔ اس وقت اسرار ناروی، تیغ الہ آبادی اور راقم الحروف چھوٹے موٹے شاعر بھی تھے۔ تیغ (پاکستان جا کر مصطفےٰ زیدی بن گیا کہ یہی اس کا اصلی نام بھی تھا) ہم سب سے بہتر شاعر تھا۔ اسرار ناروی بھی اچھے شاعر تھے اور جس وقت وہ اپنے لحنِ داؤدی سے اپنی غزلیں سناتے، تو مشاعرہ لوٹ لیا کرتے۔ وہ اصلاً شاعر ہی تھے مگر بعد کو جاسوسی ناول نگار بن گئے۔ اسرار ناروی (ابنِ صفی) کا جاسوسی ناول نگاری کا شوق بعد کی صورت ہے۔ اُسی وقت وہ کبھی کبھی مزاحیہ اور فکاہیہ افسانے اور طنزیے بھی طغرل فرغان کے نام سے لکھا کرتے تھے اور جعلی و کم مایہ ادیبوں کا خاکہ بھی اڑایا کرتے تھے۔ مگر 'آمد' کے اس نمبر میں ''طغرل فرغان'' کا ذکر کسی نے نہیں کیا۔ طغرل فرغان (ابن صفی) کے یہ فکاہیہ خاکے گاہے ماہے عباس حسینی مرحوم کے 'نکہت' نام کے رسالے میں شائع ہوا کرتے۔ راقم نے اپنی ابتدائی زندگی میں بہت سے جاسوسی ناول انگریزی جاسوسی ناول نگار رینالڈس (REYNOLDS) کے پڑھے ہیں جو تیرتھ رام فیروز پوری کے ترجمہ کیے ہوئے ہوتے تھے۔ جو 'فسانۂ لندن' اور 'نظارۂ پرستان' نیز 'شب حسرت' کے ناموں سے شائع ہوا کرتے۔ ان میں ہر طرح کے کردار ہوا کرتے تھے جن میں ٹام رتین، اولڈ ڈِیتھ نیز آرسین لوپن کافی مشہور ہوئے جو بے حد دلچسپ بھی تھے۔ کسی نے بتایا کہ ابنِ صفی کے حمید، فریدی اور عمران بھی ایسے ہی کردار تھے۔ مگر مجھے رفتہ رفتہ جاسوسی ناولوں کے پڑھنے میں وقت کا زیاں نظر آنے لگا اور پھر جاسوسی ناول کو میں محض وقت گزاری کا نسخہ سمجھنے لگا اور یہ ناول مجھے متوجہ نہ کر سکے۔ ہو سکتا ہے یہ تبدیلیِ مزاج میری مدرّسانہ زندگی سے آئی

ہو۔ تاہم میں نے ابن صفی کے کچھ ابتدائی ناول پڑھے ہیں۔ شاید جاسوسی تحریریں ایک خاص عمر کے لوگوں کو وقت گزاری اور تحیّر خیزی کے لیے بھی پسند آتے ہوں۔

وہاب اشرفی سے متعلق آمد میں بہت اچھے تجزیے، مضامین اور معلومات فراہم کر دیے گئے ہیں۔ میں وہاب اشرفی مرحوم کو اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ شاہ شکیل صاحب کے ساتھ گیا کالج میں اردو کے استاد تھے۔ اُس وقت گیا میں کلام حیدری، شاہ شکیل احمد، فصیح ظفر اور حسنین اسلم عظیم آبادی وغیرہ کا ایک اچھا ادبی گروپ تھا۔ کلام حیدری مرحوم کے دولت کدے 'رینہ ہاؤس' پر خاصے ادبی اجتماع ہوا کرتے۔ الہ آباد سے سید احتشام حسین اور راقم بھی اکثر ان میں شرکت کے لیے جایا کرتے تھے۔ وہاب مرحوم، خوب خوب ادبی بحثیں کرتے اور گیا ان حضرات کی وجہ سے گلزار رہا کرتا۔ 'آمد' نے قمر رئیس کا بے حد اچھا اور معلوماتی مقالہ اس نمبر میں شائع کیا ہے۔ وہاب اشرفی پر کام کرنے والوں کے لئے یہ نمبر خاصہ مددگار ہوگا۔ یہ بات اب بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ وہاب اشرفی مرحوم نے اپنی معاشی زندگی کا آغاز انشورنس کمپنی کی ایجنسی سے کیا تھا مگر بہت جلد وہ اس سے دست بردار ہو کر ادبی حلقے میں داخل ہو گئے۔ 'آمد' میں سرور حسین کا مقالہ "وہاب اشرفی کا تہذیبی و سماجی نظریہ" بھی ایک اچھا مقالہ ہے۔ صفدر امام قادری کا ایک تنقیدی مقالہ وہاب اشرفی پر انھیں کی زندگی میں شائع ہو چکا ہے۔ کچھ حرج نہ ہوتا اگر اُس مقالے کو بھی اس شمارے میں شامل کر لیا جاتا مگر خیر۔ وہاب اشرفی افسانے بھی لکھتے تھے، مجھے اس کا علم نہ تھا۔ ویسے وہاب اشرفی نے اپنی اس مختصر سی زندگی میں جتنا کام کیا وہ کم لوگوں سے ممکن ہو سکے گا۔ راقم کا خیال ہے کہ قاضی عبدالودود کی تحقیق سے لوگ ڈرتے ضرور رہیں گے مگر وہاب اشرفی کو لوگ شوق و اشتیاق سے پڑھتے رہیں گے اور ان کی تحریروں سے، بہت کچھ معلومات انھیں حاصل ہوتی رہیں گی۔ خصوصاً ان کا عالمی ادب والا کام تو حیرت انگیز کام ہے۔ لیکن راقم ان کے مابعد جدیدیت والے کام سے مطمئن نہیں ہے۔ میں اسے نیم پختہ اور بحث طلب سمجھتا ہوں۔ ادھر کچھ دنوں پہلے انگریزی ادب کے ایک مشہور پروفیسر نے ایک کتاب ILLUSION OF POST MODERNISM لکھی ہے جو اردو والوں اور ہندوستانی پوسٹ ماڈرنزم سے بالکل الگ کتاب ہے جو انگریزی ادب کے مشہور ناقد ٹیری اینگلٹن کی لکھی ہوئی ہے یہ کتاب ابھی دو تین برس پہلے آئی ہے۔ پھر بھی وہاب اشرفی کا تنقیدی کام شائقین ادب کے بہت کام آئے گا۔ ان کی تحریریں اردو تنقید کی تاریخ میں یقیناً اپنا ایک اہم مقام بنائے رہیں گی۔

'آمد' کے اس نمبر میں مشہور افسانہ نگار جیلانی بانو کا ایک معرکہ کا افسانہ "گوشت کی دوکان" شامل ہے جو آج کے انسانوں اور سوسائٹی کی زندگی کا ایک المناک بیانیہ ہے۔ کبھی میں نے انگریزی میں ایک محاورہ پڑھا تھا HANDS CAN BE GOOD LIKE DOCTOR'S HAND آج کی زندگی میں ڈاکٹر اور اسپتال بالکل مخالف سمتوں میں اس انگریزی مقولے پر عمل کر رہے ہیں۔ تقریباً بیس پچیس برس پہلے ہائی کورٹ کے ایک جج جسٹس آنند نرائن ملّا نے جو اردو کے مشہور شاعر بھی تھے، انھوں نے پولیس کے خلاف اپنے ایک فیصلے میں لکھا تھا کہ یہ محکمہ اب ایک منظم اور LEGALISED ڈاکوؤں کا محکمہ بن گیا ہے (AN ORGANIZED AND

(LEGALIZED GANG OF DACOITES) آج یہی صورت ہسپتالوں اور ہندوستان کے ڈاکٹروں کی ہوگئی ہے اور پرائیوٹ نرسنگ ہوموں میں تو یہاں تک معاملہ پہنچ چکا ہے کہ مریض اگر اچھا ہو گیا تب بھی اسے زبردستی کئی دن محض WATCH کرنے کے بہانے سے روکے رکھتے ہیں اور پھر کوئی نئی خرابی اس میں ڈھونڈھ نکالتے ہیں اور جس بات پر جیلانی بانو نے کہانی لکھی ہے وہ تو عام طور پر ہو ہی رہی ہے۔ افسوس کہ آج انسانوں کا کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ لیکن انسان کی مجبوری یہ ہے کہ وہ جائے تو کہاں جائے۔ میری رائے میں جیلانی بانو کی اس کہانی کو ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی شائع ہونا چاہیے۔ آج عام طور پر اسپتال پھانسی گھر بنے ہوئے ہیں اور معالج، قصاب اور اعضائے انسانی کے تاجر۔

(۲)

اِدھر اردو کے ایک مشہور ناقد، ش۔ اختر کی ایک نئی کتاب ''شکیل الرحمان کی جمالیاتی تنقید'' شائع ہوئی ہے۔ ش۔ اختر اردو تنقید کے اہم عارفوں میں سے ایک ہیں۔ انھوں نے شکیل الرحمان کی جمالیاتی تنقید پر ایک ''خاص ڈھنگ'' سے یہ کتاب لکھی ہے۔ پہلے ش۔ اختر صاحب کے یہ جملے شکیل الرحمان کے لئے ملاحظہ کیجیے:

(۱) ''مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات'' ایک نئی سمت کی طرف ناقدین ادب کی توجہ مبذول کرنے میں کامیاب ہوئی۔ گزشتہ نصف صدی کا یہ سب سے اعلیٰ تنقیدی صحیفہ ہے۔ غالب شناسی پر اب تک اس سے بہتر کتاب اردو میں نہیں آئی۔

(۲) ''ہمارے اربابِ حَل وعقد نے اپنی علمیت کے اعتبار سے تنقید کی کئی قسمیں پیش کی ہیں لیکن وہ سب تخلیق کی اعلیٰ منزل تک نہیں پہنچیں ...... احتشام حسین سے علی سردار جعفری تک تقریباً سبھی ترقی پسند ناقدوں نے صرف تشریح کا کام کیا ہے۔''

(۳) ''اردو ادب کی لگ بھگ ایک ہزار سال کی تاریخ میں صرف ایک نام شکیل الرحمان کا ہے جنھوں نے ایک مورچہ بنا کر جمالیات پر کام کیا ہے۔''

(۴) ''وہ (شکیل الرحمان) اساطیری (LEGENDARY) ذہن کے مالک ہیں اور بے پناہ تخلیقی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگر وہ ناول نگار ہوتے تو دنیا کے ایک بڑے ناول نگار ہوتے۔ (وہ پہلے ناول نگار بھی تھے۔ ان کا ایک ناول 'آج کے فرہاد' بہت پہلے غالباً بیسویں صدی والوں نے شائع کیا تھا) (دنیا کے بڑے ناول نگار۔ صرف اردو کے نہیں یعنی ان کا نام دنیا کے بڑے ناول نگاروں، ٹالسٹائے، گورکی، وکٹر ہیوگو کا ناول لامزریب (LES MISERABLES)، ترگنیف، ہارڈی، ہمنگ وے، موبی ڈک والے، میل وِل، لاترانژے اور پلیگ والے، کامیو، ہاورڈ فاسٹ، ای۔ ایم۔ فاسٹر اور دوسرے ناول نگار۔ بھلا ہادی رُسوا پریم چند اور قرۃ العین حیدر وغیرہ کس شمار وقطار میں ہیں)

(۵) ''اگر آپ تخلیقی صلاحیتوں سے محروم ہیں تو شکیل کی جمالیات تنقید کے کارناموں کو اپنا موضوع نہیں بنا سکتے۔''

راقم نے شکیل الرحمان کی جمالیات پر لکھی ہوئی کچھ کتابیں پڑھی ہیں۔ کچھ سمجھ میں آئیں اور کچھ کو سمجھنے

کے لیے میرے پاس اتنا علم بھی نہیں کہ میں عالمِ لاہوت اور عالمِ ناسوت نیز ہندو علم الاصنام کی باتیں سمجھ سکوں۔ پھر بھی میں نے اپنے مقدور بھر کوشش کی ہے۔ شکیل الرحمان نے اردو کے مختلف اصناف شاعری غزل، نظم، مثنوی وغیرہ میں بھی جمالیات کی کارفرمائیاں تلاش کی ہیں مگر اردو کی ایک بڑی صنف مرثیہ کو چھوڑ دیا ہے۔ یہاں راقم انیسؔ کے اور کچھ دیگر مرثیوں سے کچھ اشعار پیش کر کے یہ جاننا چاہتا ہے کہ کیا یہ جمالیات کے زُمرے میں آتے ہیں یا نہیں :

(۱) ''وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور/ دیکھے تو غش کرے اَرنی گوئے اوج طور/ پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور/ وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور/ گلشن خجل تھے وادیٔ مینو اساس سے/ جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے/''

(۲) ''ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں، وہ بیاباں وہ سحَر/ دَم بہ دم جھومتے تھے وجد کے عالم میں شجر/ اوس نے فرش زمرد پہ بچھائے تھے گہر/ لوٹی جاتی تھی لہکتے ہوئے سبزے پہ نظر/ دشت سے جھوم کے جب بادِ صبا آتی تھی/ صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی تھی/ بلبلوں کی وہ صدائیں، وہ گلوں کی خوشبو/ دل کو الجھاتے تھے سُنبل کے وہ پُرخَم گیسو/ قمریاں کہتی تھیں شمشاد پہ یا ہو یا ہو/ فاختہ کی یہ صدا سَرو پہ تھی گو گو گو/ وقت تسبیح کا تھا، عشق کا دم بھرتے تھے/ اپنے معبود کی سب حمد وثنا کرتے تھے/''

(۳) ''یہی ہے تیغ دوسُرا آسماں سے آئی ہوئی/ بنی بنائی ہوئی اور بچی سجائی ہوئی/ خدا کی بھیجی ہوئی، مصطفیٰ سے پائی ہوئی/ علی سے حیدرِ صفدر کی آزمائی ہوئی/ بسر رفاقتِ حیدر میں اس نے راتیں کیں/ جری تھی ایسی کہ شیرِ خدا سے باتیں کیں/ (یہاں اس بند کی اشاریت کہاں تک جاتی ہے، اسے ایک ذہین قاری ہی سمجھ سکتا ہے۔)

(۴) ''وہ مرقّع ہو کہ دیکھیں اسے اگر اہلِ شعور/ ہر ورق میں کہیں سایہ نظر آئے کہیں نور/ غُل ہو، یہ ہے کششِ مُوقلمِ، طرّۂ حور/ ایک اک حرف میں ہو صنعتِ صانع کا ظہور/ کوئی ناظر جو یہ نایاب نظیریں سمجھے/ نقشِ ارژنگ کو کاواک لکیریں سمجھے/''

(۵) ''اس شان سے فَرس پہ شہ انس و جن چڑھے/ جس طرح نکلے ابر سے خورشید دن چڑھے''

(۶) ''رایت وہ سبز، لشکرِ سادات کا نشاں/ دامانِ پاک، کشتیِ امّت کا بادباں/ پنجہ، مثالِ پنجۂ خورشید زرفشاں/ پرچم تھا بال کھولے تھی یا حُوریِ جناں/ مُشک وعبیر وعُود کا بازار سرد تھا/ مٹّی کا عِطر، خاک کی خوشبو سے گرد تھا/''

(۷) ''ڈوبتے جاتے تھے دریائے فلک میں تارے/ اوس تھی نور کے یا چھوٹتے تھے فوّارے/ ہمہ تن محو تھے اس دشت کے طائر سارے/ نخل ہلنے لگے جب مرغ چمن چہکارے/ زمیاں، سبزۂ نوخیز کی تھیں خاروں میں/ بلبلیں پھول لئے پھرتی تھیں منقاروں میں/''

(۸) ''سحر چلا فوجِ مخالف پہ اڑا کر توسن/ چوکڑی بھول گئے جس کے تگاپو سے ہرن/ وہ جلال اور وہ شوکت وہ غضب کی چتون/ ہاتھ میں تیغ، کماں دوش پہ بر میں جوشن/ دوسرے دوش پہ شملے کے جو بل کھاتے تھے/ کاکلِ حور کے سب پیچ کھلے جاتے تھے/''

(۹)　"وہ سُم، وہ نعل، اور وہ سینے، وہ تُرک تاز/ بدر و ہلال، آئینہ و کبک شاہباز/ زیور تھا، ایک شب کی دلہن کا کہ ان کے ساز/ وہ کلغیاں کہ طرّہ لیلیٰ سے سرفراز/ بن کر گہر، پسینے کے قطرے ٹپکتے تھے / ہیکل کی تختیاں کہ ستارے چمکتے تھے/"

ایسی محاکاتی اور متحرک جمالیات کی مثالیں شاید ہی کہیں ہوں، شاید شکیل الرحمان کی نظر سے یہ نہیں گذریں۔ نہ ہی انھوں نے جمالیات کی REFLECTION THEORY پر زیادہ غور کیا ہے۔ ماہر جمالیات اور فلسفی جان ڈیوی کا یہ نظریہ کہ ایک فن کار کے نزدیک اس کی تخلیق کے تاثرات اندرونی اور بیرونی ہو کر کیا فضا تیار کرتے ہیں اور سامع کہاں تک ان کے پرتو سے متاثر ہوتا ہے، جمالیات پر پھیل کر باتیں کرتے ہوئے ان صورتوں اور تاثرات کو بھی نظر میں رکھنا پڑتا ہے۔ ایسے بیانات اور اظہاریت کے ساتھ، مرثیے میں جمالیات، اپنی مخزونی فضا سے سامعین کو تھوڑی دیر کے لیے الگ لے جاتے ہیں جس کا اندازہ جمالیات کی کلّیت' (TOTALITY) پر باتیں کرنے والوں کو کرنا چاہیے۔ ش۔ اختر کی کتاب میں ان باتوں کا بھی ذکر ہوتا تو بہتر ہوتا۔

(۳)

ش اختر کی اس نئی کتاب پر گفتگو کر ہی رہا تھا کہ روشنائی (پاکستان) کا شمارہ (۵۱) دستیاب ہوا۔ احمد زین الدین بڑی محنت اور تن دہی سے یہ رسالہ نکال رہے ہیں۔ ان کے مشیروں میں ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے اہم ادیب شامل رہتے ہیں کہ رسالے کو بہتر سے بہتر بنا سکیں کبھی کبھی ان کی یہ کوشش کامیاب ہو بھی جاتی ہے۔ اردو رسالوں کے قارئین کا عجب مزاج ہے۔ وہ آپ کو سو روپے کا ناشتہ کرا سکتے ہیں مگر سَو پچاس روپے کا رسالہ خرید کر نہیں پڑھیں گے۔ تو ایڈیٹر بیچارہ کب تک آپ کو مفت رسالہ پڑھنے کے لیے دیتا رہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ رسالے کے ایڈیٹر کے دوست احباب اکثر دوستی کے ناتے، ایڈیٹر پر دباؤ ڈال کر غیر معیاری چیزیں بھی چھپوا لیتے ہیں جس سے رسالے کی ساکھ مجروح ہوتی ہے۔ مجھے کبھی کبھی 'روشنائی' میں ہندوستان' کے نام نہاد لکھنے والوں کی چیزیں بھی' خاصے' کے طور پر چھپی ہوئی ملتی ہیں۔ اب اسے ایڈیٹر کی مجبوری ہی سمجھنا چاہیے۔

روشنائی کے اس شمارے میں کہانیاں اور شعری حصّہ مجھے پسند آیا۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ شاعری پھر اپنا رنگ بدل رہی ہے اور نئے شعرا، اپنی دُھن میں خاصے اچھے تجربے کر رہے ہیں۔

آلِ احمد سُرور صاحب کا گوشہ نئے پرانے مضامین ملا کر اچھا ہو گیا ہے مگر علی گڑھ کے ادیبوں نے سُرور صاحب پر تقریباً کچھ نہیں لکھا۔ کیا وقت تھا جب سُرور صاحب کا طوطی بولتا تھا!!! اور اب یہ صورت ہے کہ ع۔ کس نمی پرسد کہ بھیا کون ہو۔ سُرور صاحب نے اپنی تنقید کی زبان کیا خوب بنائی تھی۔ وہ قدیم طرز تنقید میں تو کچھ نہ تھے کہ رشید احمد صدیقی سے بہتر نہ ہو سکے مگر ترقی پسندوں کے ساتھ ان کی تنقیدی حیثیت خاصی چمکی۔ پھر وہ جدیدیوں کے ساتھ جدید ہو گئے اور "تحفۃ السّرُور" میں خوب سراہے گئے مگر ع۔ "خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود" سے آگے نہ گئے۔ پھر بھی اردو کی تنقیدی تاریخ میں ان کی حیثیت رہے گی اور وہ تنقید میں ایک اہم ناقد رہیں گے۔

سہ ماہی ''آمد'' کا فکر انگیز اداریہ

● علی حیدر مَلِک

[پاکستان]

نوٹ : جناب خورشید اکبر صاحب! ''آمد''(۵) سے متعلق علی حیدر ملک کے کالم کا تراشہ ارسالِ خدمت ہے۔'اخبار جہاں' تقریباً 2,50,000 (ڈھائی لاکھ) چھپتا ہے، اور پاکستان کے علاوہ مِڈل اِسٹ کے تمام ممالک، لندن، نیویارک، دہلی میں فروخت ہوتا ہے۔

آپ کا

صبا اکرام

پاکستان اسٹڈی سرکل کی نشست کی صدارت اس بار ڈاکٹر محمد رضا کاظمی اور نظامت نسیم انجم نے انجام دی۔ نشست میں سہ ماہی ''آمد'' کے شمارہ نمبر پانچ میں خورشید اکبر کا تحریر کردہ اداریہ پڑھ کر سنایا گیا جس کا عنوان تھا ''ادب کی جمہوریت۔'' اس اداریے میں کہا گیا تھا کہ ''اپنی بعض کوتاہیوں اور فطری نارسائیوں کے باوجود جمہوریت اس وقت دنیا کا سب سے پسندیدہ نظام حکومت ہے۔ جمہوریت کسی بھی آزاد مملکت یا سیاسی نظام کی معاشرتی زندگی کے تمام ترشعبوں پر محیط ہوتی ہے۔ اس لیے ادب جیسا حساس ترین علاقہ بھی اس کے اچھے بُرے اثرات سے مستثنٰی نہیں رہ سکتا، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی ادب کی اپنی کوئی جمہوریت بھی ہوتی ہے؟ اس کا جواب مثبت اور منفی دونوں صورتوں میں دیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ادب کے بعض دانشوروں کے ایک جرگے کا کہنا ہے کہ ادب سب سے بڑی جمہوریت ہے۔ اس کے برعکس دوسری جماعت ادب کی اشرافیہ قدروں پر اعلانیہ فخر کرتی ہے نیز مواد موضوعات کی شدت اور تہہ دار کیفیتوں کے مقابلے میں ہیئت ہی کو ادب کی کل کائنات تصور کیے بیٹھی ہے، اور بہ زعم خود جمہوریت پسند عوامی سرگرمیوں کو غیر ادبی سروکار کے زمرے میں رکھتی ہے۔ ان دو

مکاتب فکر کے علاوہ ایک تیسرا گروہ بھی ہے جو ادب کی جمہوریت اور اشرافیت سے قطع نظر اسلوب وطرزِ اظہار کے مجموعی تاثر کو ادب کا شناخت نامہ قرار دیتا ہے۔ ہر چند کہ برصغیر ہند کا اردو معاشرہ کم و بیش نام نہاد جمہوری نظام میں سانس لے رہا ہے لیکن افسوس کہ آج بھی جمہوریت کی اصلی لذتوں سے محروم ہے۔ ترقی پسندوں نے آزادی کے قبل ہی سے بڑی حد تک جمہوری ادب کی تخلیق کا بیڑہ اٹھایا تھا اور انھوں نے کما حقہ، اپنے ادبی فرائض کی انجام دہی کا پاس بھی رکھا لیکن بہت جلد اپنے مخصوص سیاسی ایجنڈے کے جبر کے تحت فرد کی آزادی سے چشم پوشی عام ہوگئی اور آہنی حجاب کے سائے میں ادب کی جمہوریت پر ادبی سیاست غالب آگئی۔ مابعد کے دنوں کے ادبی رجحان نے انفرادیت اور انفرادی آزادی کی بحالی کے نام پر ادب سے مکمل جمہوری کردار کا ہی صفایا کر دیا اور اس کے بنیاد گزاروں نے اردو ادب میں وہ دھول اڑائی کہ پورا ادبی منظر نامہ ہی مبہم و مشکوک اور ترسیل کی ناکامی کا المیہ بن کر رہ گیا۔ پھر اس کے بعد جو ادبی تھیوری سامنے آئی اس نے خوش کن نعروں سے ادبی محلّوں کو گلزار کرنا چاہا لیکن اس کے علَم بَرداروں کا المیہ یہ ہے کہ ادب کو سب سے بڑی جمہوریت تسلیم کرنے کے باوجود اردو کے بیشتر لسانی اور ادبی اداروں پر کنڈلی مار کر بیٹھ گئے۔ آخر اردو ادب میں جمہوری اقدار کی بازیابی کس طرح ممکن ہے؟ اور اس کے طریقے کیا ہوں گے؟ اس ضمن میں متعدد سوالات اور امکانات کو زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔'' اداریہ پڑھ کر سنانے کے بعد نسیم انجم نے وضاحت کی کہ یہ اداریہ پٹنہ سے شائع ہونے والے سہ ماہی کتابی سلسلہ ''آمد'' کے شمارہ نمبر پانچ میں شائع ہوا ہے جس کی ادارت عظیمہ فردوسی اور خورشید اکبر کے ذمّے ہے۔ اس رسالے کے اداریے ہمیشہ فکر انگیز اور پُر مغز ہوتے ہیں۔ صبا اکرام نے کہا کہ خورشید اکبر شاعر ہیں اور شعر و ادب کے علاوہ سماجی علوم پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ زیر بحث اداریہ اس کا ایک واضح ثبوت ہے۔ یاور امان نے کہا کہ ''آمد'' کے تازہ شمارے میں اداریے کے علاوہ وہاب اشرفی اور ابن صفی کے لیے مختص گوشے، مسلم تہذیب سے متعلق ڈاکٹر انور معظم کا مضمون، ناول کے حوالے سے مصطفیٰ کریم اور رحمٰن عباس کے مضامین، شفیق فاطمہ شعریٰ پر مضمون اور ان کے کلام کا انتخاب بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔ دیگر قلم کاروں میں جمال اویسی، قمر رئیس، مجنوں گورکھپوری، ابوالخیر کشفی، جیلانی بانو، نور الہدیٰ شاہ، مصحف اقبال توصیفی، شاہد احمد شعیب اور صفدر امام قادری کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اے خیام نے کہا کہ ادبی رسالہ نکالنا سب سے آسان اور سب سے مشکل کام ہے۔ معیاری جریدے کے لیے ایک صاحب نظر مدیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ''آمد'' کے پانچ شماروں نے ثابت کیا ہے کہ خورشید اکبر ایک صاحب مطالعہ اور صاحب نظر مدیر ہیں۔ ڈاکٹر محمد رضا کاظمی نے صدارتی کلمات میں کہا کہ اس وقت بہت سے ادبی رسالے نکل رہے ہیں۔ ان میں کچھ اچھے اور معیاری رسائل بھی ہیں مگر ''آمد'' کو ایک امتیاز حاصل ہے۔ یہ امتیاز اس کے مدیر کی صلاحیت اور محنت کا نتیجہ ہے۔ ''آمد'' کے پانچویں شمارے کا اداریہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس موضوع پر دوسرے اہل قلم اور دانشوروں کو بھی اظہار خیال کرنا چاہیے۔

[بہ شکریہ : 'اخبارِ جہاں' [پاکستان] بابت : ۱۷ تا ۲۳ دسمبر ۲۰۱۲ء]

کتاب گیلری

'آمد۔۵ : پٹنہ سے طلوع ہونے والا ادبی جریدہ

● محمد حامد سراج

[پاکستان]

سرزمینِ ہند پٹنہ سے خورشید اکبر کی ادارت میں سہ ماہی ادبی جریدہ ''آمد'' اکتوبر تا دسمبر 2011 میں منصہ شہود پر آیا۔ پہلے شمارے نے ہی مشاہیر ادب اور تنقید و تحقیق کے نامور اساتذہ سے اپنا آپ منوا لیا اور جریدے کو سنجیدہ، وقیع، علمی اور متین ادبی کاوش قرار دیا گیا۔ اکتوبر تا دسمبر 2012 کے تازہ شمارہ ''آمد 5'' تک اس جریدے نے اپنی علمی وقعت، ادبی شفافیت، سنجیدہ تحقیقی مضامین، افسانہ، نظم، غزل اور دیگر اصناف سخن کے تنوع اور معیار سے اپنا نام اردو ادب کی جریدیاتی دنیا میں مہر بند کرا لیا۔ سب سے اہم بات کہ دنیا کے کسی بھی کونے سے کوئی صاحب ثروت ادیب اسے خرید کر اپنی شہرت اور ''مردہ گوشہ'' کے لیے استعمال نہیں کر سکا۔ اس حوالے سے مدیر کے قد کو سلام ہمارا فرض بنتا ہے۔ تازہ شمارہ کے شہرِ مدعا میں خورشید اکبر نے جو اداریہ قلم بند کیا ہے اس میں ''ادب کی جمہوریت؟'' پر سوال اٹھایا ہے۔ ان کا کہنا ہے'' لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی ادب کی اپنی کوئی جمہوریت بھی ہوتی ہے؟ اس کا جواب مثبت اور منفی دونوں صورتوں میں دیا جا سکتا ہے۔ اور دنیا کے ادب سے اس کی متعدد مثالیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ مگر اس ضمن میں ہمارے ادب کی صورت حال زیادہ پیچیدہ اور دگر دوں ہے کیوں کہ ہم جس سیاسی نظام کے پروردہ ہیں اس نے مغرب سے جمہوریت کا نیا ماڈل تو ادھار لے لیا لیکن اسے اپنی ثقافتی ضرورتوں کے عین موافق ڈھالنے کی زحمت ذرا کم ہی اٹھائی۔ یہ الگ بات کہ ہمارے ادب میں جمہور (عوام) اور اس کے ہمہ جہت مسائل و بحران کا ذکر تو خوب خوب ملتا ہے، پر اس کے برعکس جمہور (عوام) کو ادبی معاملات اور کارگزاریوں سے ایک معقول اور طے شدہ فاصلے پر رکھا گیا ہے۔ کہ وہ ہمارے ادبی فیصلوں میں دخیل و مخل نہیں ہو سکتے، جو کسی حد تک ہماری اشرافیہ ذہنیت اور افضلیت اساس نقطۂ نظر کا نتیجہ اور جمہوریت دشمنی کا

مظہر نہیں تو اور کیا ہے؟ اداریے میں دس سوالات اٹھائے گئے ہیں جن پر ارباب نقد و نظر اور قارئین کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی ہے۔

جریدہ ''آمد'' میں سولہ شہروں کی ریاست بسائی گئی ہے۔ شہرِ مدعا' شہرِ ثقافت' شہرِ علم و آگہی' شہرِ نقد و نظر' شہرِ تحقیق' شہرِ غزل' شہرِ اعتراف' شہرِ نایاب' شہرِ افسانہ' شہرِ اشتراک' شہرِ ملال' شہرِ آہنگ' شہرِ آئینہ' شہرِ آمد' شہرِ خیر و خبر' شہرِ رفاقت۔

شہرِ ثقافت میں مسلم تہذیب پر تجزیاتی مضمون انور معظم کا بہ عنوان ''مسلم تہذیب میں حکمت بہ طور ماخذِ علم'' موجود ہے جو اپنی نوع پر دال ہے شہرِ علم و آگہی میں مولانا ابوالکلام آزاد پر شافع قدوائی کا خاص مضمون بہ عنوان ''مولانا آزاد: انسان دوستی' روشن خیالی اور دانش وری کا نقطۂ عروج'' ایک ایسا جامع اور وقیع مضمون ہے جو الہلال کی گرد آلود فائلوں میں سے عرق ریزی سے کشید کیا گیا ہے۔ ایک ایسی عمدہ تحریری دستاویز جس سے امت مسلمہ آج بھی رہنمائی لے سکتی ہے۔ شافع قدوائی کی محنت قابلِ تحسین ہے۔ جس میں انہوں نے ایک دانش ور سقہ عالمِ دین مولانا ابوالکلام آزاد کی روشن خیالی اور دانش وری کو ان کی اپنی تحریروں کے آئینے سے مزین کیا ہے۔ شہرِ نقد و نظر میں تنقیدی مضامین ہیں۔ مصطفٰی کریم کا ''عظیم ناول کی شناخت'' اور رحمٰن عباس کا ''ناول کا فن اور اردو ناول کی تنقید کا المیہ''! مصطفٰی کریم کا کہنا ہے کہ محبت کسی بھی نوعیت کی ہو اگر اس میں گہرائی نہیں ہے تو پھر اس کا اثر بھی نہیں ہوتا اور بغیر تاثر کے ناول عظیم تو کیا اوسط درجے کا بھی نہیں ہوتا۔ دوسری جنگ عظیم اور 1947 کے ہولناک فسادات کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ قرۃ العین حیدر کا ناول ''آگ کا دریا'' ہندستان کی تقسیم کے نتیجے میں عظیم ناول بن کر قاری کے سامنے آیا۔ انہوں نے روسی ناول نگاروں کی تخلیقات کے حوالوں سے اپنی تحریر کو حسن بخشا ہے۔ رحمٰن عباس کا مضمون ''ناول کا فن اور اردو ناول کی تنقید کا المیہ'' ! ایک علمی تحقیقی تجزیاتی مضمون ہے۔ جس میں ان کا کہنا ہے۔ ''ناول کو پڑھنے والا معاشرہ روشن خیال' تخلیقی اور تجرباتی توانائی سے سرشار' قوت برداشت اور قوت افکار کا حامل ہوتا ہے۔ ہر ناول ایک نئی دنیا ہوتی ہے۔ یہ نیا تخلیقی تجربہ ہوتا ہے۔ ان دیکھے جہانِ دیگر کی سیر ہوتی ہے۔ ہر ناول ایک ایسا تجربہ' احساس یا حقیقت ہوتی ہے جو سابقہ ناولوں سے کلی طور پر مختلف ہوتی ہے۔ ناول آدمی کی تاریخ اور ذہنی ارتقاء کا صرف مشاہدہ ہی نہیں بل کہ اجتہاد اور انصرام بھی کرتا ہے''۔ شہرِ تحقیق میں ''سودا شناسی کے حوالے سے عبدالسمیع کا عمدہ مضمون بہ عنوان ''رشید حسن خان کا ایک دیباچہ'' موجود ہے۔ شہرِ غزل میں بشیر نواز' ظفر گورکھپوری' غلام مرتضی راہی' احمد سوز' مشتاق جاوید' شمیم قاسمی اور رئیس الدین رئیس کی غزلوں کے ساتھ جمال اویسی کی دس خاص غزلیں شامل ہیں۔ ہم عصر غزلوں میں شعیب نظام' غضنفر' خالد جمال' احتشام اختر' سعید روشن' مناظر حسن شاہین' واحد نظیر' اصغر ندیم نظامی اور 'سوغات غزلیں' کے تحت پاکستان سے رومانہ رومی کی غزل شامل ہے۔

شہرِ اعتراف اور شہرِ نایاب جریدہ ''آمد'' کا اختصاص ہیں۔ بل کہ جریدے میں ریڑھ کی ہڈی کی

حیثیت رکھتے ہیں۔ شہر اعتراف ''وہاب اشرفی'' کا تعزیتی گوشہ ہے جس میں چھ مضامین ہیں۔ قمر رئیس کا ''وہاب اشرفی کی تلاش میں''، محمود ہاشمی کا 'شاخ تازہ تر مانند' صفدر امام قادری کا ''وہاب اشرفی شخصی حوالہ'' اس کے ساتھ ہمایوں اشرف نے وہاب اشرفی کے افسانوں کی تلاش و تدوین کے حوالے سے ''وہاب اشرفی بہ حیثیت افسانہ نگار'' بہت شاندار مضمون لکھا ہے۔ وہاب اشرفی کے بہ قول ان کے کل بیالیس افسانے شائع ہوئے لیکن کب اور کہاں یہ انہیں قطعی طور پر یاد نہیں۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف کا کہنا ہے'' یہ مختصر سا جائزہ افسانہ نگار وہاب اشرفی کے فکر و فن کی کلی وضاحت نہیں کرتا' نہ ہی وہ تحقیقی مقالہ جس پر محمد امجد حیات برق کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی ہے نہ ہی ڈاکٹر احمد حسین آزاد ڈاکٹر مناظر حسن اور سید علی عباس کے وہ مقالات جن میں ان کی افسانہ نگاری سے بحث کی گئی ہے'ضرورت اس بات کی ہے کہ موصوف کے افسانوں کا کما حقہ جائزہ لیا جائے اور تمام تکنیکی اور فنی صورتوں کا سامنے لایا جائے'' سرور حسین نے اپنے مضمون'' وہاب اشرفی کا تہذیبی و سماجی نظریہ'' کا عنوان باندھ کر بجا طور پر کہا کہ'' وہاب اشرفی کی تنقید نگاری شعر و ادب کے حوالے سے ان کے فکری ابعاد کے کئی پہلوؤں کو روشن کرتی ہے''۔ جب کہ قطعہ تاریخ وفات واحد نظیر نے منظوم رقم کیا ہے۔ شہر نایاب میں ابن صفی کے خصوصی گوشہ پر مشتمل ہے۔ اردو زبان و ادب میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کا اردو ادب میں مقام اور ان کی ادبی حیثیت پر ان دنوں بحث کا سلسلہ سنجیدگی سے زیر بحث ہے۔'' آمد'' کا گوشہ ابن صفی اس لحاظ سے fruitful' قابل توجہ اور عرق ریزی سے قاری کے مطالعے کا متقاضی ہے کہ اس میں پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے'' اردو میں جاسوسی افسانہ'' کے عنوان سے سنجیدہ علمی مقالہ قلم بند کیا ہے۔ ابوالخیر کشفی نے'' کچھ ابن صفی کے بارے میں'' اپنی یادوں کی زنبیل سے گوہر نایاب چن کر مضمون میں روح ڈال دی ہے۔ ان کا کہنا ہے' ابن صفی کی زبان و بیان کی طرف تو اشارہ کر ہی چکا ہوں۔ ابن صفی کے ہاں اختصار ہے۔ ان کے مکالموں میں برجستگی اور ظرافت ہے۔ یہ ظرافت کہیں زبان کی ہے کہیں خیال کی اور کہیں صورت حال کی۔ اگر ان کے ناولوں کے ایسے ٹکڑوں کا انتخاب شائع کر دیا جائے جن میں زبان و بیان کے محاسن بہت نمایاں ہیں تو ابن صفی کے ادبی مرتبے کو تسلیم کروانے کی طرف یہ ایک اہم قدم ہوگا'' ابن صفی کا Autobiographical article بہ عنوان'' میں نے لکھنا کیسے شروع کیا' معلومات افزا ہے۔ ان کا کہنا ہے

''میں سوچتا رہا۔۔۔ سوچتا رہا۔ آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی میں جب تک قانون کے احترام کا سلیقہ پیدا نہیں ہوگا یہی سب کچھ ہوتا رہے گا۔ میرا یہ مشن ہے کہ آدمی قانون کا احترام سیکھے۔ جاسوسی ناول کی راہ میں نے اسی لیے منتخب کی تھی۔ تھکے ہارے ذہنوں کے لیے تفریح مہیا کرتا ہوں اور انہیں قانون کا احترام بھی سکھاتا ہوں۔ فریدی میرا آئیڈیل ہے جو خود بھی قانون کا احترام کرتا ہے اور دوسروں سے قانون کا احترام کرانے کے لیے اپنی زندگی تک داؤ پر لگا دیتا ہے''

احمد صفی نے اپنے والد پر جو یادداشتیں قلم بند کی ہیں ان کا عنوان ہے'' ابن صفی' اسرار ناروی اور میرے

ابو'' جاسوسی ناولوں کے ساتھ ساتھ اس میں ابن صفی کی شاعری کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ جو ابن صفی نے اسرار ناروی کے نام سے کی۔ نمونہ کلام کے طور پر ان کے اشعار کا اندراج بھی ہے۔ ایک شعر ابن صفی کے عشاق کے نام

دل فسردہ ہی سہی چہرے پہ تابانی ہو ❖ ورنہ خودداری احساس پہ حرف آتا ہے

ابن صفی نے اپنا کلام ''متاع قلب ونظر'' کے نام سے ترتیب دیا تھا۔ احمد صفی کا کہنا ہے کہ محبین ابن صفی بہت جلد ان کے کلام کے حوالے سے خوش خبری سنیں گے۔ کراچی سے راشد اشرف صاحب نے ''ابن صفی: شہرت اب سرحدوں کے پار'' لکھ کر موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ کثیر المطالعاتی شخصیت راشد اشرف نے دہلی میں ابن صفی کی جاسوسی دنیا کے چار ناولز کے انگریزی تراجم کی تقریب جس میں احمد صفی نے شرکت کی کا تفصیلی حال لکھا ہے۔ ان ناولز کا ترجمہ دنیائے ادب کے نام ور ادیب' شاعر' تنقید نگار' افسانہ نگار' ناول نگار شمس الرحمٰن فاروقی نے کیا ہے۔ ڈاکٹر ڈریڈ نامی چار کتب کے اس سلسلے میں زہریلے تیر' پانی کا دھواں' لاش کا قہقہہ' اور ڈاکٹر ڈریڈ نامی ناولز شامل ہیں۔ انگریزی میں ان کے تراجم کے یہ نام ہین ۔ Smoke Water , poisioned Arrow , Doctor Dread ,and The Laughing Corpse . ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے ابن صفی کے جاسوسی ناولوں میں سے ان کے طنز ومزاح کے پہلو کو لیا ہے۔ ''ابن صفی کے جاسوسی ناولوں میں طنز ومزاح'' سے بہت عمدہ picture پینٹ کی ہے۔ جب کہ لئیق رضوی نے ''ابن صفی کے ولین'' کے عنوان سے ان کے ناولوں کے منفی کرداروں کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔ خان احمد فاروق نے ابن صفی کے ایک شعر

ڈوب جائے گا کسی روز جو خورشید اَنا ❖ مجھ کو دہراؤ گے محفل میں مثالوں کی طرح

سے یہ عنوان ''مجھ کو دہراؤ گے محفل میں مثالوں کی طرح'' جیسا مضمون تراش کر جو Dimension دی ہے اس میں ابن صفی کی نجی زندگی اور خاندانی پس منظر کو اجاگر کیا ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کی مکمل فہرست مرتب کی ہے۔ اور ان کی تعداد 251 شمار کی ہے۔ شہرِ افسانہ میں چار افسانے شامل ہیں۔ جیلانی بانو کا ''گوشت کی دکان'' حسن جمال کا ''نادیدہ یلغار'' ناچیز (محمد حامد سراج) کا ''ہوٹل'' اور طاہرہ اقبال کا شپلا کے پھول'' ! اداریے میں مدیر نے تخلیق اور تخلیق کاروں کی عزت افزائی کرتے ہوئے تعارف میں لکھا ہے۔ ''شہرِ افسانہ میں جیلانی بانو کا افسانہ ''گوشت کی دکان' بڑی سادگی اور پرکاری سے موجودہ سیاسی نظام کی سفا کی کو بے نقاب کرتا ہے۔ یہ افسانہ انھوں نے خاص طور پر' آمد' کے لیے لکھا۔ جو ہمارے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ حسن جمال نے مذہب کے نام پر روا رکھی جانے والی بے اعتدالیوں اور دہشت ناکیوں کو اپنے پڑوسی ملک کے پس منظر میں بڑی بے باکی سے بیان کیا ہے اور Homo-Sexuallity کے مسئلے پر رونگٹے کھڑے کر دینے والا اثر انگیز افسانہ تحریر کیا ہے۔ محمد حامد سراج نے ہمارے معاشرے میں بزرگوں کے تئیں برتی جانے والی بے توجہی اور جنریشن گیپ کی بے معنویت کی گرہ کشائی بھی کی ہے۔ طاہرہ اقبال کا افسانہ Cross-Cultural Identity crisi اور شین قاف'' والے اشرافیہ رویّے کے کھوکھلے پن کو ظاہر کرتا ہے۔''

شہر اشتراک میں سندھی ادب سے نور الہدیٰ شاہ کا کاٹ دار عمدہ افسانہ ''باسی گوشت'' جسے شاہد حنائی نے قرینے سے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ شہر ملال میں شفیق فاطمہ شعریٰ کے نام ہے جس میں مرحومہ پر ڈاکٹر ذکیہ عابد نے اپنے تاثرات ''شفیق فاطمہ شعریٰ، چند یادیں'' کے عنوان سے سمیٹ کر ترتیب دیے ہیں۔ گوشے میں شفیق فاطمہ شعریٰ کے مجموعہ کلام ''گلہ صفورہ سے چھ منتخب نظمیں بھی شامل ہیں۔ شہر آہنگ میں جو نظمیں ہیں۔ پیش رو نظموں کے عنوان کے تحت مصحف اقبال توصیفی' شاہد عزیز' رئیس احمد رئیس اور شعیب نظام کی غزلوں کے ساتھ جمال اویسی کی دس خاص نظمیں اور سوغات نظموں میں دوحہ قطر سے عزیز نبیل کی نظمیں شامل ہیں۔ شہر آئینہ میں کتابوں پر تبصرے شامل ہیں۔ صفدر امام قادری نے ناوک حمزہ پوری کی ''استاد شاعر کی نقادی' اور بہار کی ادبی تاریخ نویسی اور مظفر اقبال کی تحقیق'' پر وقیع تبصرہ ہے۔ جب کہ اظہار خضر نے شکیب ایاز کے شعری مجموعہ ''بشارت'' اور شکیل الرحمٰن کی جمالیاتی تنقید'' بارہ ماسے کی جمالیات'' پر تبصرہ اور تخلیق کی کتاب کشائی کا حق ادا کر دیا ہے۔ شہر آمد میں تعلق خاص کے تحت پدم شری قاضی عبد الستار کا ذاتی خط خورشید اکبر کے نام ہے۔ عبد المنان طرازی نے ''آمد'' پر بہت ہی عمدہ اور دل پذیر انداز میں منظوم تبصرہ کیا ہے۔ نسیم انصاری نے تہنیتی نظم ''تمہیں آمد مبارک'' لکھ کر اپنے جذبات کو زبان دی ہے۔ شہر خیر و خبر میں آمد کے مشمولات پر موصول ہونے والے مکاتیب شامل ہیں۔ شہر رفاقت میں مصنفین کے پتے موبائل نمبرز اور ای میلز درج کئے گیے ہیں۔

اتنے عمدہ ادبی جریدے کی قیمت صرف 125 روپے' صفحات 320 اور ملنے کا پتہ درج ذیل ہے۔

خورشید اکبر' آرزو منزل' شیش محل کالونی' عالم گنج' پٹنہ 800007 انڈیا۔

Email : khursheidakbar@gmail.com

and Cell no . 0091-9631629952 ہے۔

........❀☆❀........

التماس

ادبا اور شعرا سے مخلصانہ التماس ہے کہ اپنی نگارشات اردو اِن پیج (InPage) میں کمپوز کر کے درج ذیل ای۔میل آئی۔ڈی پر بھیجنے کی زحمت گوارہ فرمائیں۔ ساتھ ہی تخلیقات/مضامین کی ہارڈ کاپی (پرنٹ آوٹ) ڈاک سے 'آمد' کے پتے پر ارسال کریں۔

e-mail: khursheidakbar@gmail.com

Address : Arzoo Manzil, Sheesh Mahal Colony,

Alamganj, Patna-800007 (Bihar) India

Mob.: 09631629952 / 07677266932

ممکناتِ آمد

● پروفیسر عبدالمنان طرزی

سہ ماہی، گراں قدر و قیمت ہے 'آمدؔ' — نظریاتِ نَو کی علامت ہے 'آمدؔ'

روایت اسیروں میں شعروادب کے — بلاشبہ آثارِ صحت ہے آمد

بصیرت نمائی خورشید اکبر — سیہ شب کی صبحِ سعادت ہے آمد

روایت پرستوں نے بدلی ہے منزل — نقیبِ خیابانِ جدّت ہے آمد

تہی دامنی کا گِلہ مٹ گیا ہے — صحافت کی بے مثل دولت ہے آمد

ادب میں شعورِ حیات آفریں کی — دلائل، براہین و حجت ہے آمد

وہ گردش ادب میں ہے زندہ لہو کی — رگِ جاں میں جس سے حرارت ہے آمد

چلے آیئے آپ اِس مکتبے میں — بفضلِ خدا درسِ حکمت ہے آمد

ہیں کچھ اس لیے قاری دلدادہ اس کے — کہ اک طرزِ نَو کی بشارت ہے آمد

نئی لہر سے آشنا جو نظر ہے — اُسی اک رَوِش کی صراحت ہے آمد

یہ مظہر ہے خورشید کی آگہی کا — کہ اوراقِ رمزِ ذہانت ہے آمد

عظیمہ نے بخشی وہ زیبائی اِس کو — کہ لفظ و معانی کی جنّت ہے آمد

ہر اک رند میخانہ بر دوش خود ہے — کہ ساقی کو اب اِذنِ رخصت ہے آمد

جو بیزار طرزِ کہن سے ہوئے ہیں — ادب میں اُنھی کی وراثت ہے آمد

کوئی کھوٹا سکّہ نہیں اب چلے گا — زبورِ ادب کی فصاحت ہے آمد

ہوا ختم اب دَور بازی گری کا — مجورے کو بھی حکمِ رخصت ہے آمد

ہے شہرِ صحافت کا مینارۂ نور
سراسر مٹا دے جو ظلمت، ہے آمد

● تبصرے کے لیے کتاب کی دو جلدیں بھیجنا لازمی ہیں۔ منتخب تصنیفات پر ہی تبصرے شائع ہوں گے۔

[ادارہ]

(۱)

پیروڈی کا فن: امتیاز وحید

● صفدر امام قادری

یہ بات بالعموم بزرگوں کی طرف سے کہی جاتی ہے کہ آج کی تازہ کار نسل علمی کاموں میں جی نہیں لگاتی۔ تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کے امور میں تو کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ نسلِ نو کے طفیل یہاں جہالت کی فصل لہلہا رہی ہے۔ یہ بات اگر غلط نہیں ہو، تب بھی اس سوال کا جواب بزرگوں کو ہی دینا ہے کہ نئی نسل کی تربیت اور علم کے بیش بہا خزینوں سے انھیں مستحکم کرنے کی ذمّے داری آخر کس کی تھی؟ تعلیمی جماعتوں میں انھیں کس نے پڑھایا، ان کے تحقیقی مقالے کس کی نگرانی میں لکھے گئے اور انھیں یونی ورسٹیوں میں پڑھانے کے لیے کن لوگوں نے منتخب کیا؟ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ علم کے ساتھ جہل کا کاروبار ہر دور میں قائم رہا ہے۔ یہ امتیاز کوئی نسلِ نو سے ہی مخصوص نہیں ہے۔ ہمارے بزرگوں میں جہاں علم و ادب کے آفتاب و ماہتاب کی کہکشاں ایک سجی ہوئی ہے، وہیں ایسے بزرگوں کی ایک بے کراں فہرست موجود ہے، جنھوں نے اپنے اساتذہ سے تو کچھ نہیں ہی سیکھا، نہ وہ اپنے شاگردوں تک اپنے علم (؟) کی روشنی بکھیر سکے۔ ایسے اساتذہ جب کسی سے می نار میں مقالہ پڑھتے ہیں تو ان کے شاگرد منہہ چھپائے پھرتے ہیں اور زبان اور تلفظ کی غلطیوں پر مجمع ششدر رہتا ہے۔ نئے لکھنے والوں میں بھی بلاشبہ ایسے افراد کی کمی نہیں۔ اور ایسا کیوں نہ ہو کیوں کہ ان کے بعض اساتذہ بھی کچھ کم نہ تھے۔ جوانوں کو اگر اپنی جہالت کا پتا چل جائے یا اپنے نااہل اساتذہ سے چھٹکارا مل جائے یا کوئی صحیح راہ برمیسر آجائے تو پھر ان کی علمی زندگی پٹری پر لوٹ آئے گی لیکن ہمارے بزرگوں کو راہِ راست پر کون لائے گا؟

اس حقیقت کے متوازی ایک دوسری صورتِ حال سامنے ہے۔اس سچائی سے کیسے انکار کیا جائے کہ تیس چالیس برس کے بعض نوجوان اپنی تصنیفی خدمات کی وجہ سے حیرت انگیز طور پر ہمیں متاثر کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔اس وقت یہ بات اور بھی قابلِ استعجاب ہوتی ہے جب ایسے بچوں کے مقالاتِ امتحانیہ برائے ایم۔فل اور پی ایچ۔ڈی میں تنقید و تحقیق کے چمکتے ہوئے ہیرے برآمد ہوتے ہیں۔ڈاکٹر امتیاز وحید کی تازہ کتاب 'پیروڈی کا فن' سامنے آئی تو جی خوش ہوگیا جیسے نوجوان نے اس کتاب میں اپنی جان انڈیل کر رکھ دی ہو۔تحقیق، تنقید اور تجزیہ ہر پہلو سے یہ کتاب اپنے موضوع پر دقتِ نظری اور گرفتِ کلی کا کھلا ثبوت ہے۔بہار کے دور افتادہ علاقے سے نکل کر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، نئی دہلی میں صیقل ہوتے ہوئے امتیاز وحید نے اپنی کتاب سے نئے ریسرچ اسکالرس کا علمی بھرم قایم کیا ہے اور اپنے اساتذہ کے علم و فضل سے خود کو سینچ کر ایک مقالہء امتحانیہ کا اس زمانے کے اعتبار سے معیار قایم کیا ہے۔اس کے لیے امتیاز وحید اور ان کے لائق اساتذہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

طنز و ظرافت کے شعبے میں اردو کی حد تک صفِ اوّل کے لکھنے والوں کی کمی نہیں رہی۔اس سے لطف اٹھانے والے عوام و خواص کی تعداد بھی کبھی کم نہ ہوئی۔لیکن تحقیق و تنقید کے حلقے میں اہلِ ظرافت پر توجہ ذرا کم ہی رہی ہے جس سے یہ غلط فہمی بھی پیدا ہوتی رہی کہ کیا طنز و ظرافت کو ہمارے نقاد صفِ دوم کا ادب مانتے ہیں؟ ادبی سچائی بھلے ایسی نہ ہو لیکن موجودہ صورتِ حال ایسی ہی ہے۔اس عالم میں طنز و مزاح کے ایک خاص شعبے 'پیروڈی' کی طرف کون توجہ کرنے والا ہے۔اردو ادب کی پوری تاریخ کھنگال جائیے، رسالہ 'اسکالر' علی گڑھ کا پیروڈی نمبر (1957ء، مدیر: احمد جمال پاشا) اور مظہر احمد کی مرتبہ کتاب پیروڈی (2004ء) کے علاوہ چند متفرق مضامین بھی مشکل سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔اس فن سے متعلق امتیاز وحید نے 380 صفحات پر مشتمل کتاب تیار کر کے واقعتاً ریگستان میں ایک شجرِ سایہ دار اُگا یا ہے۔اس کتاب کے مواد کی حصولیابی میں تنِ ناتواں (محقق) پر کیا گزری ہوگی؛ کتاب کی سرسری ورق گردانی سے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

امتیاز وحید کے اس تحقیقی سرمائے میں دوسرے مقالہ جات کی طرح رسمی اور غیر ضروری ابواب کی شمولیت سے گریز کیا گیا ہے۔تحقیقی مقالوں کا ''پیٹ بھرنے'' کے لیے اکثر لاتعلق ابواب کو مقالے کا حصہ بنا دیا جاتا ہے۔امتیاز وحید نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔'پیروڈی' لفظ کی تعریف و توصیف اور اردو میں اس کی روایت کی نشاندہی کرتے ہوئے گفتگو کو اس قدر طول نہیں دیا گیا ہے جس سے بعد کے ابواب میں دہراو کی صورت پیدا ہو جائے۔پیروڈی کے صنفی نام کے تعلق سے امتیاز وحید کی بحث تقریباً تمام ادبی و لسانی پہلوؤں کا احاطہ کر کے مکمل ہوئی ہے۔اس بات سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے معاملات سے حسبِ ضرورت فائدہ اٹھا سکتا ہے۔پیروڈی کے دائرۂ کار کو متعین کرتے ہوئے تقریباً تمام ضروری ماخذات سے استفادہ کیا گیا ہے۔محض ۲۵ رصفحات میں مصنف نے مبادیات سے متعلق تمام کام کی باتوں کو جمع کر دیا ہے۔یہاں اردو کے

دیگر نقاد اور ظرافت نگاروں کے خیالات سے بھی اغماض نہیں برتا گیا ہے بلکہ تمام نقاطِ نظر کو سامنے رکھ کر گفتگو کو انجام تک پہنچایا گیا ہے۔

پیروڈی کی روایت کا جائزہ لیتے ہوئے تاریخی طور پر مصنف نے خود کو چاق و چوبند رکھا ہے۔ ایک مختصر تمہید کے بعد جعفر زٹلی سے تذکرہ شروع کیا گیا ہے۔ 'اودھ پنچ' کے مصنفین، اکبرالہ آبادی اور بیسویں صدی کے مشہور اور غیر معروف پیروڈی نگاروں کا نہایت اختصار کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ نثری پیروڈی کا نقطۂ آغاز پطرس بخاری کو بنایا گیا ہے۔ لیکن مصنف کے ذہن میں یہ بات محفوظ ہے کہ 'اودھ پنچ' کے دور میں بھی پیروڈی کے آثار موجود تھے، اس لیے انھوں نے اس دور کی پیروڈی کی نشانیاں فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ شوکت تھانوی، کنھیا لال کپور، احمد جمال پاشا اور ظفر کمالی کی چند نثری تحریروں کا تذکرہ کر کے مصنف نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو پیروڈی کی گم شدہ کڑیوں کو وہ کامیابی کے ساتھ جوڑ سکتے ہیں۔ امتیاز وحید نے ایک کام یہ کیا کہ پیروڈی کی تاریخ اور روایت پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے بیان کو زیادہ پھیلنے نہیں دیا کیوں کہ آئندہ باب نمائندہ پیروڈی نگاروں کے لیے مخصوص تھا۔ روایت کے باب میں وضاحت آنے سے دہراو قایم ہونا ناگزیر تھا۔ یہ کسی بھی اچھے تحقیقی مقالے کی خوبی کہی جائے گی کہ لکھنے والے کو ہر باب کا دائرۂ کار معلوم ہے اور وہ اس لکشمن ریکھا کو پار نہیں کرتا ہے۔

مصنف نے نثر و نظم دونوں شعبوں میں پیروڈی نگاری کے انفرادی جائزے کے ضمن میں بارہ اہم افراد کو منتخب کیا ہے۔ سید محمد جعفری، شہباز امروہوی، رضا نقوی واہی، راجہ مہدی علی خاں، مجید لاہوری، شیخ نذیر، اسرار جامعی، صادق مولی، کنھیا لال کپور، فرقت کاکوروی، ڈاکٹر شفیق الرحمان، احمد جمال پاشا جیسے اہم پیروڈی نگاروں کے نمائندہ کارناموں کو تقریباً ایک سو دس صفحات میں مرکزِ توجہ بنایا گیا ہے۔ نثر کے حوالے سے صرف شفیق الرحمان اور احمد جمال پاشا کی شمولیت یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ پیروڈی کا فن جس طرح شاعری میں قبولِ عام کا درجہ حاصل کر چکا ہے، وہ صورتِ حال نثر میں نہیں ہے۔ نمائندہ پیروڈی نگاروں پر گفتگو کرتے ہوئے مصنف نے یہ کوشش کی ہے کہ ان کی اہم نگارشات کا تنقیدی جائزہ لے لیا جائے اور مجموعی طور پر پیروڈی نگار کی حیثیت سے ان کا مقام و مرتبہ متعین کر دیا جائے۔ محض چند صفحات میں کسی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے مجموعی کاموں پر حکم لگانا مشکل ہے لیکن امتیاز وحید نے اس کام میں اپنی سلیقہ مندی ثابت کر دی ہے۔ ہر جائزے میں نمائندہ تحریر وں کو مثال کے طور پر استعمال کر کے مصنف نے عملی تنقید کے نمونے بھی فراہم کیے ہیں جس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ دورانِ تنقید انھیں دوسرے نقادوں کی طرح ادبی نمونوں سے کوئی گریز نہیں۔ اس طرح قاری کو یہ سہولت بھی میسر آتی ہے کہ یہ تنقید دلائل اور شواہد کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے۔ نسلِ نو میں یہ علمی احتیاط غنیمت ہے۔

امتیاز وحید نے اس کتاب میں اردو کی منظوم اور نثری پیروڈیوں کی تفصیل پیش کرتے ہوئے اپنے طور پر پچیس نمائندہ پیروڈیوں کا بھی انتخاب کیا ہے۔ یہاں نثر نگاروں کو زیادہ نمائندگی دی گئی ہے۔ یہ تمام پیروڈیاں شہ کار کا درجہ رکھتی ہیں۔ کسی مبصر کے لیے یہ بات شاید حیلہ و حجت کے لئے موزوں ہو جائے کہ سید محمد جعفری کی فلاں

تحریر ضرور شامل ہونی چاہیے یا رضا نقوی واہی کی کوئی دوسری نظم اس سے زیادہ نمائندہ ہوسکتی تھی۔ لیکن جب اس انتخاب کو سلسلے سے پڑھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انتخاب کے مرحلے میں امتیاز وحید نے اس تخلیق کار کے ساتھ ساتھ اپنے انتخاب کے سلسلہء خیال کو بھی خاطر میں رکھا ہے۔ کنھیا لال کپور، احمد جمال پاشا اور ظفر کمالی کی دو دو تخلیقات کا انتخاب میں شامل ہونا یہ اشارہ کرتا ہے کہ ان اصحاب نے پیروڈی کو اپناتے وقت زیادہ انہماک اور سرگرمی دکھائی۔ انتخاب پیش کرتے ہوئے مصنف نے نثر نگاروں کے ساتھ یہ بے انصافی قایم کردی کہ کتاب کی ضخامت نہ بڑھے، بھلے اردو کی شہ کار نثری پیروڈیاں اپنے مکمل وجود کے ساتھ اس کتاب کے قارئین کے سامنے آنے سے رہ جائیں۔ یہ درست کہ شاعری کی طرح اصل تخلیق اور اس کی پیروڈی کی پیش کش جتنا آسان ہے، اسی طرح نثری پیروڈیوں میں اصل اور اس کی پیروڈی کو ایک دوسرے کے مقابلے پیش کرنے کی گنجائش زیادہ نہیں ہے۔ شاید اسی لیے امتیاز وحید نے نثری پیروڈیوں کا انتخاب اپنے ضمیمے میں شامل نہیں کیا۔

تمام پچیس منتخبہ پیروڈیوں پر امتیاز وحید نے جو تنقیدی تجزیے اپنی کتاب میں شامل کیے ہیں، ان سے ان کے ناقدانہ شعور کو سمجھنا مشکل نہیں۔ ہر تخلیق سے اس کے خاص معنیٰ بر آمد کرنا اور تحلیل و تجزیہ کرکے امتیازات روشن کرنا سرسری کام نہیں تھا۔ امتیاز وحید نے متن کو گہرائی سے دیکھا اور ہر مصنف کے فنی پہلوؤں کی بہ حسن و خوبی جانچ پرکھ کی ہے۔ شعری پیروڈیوں میں انھوں نے اصل متن کو سامنے رکھ کر پیروڈی نگار کی خصوصیات پر بحث کی ہے لیکن نثری پیروڈیوں میں یہ انداز بدل جاتا ہے۔ اس حصے میں سب سے اچھا تجزیہ ظفر کمالی کی 'فلیپ نگاری' کا کیا گیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ مصنف متن کے اندر اترنے کے ساتھ ساتھ متعلقاتِ متن پر ایک نظر ڈالے بغیر اپنا کام مکمل نہیں کرتا ہے۔ اس بات کا ذرا افسوس ہوا کہ احمد جمال پاشا کی شاہ کار تحریر' کپور: ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ' کا تجزیہ بھرپور انداز میں ممکن نہیں ہوسکا۔ شاید اس کی یہ بھی وجہ ہو کہ احمد جمال پاشا کی خدمات کا تذکرہ اس کتاب میں کئی جگہوں پر ہوا ہے اور انھیں ایک ساتھ پڑھنے سے پاشا کا مقام لازمی طور پر متعین ہو جاتا ہے۔

'پیروڈی کا فن' صرف اپنے موضوع پر ایک اچھی کتاب ہوتی تو یہ بہت بڑی بات نہیں تھی۔ اس کتاب کے بہانے ہماری یونی ورسٹیوں میں پیدا ہو رہی نسلِ نو کا انہماکِ علمی اور دقیقہ سنجی ظاہر ہو رہی ہے۔ علمی کاموں سے سرسری گزرنے کی عمومی خو، عمائدینِ ادب سے لے کر نو واردانِ بساطِ ادب، سب کے یہاں یکساں دکھائی دیتا ہے۔ ایسے میں یہ گہرائی و گیرائی، علمی جفا کشی اور تحقیق و تنقید کی سنجیدگی نہایت خوش آئند ہے۔ تجزیے میں ذرا طوالت گھٹے، ہم عصر علمی فضا اور ادبی سرمائے سے ایک سرگرم رشتہ قایم ہو اور مکمل ادبی و علمی صورتِ حال کے سائے میں پیروڈی یا کسی اور صنف سے متعلق کارناموں کا جائزہ لینا اگر امتیاز وحید نے سیکھ لیا، تب مستقبل میں اردو تنقید و تحقیق کا چراغ ان کے دم سے بھی روشن ہوگا۔ آمین!

کتاب: پیروڈی کا فن مصنف: امتیاز وحید، صفحات: 380، قیمت: 380، ناشر: عرشیہ پبلیکیشنز، دہلی

........☆........

(۲)

مرزا عظیم بیگ چغتائی کی ادبی خدمات

● صفدر امام قادری

اردو کے علمی حلقے میں مرزا عظیم بیگ چغتائی کو بہ حیثیت ظرافت نگار اپنی زندگی میں زیادہ شناخت اور مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی تھی لیکن ان کی وفات کے بعد ان کی چھوٹی بہن اور ہماری زبان کی معتبر فکشن نویس عصمت چغتائی نے 'دوزخی' عنوان سے ان کا جو خاکا لکھا، اس کے بعد مرزا عظیم بیگ سے عام قارئین کی رغبت اور اپنائیت بڑھی۔ فرحت اللہ بیگ کی تحریر 'نذیر احمد کی کہانی' کے بعد عصمت کا خاکہ ہی وہ شبہ کار ہے جس سے فنِ خاکہ نویسی کا اس قدر اعتبار قائم ہوا۔ مرزا نے ایک مختصر عمر پائی اور ۴۳ برس میں ہی راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ اس دوران تقریباً تین درجن کتابیں ان کے قلم سے نکلیں۔ انھوں نے خالص ظریفانہ تحریروں کے ساتھ ساتھ دوسری نوعیت کی چیزیں بھی شائع کیں۔ خاص طور سے ناول نگاری، افسانہ نگاری اور مذہبی بحث و تمحیص کو اپنے نظامِ تحریر کا انھوں نے حصہ بنایا۔ آج ہم اردو فکشن کی تاریخ کے اہم موڑ کے تعین میں نذیر احمد، مرزا رسوا، پریم چند اور قرۃ العین حیدر پر اپنی جان نچھاور کرتے ہیں لیکن فکشن کی اس عمارت میں کئی بار کبھی بنیاد کا پتھر بن کر اور کبھی پس منظر میں رہ کر جن لوگوں نے اسے استحکام بخشا ہے، ان پر ہماری نگاہ کم جاتی ہے۔ انیسویں صدی میں اودھ پنچ کے مصنفین بہ شمول سرشار اور بیسویں صدی میں عظیم بیگ اور شوکت تھانوی کے ظریفانہ ناولوں نے کس طرح ہماری زبان میں روشن خیالی اور عقلیت پسندی کی بنیادیں مضبوط کیں، اس پر ہمارا زیادہ دھیان نہیں رہتا۔ ہمارے متعدد ظرافت نگار صرف اسی بے توجہی کی وجہ سے اپنی علمی شناخت قائم کرنے میں کمزور ثابت ہوئے۔ عظیم بیگ چغتائی اور رشید احمد صدیقی سے یہ سلسلہ مشتاق احمد یوسفی تک پہنچتا ہے جہاں ظرافت دانش ورانہ رخ سے دامنِ دل کھینچتی ہے۔

عظیم بیگ چغتائی کی موت اس وقت ہوئی جب وہ تصنیف و تالیف کی اُٹھان پر تھے۔ ہمارے گھروں میں ان کی کتابیں مرد و خواتین کے مطالعے میں رہتیں۔ ان کے بعض ناولوں کی خاتون کردار اس زمانے میں آئیڈیل کے طور پر سماج میں مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب رہیں۔ ان کی تحریروں کے دانش ورانہ عناصر نے

نذیر احمد اور پریم چند کی طرح ہی ایک بڑے حلقے کو متاثر کیا۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ ہمارے لیے ایک گم شدہ باب بن گئے اور وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں کے تعارف، انتخاب اور احتساب کے سلسلے کو کسی نے آگے نہیں بڑھایا۔ ہمارے یہاں جہاں معمولی مصنفین پر ضخیم و جسیم کتابیں تیار کر کے کاغذ کا زیاں عام بات ہے لیکن ایسے اہم لکھنے والوں پر کسی کا دھیان ہی نہیں جاتا۔ ہارون ایوب کی ایک مختصر سی کتاب چھوڑ دیں تو اردو تنقید و تحقیق کا دامن عظیم بیگ چغتائی کے تفصیلی ذکر سے خالی ہے۔ اس صورتِ حال میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی لائق طالبہ حنا آفریں کی ۵۳۷ صفحات کی خفی کمپوزنگ میں جب کتاب سامنے آئی تو میری حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ پروفیسر قاضی جمال حسین کی نگرانی میں ہوئی یہ بھرپور تحقیق عظیم بیگ چغتائی کے ساتھ اردو والوں کی غفلت شعاری کا واقعتاً بہترین ازالہ ہے۔ اس کام کے لیے حنا آفریں کے ساتھ ساتھ ان کے نگراں محترم بھی مبارک باد کے مستحق ہیں کیوں کہ ایک ناتجربہ کار طالب علم سے اس قدر بھرپور اور صبر آزما کام مکمل کرالینا بھی ایک غیر معمولی ماہرانہ صلاحیت کا متقاضی ہے۔

عام طور پر تحقیقی کتابیں یا مقالۂ امتحانیہ غیر ضروری تفصیلات اور پس منظر یا معاصرین کی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کی وجہ سے گراں بار ہو جاتی ہیں۔ غیر ضروری باتوں سے تو ایسے تحقیقی مقالات بھرے ہی ہوتے ہیں۔ موجودہ تحریر اپنی بھرپور ضخامت کے باوجود ایسے کسی فضول گوشوارے سے گراں بار نہیں کی گئی ہیں۔ سترہ صفحات میں سوانح مکمل ہوگئی ہے اور دس گیارہ صفحات میں عظیم بیگ چغتائی کی شخصیت کے تار و پود روشن کیے گئے ہیں۔ جن افراد نے 'دوزخی' کا مطالعہ کیا ہے، ان کے لیے بھی حنا آفریں کی کتاب کے متعلقہ صفحات میں بہت ساری نئی اطلاعات لازماً میسر آئیں گی۔ خاندانی ذرائع سے اطلاعات حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا اور خاص طور سے جب عظیم بیگ چغتائی کے پسماندگان پاکستان اور یورپ میں مقیم ہوں۔ حنا آفریں نے مطبوعہ ذخائر کا بھی بالاستیعاب مطالعہ کیا اور نہایت اختصار کے ساتھ حیات و شخصیت کے بیشتر ضروری اجزا کو سمیٹ کر ایک ایسے انداز میں انھیں پیش کیا ہے جس سے عظیم بیگ سے محبت اور ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ ۴۳ برس کی مختصر زندگی گزار کر رخصت ہونے والے جواں مرگ ادیب کی زندگی کس طرح نشیب و فراز کا شکار رہی، اس کا اندازہ اس کتاب کے چند اقتباسات سے لگایا جاسکتا ہے:

> ''اسی دوران عظیم بیگ نے اپنا مشہور ناول 'کھرپا بہادر' لکھا جو نواب جاورہ اور نواب رامپور کے خاندان کا قصہ ہے اور اسے نواب جاورہ کے منع کرنے کے باوجود عظیم بیگ نے شائع بھی کروادیا۔ اس دوران نواب جاورہ نے اپنے بیٹے کے لیے عظیم بیگ کی بیٹی کا پیغام بھی دیا۔ عظیم بیگ نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ نواب جاورہ عظیم بیگ کی ان دونوں باتوں کی وجہ سے ان سے بدظن ہو گئے اور انھیں دوا

کے بہانے زہر دلوانے لگے کیونکہ عظیم بیگ دمہ کے مریض تھے اور اس کے لیے مستقل دوا لیتے تھے۔''

''بیمار ہونے کے بعد پڑھنا لکھنا کچھ زیادہ ہی ہوگیا کیوں کہ گزر بسر کے لیے روپے کی ضرورت تھی۔ اتنی ہمت رکھتے تھے کہ بستر پر پڑے رہنے کے باوجود علی گڑھ کے جانسن تالوں کی ایجنسی لے رکھی تھی۔ جو دھپور کے تاجروں کو تالے سپلائی کرتے۔ جودھپور میں تانبے کے بٹنوں کے آرڈر لیتے جو جودھپور حکومت کی پولیس فوج کو سپلائی کرتے۔ اس کے علاوہ عظیم بیگ نے بمبئی کی ''سپلا'' دواؤں کی کمپنی کی ایجنسی بھی لے رکھی تھی۔ اس طرح عظیم بیگ بستر پر لیٹے لیٹے ہی کافی کما لیتے تھے۔''

''جب بھی افسانہ وغیرہ لکھنا ہوتا تو وہ لیٹے لیٹے خود بولتے رہتے۔ کبھی بیٹے اور کبھی بھانجے لکھتے رہتے۔ اسی حالت میں لکھنے کا شوق ان کی ضرورت بن گیا کیونکہ اس وقت ایک افسانہ کے پندرہ بیس روپے ملتے تھے۔ عظیم بیگ کو مہینے میں تین چار افسانے گھر کے خرچ کے لیے مجبوراً لکھنا پڑتے تھے۔ کتابوں سے بھی آمدنی تھی۔ اس کے علاوہ جانسن تالوں کی ایجنسی سے بھی تھوڑا بہت کما لیتے تھے۔''

ان اقتباسات سے عظیم بیگ چغتائی کے داخل میں پیوست توانا شخصیت کو سمجھنا دشوار نہیں۔ مصنفہ نے اختصار کے ساتھ صرف ان پہلوؤں کو دکھایا ہے جن سے عظیم بیگ کی زندگی آئینہ ہو سکتی تھی۔ انھوں نے زیادہ صراحت اور تفصیل کی طرف بڑھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ یہ اچھا ہوا کہ مصنفہ نے صرف کام کی باتوں پر اکتفا کیا، ورنہ بہت ساری ایسی باتیں بھی تھیں جنھیں عظیم بیگ کی سوانح میں شامل کرکے کوئی دوسرا لکھنے والا چٹخارا پیدا کر سکتا تھا۔

عظیم بیگ کی ادبی خدمات کے تعارف کے لیے (۱) ناول نگاری (۲) افسانہ نگاری (۳) مزاح نگاری اور (۴) مذہبی تحریروں پر مکمل ابواب قائم کیے گئے ہیں۔ عظیم بیگ کے چار ناولوں پر خاص طور سے صراحت کے ساتھ لکھا گیا۔ شریر بیوی، کھرپا بہادر، وہم پایر، چمکی۔ اسی طرح ان کے افسانوی مجموعوں 'روح ظرافت'، 'روحِ لطافت' اور 'خانم' کے تعلق سے مصنفہ نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ افسانہ نگاری پر گفتگو کرتے

ہوئے حنا آفریں نے ۱۹۳۵ء میں رسالہ 'ساقی' کے متعدد شماروں میں شائع ہونے والے عظیم بیگ چغتائی کے سلسلۂ مضامین سے اقتباسات درج کیے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو افسانے کی تنقید کے تعلق سے جن لوگوں نے سب سے پہلے غور وفکر کیا، ان میں عظیم بیگ جیسا ظرافت نگار بھی ہے۔ یہ مناسب ہوگا کہ فنِ افسانہ نگاری کے حوالے سے شائع شدہ وہ تمام مضامین کتابی شکل میں ترتیب پا کر سامنے آجائیں۔ اس سے عظیم بیگ چغتائی کی شخصیت کا ایک نیا رخ سامنے آئے گا۔

'دوزخی' میں عظیم بیگ کی مذہبی بحث وتمحیص سے ان کی دلچسپیوں کا ذکر ہے۔ اس سلسلے سے عظیم بیگ چغتائی کی چار کتابیں۔ 'قرآن اور پردہ' 'حدیث اور پردہ' 'تفویض اور رقص وسرور شائع ہوئیں۔ اردو ادب کے طالب علم کے لیے یہ ایک ضمنی حوالہ ہے کہ عظیم بیگ چغتائی نے مذہبی امور پر چند کتابیں لکھیں۔ اسی لیے کہیں ان کتابوں کا کسی نے جائزہ نہیں لیا یا ان کے مشتملات کا بالاستیعاب مطالعہ ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ حنا آفریں نے تقریباً ایک سو صفحات میں ان کتابوں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا ہے۔ ان موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے حنا آفریں نے ابوالاعلا مودودی، اشرف علی تھانوی اور دیگر ماہرین علوم اسلامیہ کی متعلقہ کتابوں سے بھی بحث کر کے عظیم بیگ چغتائی کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ یوں یہ حصہ براہ راست ادبی مطالعے سے متعلق نہیں ہے لیکن حنا آفریں نے مدلل گفتگو کر کے عظیم بیگ چغتائی کی روشن خیال اور liberal شخصیت کے عناصر واشگاف کر دیے ہیں۔

عظیم بیگ چغتائی کی افسانہ نگاری یا ناول نگاری واقعتاً ان کی ظرافت نگاری سے متعلق ہیں۔ شاید اسی لیے اردو افسانے یا ناول کی تاریخ لکھتے ہوئے لوگوں نے ایسے ظرافت نگاروں کا خیال نہیں رکھا جو ظریفانہ افسانے یا ناول لکھ رہے تھے۔ شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی اس پہلو سے نقادوں کے التفات سے دور رہے جب کہ یہ سچائی ہے کہ ان کی تحریریں افسانہ یا ناول کے دائرے میں پہچانی جانی چاہئیں۔ حنا آفریں نے (۱) مختصر افسانہ (۲) طویل مختصر افسانہ (۳) ناول کے صنفی تقاضوں کو سمجھتے ہوئے عظیم بیگ کی کم از کم دو درجن ایسی تحریروں کو اپنے تجزیے کا حصہ بنایا جو پڑھنے والوں کے حافظے سے دور جا رہی تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ حنا آفریں نے تخلیقات کے تجزیے کے دوران ذرا طوالت سے کام لیا اور موضوعاتی دنیا کی اسیری انھیں فنی محاسبے سے روکتی بھی رہی۔ لیکن یہ بات قابلِ ستائش ہے کہ انھوں نے ثانوی ماخذات کے مقابلے اصل تحقیقات پر توجہ کر کے اپنی تحقیق اور تجزیے کو با اعتبار بنایا۔

یہ کتاب اگر ایک چوتھائی کم ہو گئی ہوتی تو رطب ویابس کی گنجائش نہیں رہتی۔ اقتباسات کی شمولیت کے بعد متن میں پھر انھی باتوں کا دورانِ تجزیہ دہراؤ اس کتاب میں گراں گزرتا ہے۔ کتاب کی زبان صاف ستھری اور تحقیقی اعتبار سے موزوں ہے لیکن بعض جملے یا الفاظ بار بار اس طرح سے دہرائے جاتے ہیں جس سے بیان کا کچا پن سمجھ میں آتا ہے۔ یہ مشق کی کمی کا اشاریہ ہے۔ حنا آفریں نے اس تحقیقی مقالے سے قبل ۲۰۰۷ء میں 'معنی کی تلاش' عنوان سے ایک مجموعۂ مضامین شائع کیا تھا جس کا بڑا حصہ

شعری اور افسانوی شہکاروں کے تجزیے پر مشتمل تھا۔ اس دوران اردو کے رسائل و جرائد میں محترمہ کے بہت کم مضامین دیکھنے کو ملے۔ زبان کی سطح پر پختہ کامی آتے آتے آئے گی۔ آج کل کی عمومی تحقیق وتنقید یا شخصی مطالعے کے نام پر مستند و معمر اہل قلم کے نوشتہ جات مقابلے میں یہ تحقیقی مقالہ مجھے زیادہ پسند آیا اور یونی ورسیٹیوں میں تحقیقات کے معیار کے سلسلے سے ہورہی گفتگو کے برعکس ایک ٹھوس کارنامہ سمجھ میں آتا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا شعبۂ اردو ایسے کاموں کے لیے مبارکباد کا مستحق ہے۔

کتاب: مرزا عظیم بیگ چغتائی کی ادبی خدمات، مصنفہ: حنا آفریں صفحات: ۵۳۷، قیمت: ۳۷۵، ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ (یوپی)

(۳)

خاندانِ شروانی کے ایک فرزند کی زندگی کی ''دھوپ چھاؤں''

● صفدر امام قادری

برِصغیر ہندو پاک کے ادبی منظرنامے پر گوناگوں علمی سرگرمیوں اور مختلف فیہ دلچسپیوں کے ساتھ جو ایک سرگرم معمر نسل دکھائی دے رہی ہے، اس میں خانوادۂ صدیق مکرم حبیب الرحمان شروانی کی زندہ یادگار ریاض الرحمان شروانی واقعتاً ہمارے لیے باقیات الصالحات کا درجہ رکھتے ہیں۔ سو کی عمر میں دس بارہ ہی بچے ہیں لیکن ان کے مضامین، کتابیں اور علی گڑھ کانفرنس گزٹ کا تواتر سے شائع ہونا اُسی طرح قائم ہے۔ کمال یہ کہ تازہ ترین اہم کتابوں پر وہ خود تبصرہ کریں گے اور دوسروں کے مضامین یا خطوط کے سلسلے سے ضروری حواشی سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ صحت وتندرستی کے ساتھ علمی وادبی جاہ ومنصب کے عروج پر متمکن موجودہ افراد بالعموم ان سرگرمیوں کا دسواں حصہ بھی انجام نہیں دے پاتے۔ کمال یہ ہے کہ ریاض الرّحمان شروانی صرف انھی موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں جن پر اُن کی گہری نظر ہے۔ وہ عمومی موضوعات کی طرف توجہ بھی نہیں کرتے۔

ریاض الرّحمان شروانی یوں تو ماہرِ ابوالکلام آزاد ہیں اور اپنی مشہور کتاب ''مسیرِ کارواں'' کی وجہ سے امتیاز کا درجہ رکھتے ہیں لیکن پچھلے دنوں ان کی ایک مختصر خودنوشت ''دھوپ چھاؤں'' عنوان سے شائع ہوئی جس میں ان کی زندگی کے محض آٹھ برس (۱۹۴۱۔۴۹ء) کے مختلف واقعات شامل ہیں۔ مصنف اگر دوسرے لوگوں کی طرح

علمی ہوس کاری میں مبتلا ہوتا تو تھوڑے بہت اور حالات شامل کر کے دوسروں کی طرح ایک مکمل خودنوشت کا دعوا پیش کر دیتا۔ لیکن یہاں اپنی زندگی کے مختصر وقفے کی کچھ باتیں پیش کر کے شاید مصنف کچھ دوسرا ہی مقصد طے کرنا چاہتا ہے۔ دراصل یہ عہد مصنف کی یونی ورسٹی تعلیم سے متعلق ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا قبل از وقت ہوگا کہ مصنف اس کتاب میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی تعلیمی زندگی کو ہی محور بنانا چاہتا ہے۔ لیکن ہمیں یاد ہونا چاہیے کہ ریاض الرحمان شروانی کی اس تعلیمی زندگی میں ۴۸۔۱۹۴۶ء کا وہ نازک زمانہ بھی شامل ہے جس نے برِصغیر کا نئے سرے سے مقصد طے کیا اور قتل و خون کے جانے کتنے خوفناک سلسلے سامنے آئے۔ ریاض الرحمان شروانی خود بھی اس طوفان کے تھپیڑوں میں زندگی کی ننگی سچائیاں دیکھنے کے لیے بے بس تھے۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اور تقسیمِ ملک کے واقعات کی وجہ سے اس خودنوشت کا دائرۂ کار بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ انھی امور کے پیشِ نظر مصنف نے اپنی زندگی کے یہ نو برس منتخب کیے۔

ریاض الرحمان خاں شروانی نے اپنے خاندان کے واقعات کو اختصار کے ساتھ بہ طورِ پس منظر پیش کیا ہے۔ ۴۸ صفحات میں کئی سو برسوں کے کرداروں کو سمیٹتے ہوئے نہایت حقیقت پسندانہ انداز روا رکھا گیا ہے۔ بادشاہوں سے اپنے خاندان کے تعلق کو بتاتے ہوئے انھوں نے غیر ضروری طور پر اسلاف کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر نہیں پیش کیا ہے۔ عام طور پر خودنوشتوں میں جھوٹ سچ کا پلندہ تیار کر کے ہر آدمی اپنے خاندان اور اسلاف کی ٹوپی اونچی رکھنے میں حقیقت سے پرے جانے میں جھجکتا نہیں۔ اسی وجہ سے اکثر خودنوشتیں تنازعات کا شکار ہوتی ہیں اور ان میں بیان کردہ صداقت کی تصدیق و توثیق دوسرے ذرائع سے لازم ہو جاتی ہے۔ ریاض الرحمان شروانی نے اپنے خاندان کے جن کرداروں کو پیش کیا ہے، ان کے بعض اوقات نہایت دلکش مرقعے تیار ہوئے ہیں۔ تفصیل سے گریز کا نہایت حیرت انگیز عمل یہاں دیکھنے کو ملتا ہے جس کی وجہ سے چار پانچ سو برسوں کی تاریخ اور بہت سارے افرادِ خاندان کے واقعات فلم کی ریل کی طرح آنکھوں کے سامنے آتے ہیں اور اپنی جھلک دکھا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔

ریاض الرحمان شروانی نے خاندانی پس منظر اور واقعات کی پیش کش میں اپنے ممدوح ابوالکلام آزاد کی اتباع نہیں کی ورنہ 'تذکرہ' کی طرح ایک بھرپور جلد تو اسلاف کی شان میں مکمل ہو ہی جاتی۔ ریاض الرحمان صاحب کو یہ سہولت بھی حاصل تھی کہ بادشاہوں اور امرا کی زندگی میں تو یوں بھی سچے جھوٹے واقعات بھرے رہتے ہیں۔ ایسے قصوں کے گڑھنے والے ماہرین بھی دربار میں موجود ہوتے ہیں جس کے سبب واقعات کے اصلی اور نقلی پہلو خودرو پودے کی طرح بڑھتے جاتے ہیں۔ ریاض الرحمان شروانی نے اپنے اسلاف کے بارے میں جو بتایا، اس میں اسلاف کی خوبیوں کے ساتھ خامیوں پر بھی نگاہ رکھی۔ خوبیوں کے بیان میں کبھی بھی یہ صورت نہیں پیدا ہونے دی جس سے محسوس ہو کہ وہ اپنے اسلاف کو چاند ستاروں کی جگہ دلانا چاہتے ہیں۔

'رودادِ حیات' کے عنوان سے ۱۴۳ صفحات پر مشتمل گفتگو آپ بیتی کا اصل حصہ ہے۔ کسی بھی خودنوشت

میں مصنف ہیرو ہوتا ہے۔ اکثر لوگ اپنی شخصیت کے تار و پود کچھ اس طرح سے گڑھتے ہیں جس سے یہ التباس پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اگر وہ پیدا نہیں ہوتے تو قومی زندگی کا نظام بدل جاتا۔ ریاض الرحمان شروانی نے خودنوشت لکھنے کے باوجود خود کو ایسی مرکزیت بخشنے میں دلچسپی نہیں لی۔ اس خودنوشت کا یہ ایسا جمہوری مزاج ہے جس پر دوسرے معاصرین کی ہزار رنگینیں قربان ہو جائیں۔

'روداد حیات' میں تقریباً سو صفحات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اپنی وابستگی کے اظہار کے لئے وقف ہیں۔ ان میں بالعموم اپنے حلقۂ احباب کے افراد سب سے روشن ہیں۔ چند اساتذہ اور کچھ وائس چانسلر صاحبان کی تصویریں اجاگر ہو رہی ہیں۔ اُس زمانے کی بعض سیاسی اور سماجی شخصیات کی جگہ جگہ جھلکیاں بھی دکھائی دیتی رہتی ہیں۔ افراد کے اوصاف بیان کرنے کے مرحلے میں ریاض الرحمان شروانی اس عہد، سیاست اور سماج کے بدلتے مناظر کے رنگ و بو بھی ساتھ ساتھ سمیٹتے چلتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو یہ خودنوشت بھانت بھانت کے لوگوں کا اصطبل بن جاتی۔ لیکن اکثر کردار اپنے زمانے کے چند مخصوص رویوں کے ترجمان بن کر ہمیں جزو میں کل کا لطف فراہم کرتے ہیں۔

ریاض الرحمان شروانی نے اس عہد کے ان اساتذہ کا خاص طور سے ذکر کیا ہے جنھوں نے گھر یا مسلم یونیورسٹی میں انھیں پڑھایا تھا۔ سات دہائیوں کے بعد اب کے اساتذہ سے ان کا موازنہ کرتے ہوئے حوصلہ افزا صورت حال نہیں پیدا ہوتی۔ اس زمانے میں بھی کچھ بُرے اور فرض ناشناس اساتذہ سے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی خالی نہیں تھی۔ چند جملوں میں شروانی صاحب نے اپنے بعض اساتذہ کے ایسے مرقعے پیش کر دیے ہیں جن سے ایک ساتھ تاریخ، ادب، تعلیم و تدریس اور دیگر امور اپنے آپ ظاہر ہو جاتے ہیں۔

ریاض الرحمان شروانی بجا طور پر نازاں ہیں کہ انھیں لائق اساتذہ ملے جنھوں نے ان کی علمی زندگی کی ایسی ٹھوس بنیاد رکھی جس کے سہارے وہ آگے تک بڑھتے چلے گئے۔ اپنی خودنوشت میں ریاض الرحمان شروانی نے مزید دو اساتذہ کا ذکر کیا ہے۔ پہلے انگریزی کے نجی استاد سید مظہر علیم اور دوسرے گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر برکت علی قریشی۔ مظہر علیم نے انگریزی کے ساتھ ساتھ عربی، اردو، مذہبی ادب، تاریخ کی تدریس کے ساتھ ساتھ انھیں تصنیف و تالیف کی طرف راغب کیا۔ برکت علی قریشی نے شروانی صاحب کو تقسیم ملک کے بعد لاہور میں ایم۔اے فائنل میں عربی پڑھائی۔ دونوں اساتذہ کے طریقۂ تدریس پر ریاض الرحمان شروانی نے اپنے جو مشاہدات درج کیے ہیں، وہ نہایت قیمتی ہیں اور ہمارے لیے موجودہ عہد کی بے ہنری میں آہ سرد کھینچنے کی مجبوری ہے۔

اس خودنوشت کے ۴۰ صفحات تقسیم ملک کے نتائج پر حاوی ہیں۔ مصنف کی ہم شیرہ علاج کے تعلق سے ہماچل کے کسولی میں اپنے خاندان کے بعض افراد کے ساتھ ایک خاص مدت تک مقیم تھیں۔ ایم۔اے۔ سال اوّل کا امتحان دے کر ریاض الرحمان شروانی مئی ۱۹۴۷ء میں تیمارداری کی غرض سے کسولی پہنچے۔ وہاں رفتہ رفتہ سیاسی صورتِ حال بدلتی گئی۔ فسادات اور جینے مرنے کے حالات وہاں بھی پیدا ہوتے گئے۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۴۷ء

کو مریض اور تیماردار سب ملٹری ٹرک میں بٹھا کر کالکا کے لیے روانہ کر دیے گئے جہاں رفیوجی کیمپ کھولا گیا تھا۔ نو دس دن مع خاندان کیمپ میں رہ کر پھر کالکا سے بہ ذریعۂ ریل انھیں لاہور بھیجا گیا۔ یہ قافلہ ۲۴ ستمبر ۱۹۴۷ء کو لاہور پہنچا۔ وہاں پھر سے ادھوری تعلیم کی تکمیل کا سلسلہ شروع ہوا۔ انھوں نے پنجاب یونی ورسٹی میں سال دوم میں داخلہ لیا۔ پھر مارچ ۱۹۴۹ء میں واپس علی گڑھ پہنچے۔ اس دور کے عمومی واقعات تو انھوں نے نہیں بتائے لیکن اپنی زندگی سے جڑے ہوئے معاملات کی پیش کش کے دوران واقعات و مشاہدات کی ایک ایسی کہکشاں سج جاتی ہے جہاں ہندوپاک کی تاریخ کے سب سے مشکل دور کی کچھ آہیں اور کچھ شکستِ خواب اور لرزیدہ تمنائیں زندگی کا حصّہ ہو گئیں۔ یہاں ریاض الرحمان شروانی قومی تاریخ کے ایک نازک دور کا عمومی کردار بن جاتے ہیں جس کے سہارے اس قیامت صغرا کی آپ بیتی لہو رلاتے ہوئے ہمارے سامنے ہوتی ہے۔

خودنوشت کے آخری حصّے میں واقعات کی پیش کش میں اختصار کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اس طرح واقعات کے بیان میں حیرت انگیز طور پر معروضیت کا طور پیدا ہو گیا ہے۔ یہ خودنوشت ظاہری طور پر الفاظ و صفحات کی قبا کے سبب مختصر ورنہ جہانِ معنی کی سیر کو مقصد تصوّر کریں تو یہ کتنی طول طویل معلوماتی اور تجزیاتی کتابوں پر بھاری ہے۔ زندگی اور کائنات کے بہت سارے اچھوتے رنگ اس خودنوشت میں اس طرح ابھرتے، ڈوبتے دکھائی دیتے ہیں جیسے یہ معلوم ہو کہ مصنف قطرے میں دجلہ دکھانے کا ماہر ہے۔ پسندیدہ اور ناپسندیدہ دونوں جلوے ہیں لیکن حقیقت کا سونا سب پر چڑھا ہوا ہے۔ اسی لیے کہیں بھی تعصب، کینہ، ابتذال، مکر اور جھوٹ کا پلندہ نہیں تیار ہوا حالانکہ بعض خودنوشتیں حقیقت کو مسمار کرنے کے لیے یا اپنے بُرے کاموں کی صفائی پیش کرنے کے مقاصد تک محدود ہوتی ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے قیام سے لے کر تقسیم ملک تک ہندستانی سیاست کے ایسے کئی باب ہیں جن کے بعض امور پر مصنف کے یہاں شواہد موجود ہیں۔ ریاض الرحمان شروانی نے تحریکِ آزادی اور تقسیمِ ملک کے معاملات میں کوئی لمبا چوڑا جائزہ تو نہیں لیا لیکن جگہ جگہ چند ایسے واقعات ضرور شامل کر دیے ہیں جن سے یہ سمجھنے میں دشواری نہیں ہو گی کہ مسلم یونی ورسٹی کی فضا اس زمانے میں دور اندیشانہ سیاست سے دور ہو گئی تھی جس کے سبب بعض ایسے مسائل پیدا ہوئے جو ہنوز حل نہیں کیے جا سکے۔

'دھوپ چھاؤں' کے مطالعے کی ایک بنیادی جہت لازماً ہندستانی سیاست کی نازک کیفیت کا بیان ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس وقت مسلم لیگ اور کانگریس کی آپسی چپقلش اس طور پر بڑھی ہوئی تھی جیسے اصل مسئلہ ملک کی آزادی نہیں بلکہ دونوں سیاسی پارٹیوں کی حصّے داری ہے۔ ریاض الرحمان شروانی نے سیاست کے اس کھیل تماشے کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے حلقے میں پہچاننے کی کوشش کی ہے۔ شروانی صاحب کا ماننا ہے کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی مسلم لیگ کے استحکام کا ایک ٹھوس ذریعہ بن گئی تھی۔ ریاض الرحمان شروانی کے مشاہدات اس اعتبار سے قیمتی ہیں کیونکہ انھوں نے حالات اور واقعات کے سلسلے کو بدلتی ہوئی صورتِ حال میں پیوست

کر کے ہندستانی سیاست اور ہماری درسگاہوں کے ناگفتہ بہ گٹھ جوڑ کو ثابت کرنے میں کامیابی پائی ہے۔ چند مختصر اقتباسات ملاحظہ ہوں جو اس سلسلے سے ہماری آنکھیں کھول دیں گے:

☆علی گڑھ میں مسٹر محمد علی جناح کی سالانہ وزٹ ہوئی تھی۔ یہ سلسلہ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۴ء تک جاری رہا۔ وہ بہ ظاہر یوں تو یونی ورسٹی اسٹوڈنس یونین کی دعوت پر تشریف لاتے تھے لیکن دو، تین دن پوری یونی ورسٹی ان کے اعزاز و اکرام میں لگی رہتی تھی۔ وہ مسلم یونی ورسٹی کو The arsenal of muslim youth in india (ہندستانی مسلمانوں کا اسلحہ خانہ) کہتے تھے۔'' (ص۔۱۱۹)

☆''مسلم لیگ کی گرفت مسلم یونی ورسٹی پر اتنی مضبوط تھی کہ کوئی غیر مسلم لیگی الیکشن میں حصہ لینا تو علاحدہ رہا، یونین میں تقریر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کمیونسٹ اور کانگریسی دو بڑی گالیاں تھیں۔'' (ص۔۲۱۔۱۲۰)

☆''اس زمانے میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کا انتخاب جناح صاحب فرماتے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں شاہ محمد سلیمان اور ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۴ء میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد ان کا ہی انتخاب تھے۔'' (ص۔۱۴۷)

ایسا نہیں ہے کہ مسلم لیگ سے اپنی غیر وابستگی کی وجہ سے ریاض الرحمان شروانی نے ایسے واقعات جمع کر دیے ہیں۔ وہ اس دور کی ہندستانی سیاست سے کیسا بڑا گہرا رشتہ رکھتے ہیں، اسے جاننے کے لیے مصنف کی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ وہ ایک بہترین مشاہد اور باخبر شہری کے طور پر ان امور کا جائزہ لیتے ہیں۔ اسی لیے کمال حد تک معروضیت کا ساتھ ہوتا ہے۔ چند مختصر تصویریں ملاحظہ کیجیے جن سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس وقت کس طرح ہندستانی سیاست کانٹوں کی سیج بن گئی اور ہزاروں لاکھوں لوگوں کے خواب کیسے چکنا چور ہونے لگے۔ ہندستانی سیاست دیکھتے دیکھتے کیسے فرقہ پرستانہ چنگل میں پہنچ گئی:

☆ ''جب ماؤنٹ بٹن نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ اس کے سوائے مسائل کا کوئی حل نہیں تھا۔ کیبنٹ مشن پلان بہترین حل تھا لیکن چوں کہ اس پر عمل نہیں ہو سکا، اب مجبوراً اس پلان کو منظور کرنا پڑ رہا ہے۔ اس کے بعد سردار پٹیل کی تقریر ہوئی، انھوں نے مولانا آزاد کی تردید کی اور کہا کہ کیبنٹ مشن پلان کی صورت میں ہمارے سر پر تلوار لٹکی رہتی، اب ہمارے ہاتھ کھل گئے ہیں، ہم ملک کو اپنی مرضی کے مطابق چلائیں گے۔'' ''اپنی مرضی'' کا جو مطلب تھا، وہ واضح ہے اور ملک اسی نہج پر چل رہا ہے، پھر رونا کس بات کا؟ جو مسلم فرقہ پرست چاہتے تھے وہ ہوا، جو ہندو فرقہ پرست چاہتے تھے، وہ ہوا بھی اور ہو بھی رہا ہے۔'' (ص۔۱۴۹)

کو مریض اور تیمار دار سب ملٹری ٹرک میں بٹھا کر کالکا کے لیے روانہ کردیے گئے جہاں رفیوجی کیمپ کھولا گیا تھا۔ نو دس دن مع خاندان کیمپ میں رہ کر پھر کالکا سے بہ ذریعہ ریل انھیں لاہور بھیجا گیا۔ یہ قافلہ ۲۴ ستمبر ۱۹۴۷ء کو لاہور پہنچا۔ وہاں پھر سے ادھوری تعلیم کی تکمیل کا سلسلہ شروع ہوا۔ انھوں نے پنجاب یونی ورسٹی میں سال دوم میں داخلہ لیا۔ پھر مارچ ۱۹۴۹ء میں واپس علی گڑھ پہنچے۔ اس دور کے عمومی واقعات تو انھوں نے نہیں بتائے لیکن اپنی زندگی سے جڑے ہوئے معاملات کی پیش کش کے دوران واقعات و مشاہدات کی ایک ایسی کہکشاں سج جاتی ہے جہاں ہندو پاک کی تاریخ کے سب سے مشکل دور کی کچھ آہیں اور کچھ شکستِ خواب اور لرزیدہ تمنا ئیں زندگی کا حصّہ ہوگئیں۔ یہاں ریاض الرحمانی شروانی قومی تاریخ کے ایک نازک دور کا عمومی کردار بن جاتے ہیں جس کے سہارے اس قیامت صغرا کی آپ بیتی لہو رلاتے ہوئے ہمارے سامنے ہوتی ہے۔

خودنوشت کے آخری حصّے میں واقعات کی پیش کش میں اختصار کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اس طرح واقعات کے بیان میں حیرت انگیز طور پر معروضیت کا طور پیدا ہوگیا ہے۔ یہ خودنوشت ظاہری طور پر الفاظ و صفحات کی قبا کے سبب مختصر ورنہ جہانِ معنی کی سیر کو مقصد تصوّر کریں تو یہ کتنی طول طویل معلوماتی اور تجزیاتی کتابوں پر بھاری ہے۔ زندگی اور کائنات کے بہت سارے اچھوتے رنگ اس خودنوشت میں اس طرح ابھرتے، ڈوبتے دکھائی دیتے ہیں جیسے یہ معلوم ہو کہ مصنف قطرے میں دجلہ دکھانے کا ماہر ہے۔ پسندیدہ اور ناپسندیدہ دونوں جلوے ہیں لیکن حقیقت کا سونا سب پر چڑھا ہوا ہے۔ اسی لیے کہیں بھی تعصب، کینہ، ابتذال، مکر اور جھوٹ کا پلندہ نہیں تیار ہوا حالانکہ بعض خودنوشتیں حقیقت کو مسمار کرنے کے لیے یا اپنے بُرے کاموں کی صفائی پیش کرنے کے مقاصد تک محدود ہوتی ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے قیام سے لے کر تقسیم ملک تک ہندستانی سیاست کے ایسے کئی باب ہیں جن کے بعض امور پر مصنف کے یہاں شواہد موجود ہیں۔ ریاض الرحمان شروانی نے تحریکِ آزادی اور تقسیم ملک کے معاملات میں کوئی لمبا چوڑا جائزہ تو نہیں لیا لیکن جگہ جگہ چند ایسے واقعات ضرور شامل کردیے ہیں جن سے یہ سمجھنے میں دشواری نہیں ہوگی کہ مسلم یونی ورسٹی کی فضا اس زمانے میں دوراندیشانہ سیاست سے دور ہوگئی تھی جس کے سبب بعض ایسے مسائل پیدا ہوئے جو ہنوز حل نہیں کیے جاسکے۔

'دھوپ چھاؤں' کے مطالعے کی ایک بنیادی جہت لازماً ہندستانی سیاست کی نازک کیفیت کا بیان ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس وقت مسلم لیگ اور کانگریس کی آپسی چپقلش اس طور پر بڑھی ہوئی تھی جیسے اصل مسئلہ ملک کی آزادی نہیں بلکہ دونوں سیاسی پارٹیوں کی حصّے داری ہے۔ ریاض الرحمان شروانی نے سیاست کے اس کھیل تماشے کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے حلقے میں پہچاننے کی کوشش کی ہے۔ شروانی صاحب کا ماننا ہے کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی مسلم لیگ کے استحکام کا ایک ٹھوس ذریعہ بن گئی تھی۔ ریاض الرحمان شروانی کے مشاہدات اس اعتبار سے قیمتی ہیں کیونکہ انھوں نے حالات اور واقعات کے سلسلے کو بدلتی ہوئی صورتِ حال میں پیوست

کر کے ہندستانی سیاست اور ہماری درسگاہوں کے ناگفتہ بہ گٹھ جوڑ کو ثابت کرنے میں کامیابی پائی ہے۔ چند مختصر اقتباسات ملاحظہ ہوں جو اس سلسلے سے ہماری آنکھیں کھول دیں گے:

☆علی گڑھ میں مسٹر محمد علی جناح کی سالانہ وزٹ ہوئی تھی۔ یہ سلسلہ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۴ء تک جاری رہا۔ وہ بہ ظاہر یوں تو یونی ورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کی دعوت پر تشریف لاتے تھے لیکن دو، تین دن پوری یونی ورسٹی ان کے اعزاز و اکرام میں لگی رہتی تھی۔ وہ مسلم یونی ورسٹی کو The arsenal of muslim youth in india (ہندستانی مسلمانوں کا اسلحہ خانہ) کہتے تھے۔" (ص۔۱۱۹)

☆"مسلم لیگ کی گرفت مسلم یونی ورسٹی پر اتنی مضبوط تھی کہ کوئی غیر مسلم لیگی الیکشن میں حصہ لینا تو علاحدہ رہا، یونین میں تقریر بھی نہیں کرسکتا تھا۔ کمیونسٹ اور کانگریسی دو بڑی گالیاں تھیں۔" (ص۔۲۱-۱۲۰)

☆"اس زمانے میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کا انتخاب جناح صاحب فرماتے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں شاہ محمد سلیمان اور ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۴ء میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد ان کا ہی انتخاب تھے۔" (ص۔۱۴۷)

ایسا نہیں ہے کہ مسلم لیگ سے اپنی غیر وابستگی کی وجہ سے ریاض الرحمان شروانی نے ایسے واقعات جمع کر دیے ہیں۔ وہ اس دور کی ہندستانی سیاست سے کیسا پُر درد رشتہ رکھتے ہیں، اسے جاننے کے لیے مصنف کی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ وہ ایک بہترین مشاہد اور باخبر شہری کے طور پر ان امور کا جائزہ لیتے ہیں۔ اسی لیے کمال حد تک معروضیت کا ساتھ ہوتا ہے۔ چند مختصر تصویریں ملاحظہ کیجیے جن سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس وقت کس طرح ہندستانی سیاست کانٹوں کی سیج بن گئی اور ہزاروں لاکھوں لوگوں کے خواب کیسے چکنا چور ہونے لگے۔ ہندستانی سیاست دیکھتے دیکھتے کیسے فرقہ پرستانہ چنگل میں پہنچ گئی:

☆ "جب ماؤنٹ بٹن نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ اس کے سوائے مسائل کا کوئی حل نہیں تھا۔ کیبنٹ مشن پلان بہترین حل تھا لیکن چوں کہ اس پر عمل نہیں ہوسکا، اب مجبوراً اس پلان کو منظور کرنا پڑ رہا ہے۔ اس کے بعد سردار پٹیل کی تقریر ہوئی، انھوں نے مولانا آزاد کی تردید کی اور کہا کہ کیبنٹ مشن پلان کی صورت میں ہمارے سر پر تلوار لٹکی رہتی، اب ہمارے ہاتھ کھل گئے ہیں، ہم ملک کو اپنی مرضی کے مطابق چلائیں گے۔ 'اپنی مرضی' کا جو مطلب تھا، وہ واضح ہے اور ملک اسی نہج پر چل رہا ہے، پھر رونا کس بات کا؟ جو مسلم فرقہ پرست چاہتے تھے وہ ہوا، جو ہندو فرقہ پرست چاہتے تھے، وہ ہوا بھی اور ہو بھی رہا ہے۔" (ص۔۱۴۹)

ریاض الرحمان شروانی نے فرقہ واریت اوراس کے جنون کی آنکھوں دیکھی تصویریں بھی پیش کردی ہیں۔ان کی زندگی نے بھی ایسی کروٹ لی کہ آزادی سے پہلے ہی فرقہ وارانہ ماحول نے ان کو اس طرح شکنجے میں لے لیا کہ کہاں مسلم لیگ اور تقسیمِ ملک کا مخالف اور کہاں بے سروسامانی کے عالم میں پاکستان کی طرف رفیوجی بن کر پہنچ جانا۔اس خودنوشت میں ریاض الرحمان شروانی نے اپنی زندگی کا یہ حصہ بلاشبہ جسم وجگر سے لہو نکال کر لکھا ہے۔اشارے اور واقعات مختصر ہیں لیکن ان کے اثرات دیرپا اور چشم کشا ہیں۔ملاحظہ ہو:

☆ ''اگرنواکھالی میں جان ومال اور عزت وآبرو کا زیادہ نقصان ہندوؤں کا ہوا تھا تو گڑھ مکتیشر اور بہار میں مسلمانوں کا اتلاف اضعافاً مضاعفہ ہوا۔'' (ص۔۱۳۴)

☆ ''جب ہم عید کی نماز پڑھنے کے لیے گئے تو سارا ماحول اپنا دشمن نظر آتا تھا،سکھوں کی تیوریاں خاص طور سے چڑھی ہوئی تھیں۔پھر تو حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔جس کوٹھی میں ہم رہ رہے تھے،وہ ایک سکھ ہی کی کوٹھی تھی۔اس کے مالک کا جوان بیٹا،جو تقریباً میرا ہم عمر تھا،ہر مہینے کی شروعات میں کرایہ لینے کے لیے آتا تھا۔ستمبر کے شروع میں آیا تو اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔کہنے لگا:نئی سرحد کے اُس پار داڑھی والے (سکھ) کتے بلّیوں کی طرح مارے جارہے ہیں اور تم یہاں اطمینان سے بیٹھے ہوئے ہو۔بالآخر ہم بھی بیٹھے نہیں رہ سکے اور جلدی ہی ہمیں بھی آگ کا دریا پار کرنا پڑا۔'' (ص۔۱۵۲)

مسلم لیگ،علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی،تقسیمِ ملک کی سیاست اور فرقہ وارانہ فسادات کے آگ اور خون کو سمجھنے کے پس منظر کے طور پر مہاجر کیمپ اور کالکا سے لاہور تک ٹرین کے سفر کے تھوڑے واقعات اس کتاب سے براہِ راست پڑھ لیے جائیں تو موضوعاتی دائرۂ کار مکمل ہوجائے گا۔کیونکہ اس دوران انسانیت اور انسانی مقدر کے بیچ ایک چوطرفہ ٹکراؤ کی کیفیت ہے۔کبھی انسانیت ہارتی ہے تو کبھی حیوانیت کی بھیڑ سے کوئی فرشتہ نکل آتا ہے اور زندگی دھوپ اور چھاؤں کا ناقابلِ بیان تماشا بنی رہتی ہے۔

ریاض الرحمان شروانی اردو،فارسی،عربی اور انگریزی زبانوں سے مکمل آشنا صاحبِ تصنیف ادیب ہیں۔ابوالکلام آزاد سے بے پناہ متاثر ہونے کے باوجود زبان کی آرائش کو انھوں نے اپنے لیے راہنما نہیں بنایا۔سادہ زبان میں صاف صاف کہنے کا ہنر اتنا دل نشین اور دل پذیر ہے،جس سادگی پر واقعی رنگینی قربان ہوسکتی ہے۔یوں بھی خودنوشت میں حقائق پر ارتکاز اتنا زور آور ہوتا ہے کہ زبان کی بندش اور سجانے سنوارنے کے اضافی کاموں سے مصنف اپنے آپ دور ہوجاتا ہے۔حقیقت کے بیان میں سادگی وپُرکاری،بے خودی وہشیاری کی جلوہ سامانیاں دھوپ چھاؤں کی طرح ہمارے ساتھ ہوتی ہیں۔رفیوجی کیمپ سے نکل کر پاکستان روانہ ہونے اور

پھر لاہور پہنچنے کے لمحات کیسے پُر اثر انداز میں احاطہ تحریر میں آئے ہیں، ملاحظہ ہو:

☆ ''جب ٹرین پلیٹ فارم سے رینگی تو آسمان پر سویرا جھلک رہا تھا اور ہم حسرت ویاس سے اپنے وطن ہی کو نہیں، اپنے سامان کو بھی الوداع کہہ رہے تھے۔'' (ص۔۱۵۸)

☆ ''۲۴ر ستمبر کو ابھی ستارے جھلملا رہے تھے کہ کسی نے کہا: ٹرین پاکستان کی سرحد میں داخل ہو گئی۔ مسافروں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا اور کہا: تب ہی ستاروں میں وہ چمک نہیں رہی۔ میں نے غلط نہیں کہا تھا: سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا، ستاروں میں چمک کہاں ہوتی۔'' (ص۔۱۵۹)

ریاض الرحمان شروانی کی یہ خودنوشت بلاشبہ ایسی کتابوں میں شمار ہوگی جنھیں لفظ بہ لفظ پڑھنا چاہیے۔

☆☆☆

(۴)

نام کتاب : سوادِ حرف، صنف : تنقید، مصنف :مختار شمیم،ناشر : ڈاکٹر سیفی سرونجی، سرونج (بھوپال)، سالِ اشاعت (طبع اوّل):۲۰۱۱ء

قیمت: تین سو پچاس روپیے، مبصر :اظہار خضر

''سوادِ حرف'' (مطبوعہ ۲۰۱۱ء) جناب مختار شمیم کے تنقیدی، تحقیقی اور چند تاثراتی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ۳۸۴ صفحات کو محیط مجموعے کے ۳۷ مشمولات کے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ مضمون نگار جناب مختار شمیم نے زبان وادب کے حوالے سے فکروسوچ کے نہ جانے کتنے ہفت خواں طے کیے ہوں گے۔ ان کی تحریروں میں فکرو مطالعے کی جس سنجیدگی و متانت کا مجھے احساس ہوا اس کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ادبی معاملات میں لے کا تا اور دوڑ ی کے قائل نہیں ہیں۔ یہ بڑی بات ہے۔ اور یہ ہی وہ طریقۂ نگارش ہے جو زیر گفتگو کتاب کا شناخت نامہ ہے! اس مختصر سی تبصراتی تحریر میں انھی امور کو نشان زد کرنے کی کوشش کی جائے گی!

مجموعہ کی پہلی تحریر ظہیر دہلوی کی ''داستان غدر'' ہے۔ مشمولہ تمام مضامین میں اس مضمون کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

''حرفِ اوّل'' کے تحت جناب مختار شمیم اس تحقیقی اور تنقیدی مقالے کے تئیں ارباب نظر کی عدم توجہی سے شکوہ کناں نظر آتے ہیں۔

''۱۹۹۲ء میں میرا تحقیقی مقالہ ''ظہیر دہلوی — حیات وفن''
نصرت پبلیشرز، لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ اگر چہ کہ پاکستان

میں اس کی پذیرائی ہوئی، لیکن ہمارے یہاں مقالہ طاقِ
نسیاں ہوکر رہ گیا۔ اس مقالہ میں ظہیر دہلوی کی ''داستانِ
غدر'' پر سیر حاصل تبصرہ موجود ہے۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے بعد
غالباً یہ تفصیلی ائزہ تھا جو نظر انداز کیا گیا''

غالباً اس عدم توجہی کے پیش نظر جناب مختار شمیم نے اپنے اس تحقیقی مقالے کے اس مرکزی حصّے کو الگ سے ایک مبسوط مقالے کی صورت دے دی جس میں ظہیر دہلوی کی 'داستانِ غدر' پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا تھا۔ کیوں کہ ظہیر کے دیگر ضمنی سوانحی کوائف سے قطع نظر ان کی اس تصنیف میں ''غدر کی داستان'' کو ہی بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ان کا ایک بڑا اور اہم علمی کارنامہ تھا جس کی روشناسی کو جناب مختار شمیم نے ایک علمی و ادبی فریضہ تصوّر کیا! چنانچہ زیر تبصرہ کتاب میں اس مضمون کی شمولیت کا جواز پیش کرتے ہوئے جناب مختار شمیم ''حرف اوّل'' کے تحت لکھتے ہیں۔

سوادِ حرف میں شامل راقم الدولہ ظہیر دہلوی کی داستان غور پر
تنقیدی مواد کو شامل کرنے کا مقصد یہی ہے کہ ظہیر کی تصنیف
کے ساتھ انصاف ہوسکے''

اسے آپ Repetition پر محمول نہ کریں بلکہ موضوع و مواد کی اہمیت وافادیت کو پیش نظر رکھیں۔

علوم وفنون کے سنجیدہ قاری تک آگہی کے نئے منظر ناموں کی ترسیل کی جوابدہی (Accountability) ایک سچا اور ذمہ دار قلمکار کا شناخت نامہ ہے!

حرف اوّل کے تحت جناب مختار شمیم نے یہ بھی اطلاع بہم پہنچائی ہے کہ گورکھپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سربراہ ڈاکٹر افغان اللہ مرحوم نے داستان غدر کے پہلے مطبوعہ ایڈیشن کی کاپی جلد بازی میں شائع کرادی۔ جناب مختار شمیم کے نزدیک ڈاکٹر افغان اللہ مرحوم کی یہ جلد بازی ان کے اس کام کو وقار واعتبار کی سند عطا نہ کرسکی۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب ''نیا دور'' لکھنو کے گوشۂ افغان اللہ میں شمس الرحمٰن فاروقی نے ان کے اس علمی وادبی کام کو سراہا تو جناب مختار شمیم، فاروقی صاحب کی اس بے جا تعریف وتوصیف سے چیں بہ جبیں ہوگئے۔ ظاہر ہے کہ داستانِ غدر پر مختار شمیم نے جس دل جمعی اور سنجیدگی کے ساتھ کام کیا، اس کی خاطر خواہ ایماندارانہ اور غیر جانبدارانہ پذیرائی نہ ہونے کی صورت میں کوئی بھی سنجیدہ اور ذمہ دار اسکالر پست ہمتی کا شکار ہوسکتا ہے۔ میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی کی اس بے جا تعریف وتوصیف کو ان کی مروّت پسندی اور رواداری پر محمول کرتا ہوں! حالاں کہ فاروقی صاحب اس معاملے میں بہت ہی Selective واقع ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس میں ان کے کچھ ذہنی تحفظات کا بھی دخل ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ بڑے اور Established قلمکاروں کی مروّت پسندی اور رواداری سے اردو ادب کو بڑا نقصان پہنچ رہا ہے! اس جملۂ معترضہ سے صرف نظر کرتے ہوئے عرض یہ کرنا ہے کہ

''داستانِ غدر'' پر زیر تبصرہ کتاب میں بہ قول جناب مختار شمیم کے تنقیدی و معلوماتی مواد کو شامل کرنے کا مقصد یہی ہے کہ ظہیر کی تصنیف کے ساتھ انصاف ہو سکے! ساتھ ہی ان کے اس کام کی خاطر خواہ ایماندارانہ اور غیر جانبدرانہ پذیرائی بھی ہو۔ میں جناب مختار شمیم کی اس اندرونی دل سوزی کا احترام کرتا ہوں۔ کیوں کہ کسی اسکالر کے قابل قدر اور قابل اعتنا علمی و ادبی کارناموں کے ایماندارانہ Acknowledgment سے اس کے فکر و فن کے رگ و ریشے میں قوّت و توانائی کے تازہ خون دوڑنے لگتے ہیں۔

''داستان غدر'' محض ظہیر دہلوی کے سوانحی کوائف و حالات کا مرقع نہیں ہے بلکہ ۱۸۵۷ء کے تناظر میں یہ ایک عہد کی سماجی، سیاسی اور تہذیبی دستاویز ہے۔ میرا خیال ہے کہ جناب مختار شمیم کے اس تصنیفی اور تالیفی تحرّک کی عقبی زمین وہ تاریخی حقائق و واقعات ہیں جن میں اس مخصوص عہد کے اقداری نظام کی شکستِ و ریخت کی داستان سرائی اس انداز سے کی گئی ہے کہ اس کے ڈانڈے بعد کے دنوں کے واقعات و حالات سے بہ آسانی ملائے جا سکتے ہیں۔ ''داستان غدر'' کی تصنیف میں مصنف کے اس فکری پہلو کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ جناب مختار شمیم کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے داستانِ غدر پر گفتگو کرتے ہوئے اپنی تحریروں کو بہت حد تک تناظراتی اور اقداری نوعیت کی صورت عطا کرنے کی کوشش کی تا کہ اس کی اہمیت و افادیت اُجاگر ہو سکے۔ ۱۸۵۷ء کے واقعے کے تحریری اور دستاویزی داستان گویوں میں جو نام گنوائے گئے ہیں وہ اپنی جگہ پر مسلّم الثبوت ہیں۔ لیکن غالبؔ کے ''دستنبو'' سے پتہ نہیں انھوں نے کیوں صرف نظر کیا۔ یہ صحیح ہے کہ ''دستنبو'' میں غالبؔ کے ذہنی تحفظات اور مفادات کے کرنگ جا بہ جا دیکھنے کو ملتے ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ غالبؔ باغیوں کو کوستے نظر آتے ہیں۔ خیال رہے کہ اس وقت فرنگیوں کے لیے یہ باغی تھے، لیکن آج یہ جاں نثارانِ وطن کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ عرض یہ کرنا ہے کہ ''دستنبو'' ایک ایسے عہد ساز فن کار کا سیاسی، سماجی اور تہذیبی مرقع ہے جس کا آفتاب عمر نصف النہار سے گزر کر بین افق پر پھیلتی شفق کی لالی میں غروب ہونے کے قریب آ چکا تھا۔ ایسے میں لیل و نہار کی گردشوں کو شفق کی قدم بوسی کی اجازت دے کر غالبؔ نے اپنی تخلیقی اور علمی شخصیت کے ڈوبتے ابھرتے فکری ارتعاشات کو قلمبند کر کے اپنی بے باکانہ جرأت مندی کا ثبوت پیش کیا۔ ''دستنبو'' بھلے ہی متنازعہ فیہ ہو لیکن ۱۸۵۷ء کے غدر کے حوالے سے اس کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ اس کے علاوہ غالبؔ کے سیکڑوں خطوط ہیں جن میں غدر کے حوالے سے بالتفصیل گفتگو کی گئی ہے۔ عرض یہ کرنا ہے کہ اردو لٹریچر میں غدر پر جو تصنیفی سرمایہ موجود و محفوظ ہے اس میں غالبؔ کی تحریریں اپنی نمایاں اہمیت و انفرادیت جتلاتی نظر آتی ہیں۔ اگر جناب مختار شمیم زیرِ گفتگو مضمون کے تقابلی مطالعہ والے حصے میں اس پہلو کو بھی ملحوظ رکھتے تو ان کی یہ تحریر اور بھی Compact ہو جاتی۔ البتہ انھوں نے ''داستان غدر'' کی نثر کا غالب کی نثر سے موازنہ و مقابلہ ضرور کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ ان کے مضمون کا ایک ضمنی حصہ ہے۔

''دستنبو'' سے پہلو تہی کرنے کی ایک ممکنہ وجہ مضمون نگار کے پیش نظر یہ رہی ہو کہ چونکہ اس کا اصل نسخہ فارسی میں ہے؟ اس لیے اردو لٹریچر کے حوالے سے اس پر گفتگو کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ جبکہ ''دستنبو'' کا

اردو ترجمہ ہمارے زبان وادب کا حصہ بن چکا ہے۔

غدر کے واقعات وحالات ظہیر دہلوی کے تجربے میں اس وقت آئے جب ظہیر کا آفتاب عمر نصف النہار پر تھا۔ (سنہ پیدائش ۱۸۳۵ء)۔ یعنی زندگی اپنی بائیس ۲۲ بہاریں دیکھ کر عنفوان شباب کی انگڑائیاں لے رہی تھی۔ ایسے میں زمانے کے تیز جھکڑ اور تندوتیز تجربوں سے ظہیر کا متاثر ہونا ان کے حساس فکروشعور کی خبر دیتا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ظہیر کی یہ آپ بیتی ان کے بالیدہ اور پختہ فکروشعور کا نتیجہ ہے؟ اس سوال کے کئی ممکنہ جواب ہوسکتے ہیں۔ مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ظہیر نے غدر کے جن چشم دید واقعات وحالات کو اپنی محسوسہ کیفیتوں کا حصہ بنایا ان میں فکروتجربہ کے حوالے سے اس عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی نظام کو قدروں کی سطح پر وقار واعتبار کی منزل تک پہنچانے میں لگ بھگ نصف صدی کا وقت لگا۔ مزید یہ کہ کبر سنی کی منزل پر پہنچنے کے بعد سوانحی کوائف کی پرتیں زیادہ تہہ دار اور دبیز ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ظہیر دہلوی ایک مشاق اور چابکدست قلم کار تھے۔ لہٰذا ان کے لیے ایک سال کے اندر اپنے محسوسہ تجربات وحوادث کو قلمبند کردینا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ اس لیے یہ قرین قیاس ہے کہ ۱۹۱۰ء کے اواخر میں انھوں نے اپنی آپ بیتی ''داستانِ غدر'' کے نام سے مکمل کی اور مارچ ۱۹۱۱ء میں ان کی داستانِ حیات بھی ختم ہوگئی۔ ''داستانِ غدر'' کے طبع دوم میں نظیر لدھیانوی کا یہ قیاس محض قیاس ہی ہے کہ:

''کتاب کا بیشتر حصہ پہلے سے لکھا ہوا اور حیدرآباد میں اس کی تکمیل کی ہے''

لیکن جناب مختار شیمم نے نظیر لدھیانوی کے اس Hypothetical Statement کی تردید نہیں کی ہے حالاں کہ مذکورہ اقتباس میں انھوں نے ''داستانِ غدر'' کی تکمیل کا سنہ ۱۹۱۰ء ہی قرار دیا ہے۔

ظہیر دہلوی شاعر بھی تھے اور بہت اچھے شاعر تھے۔ استاذوق کے حلقۂ تلامذہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مختار شیمم کی اطلاع کے مطابق داستان کے دوسرے ایڈیشن کے دوسرے صفحہ کے بعد آرٹ پیپر پر ظہیر کی ایک نادر تصویر شامل ہے اور تصویر کے نیچے یہ شعر درج ہے۔

مژ گانِ یار ہوں یا رگِ تاک بریدہ ہوں
جو کچھ کہ ہوں، سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

شعر غضب کا ہے اور زبردست تیور کا حامل ہے۔ آشوب زمانہ کی زبردست فن کارانہ عکس ریزی کی گئی ہے۔ یہ زمانے کے تندوتیز حوادث کا آئینہ دار ہے۔ اس شعر پر تفصیل سے گفتگو کا یہاں موقع نہیں ہے۔ بس اتنا ہی کہوں گا کہ بڑے ہی باکمال شاعر تھے۔

۴۵ صفحات پر مشتمل اس مضمون کے حواشی کے ۶۰ طویل مندرجات کو دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ جناب مختار شیمم کو اس کی تکمیل کے لیے نہ جانے کتنے ہفت خواں طے کرنے پڑے ہوں گے۔

اب ایک بار پھر Repetition کے حوالے ہی سے گفتگو کو آگے بڑھاتا ہوں۔ زیر تبصرہ مجموعہ مضامین میں پانچ مضامین ایسے ہیں جو جناب مختار شمیم کے پہلے مجموعۂ مضامین ''تناظر و تشخص'' میں شامل ہیں۔

(۱) مطالعہ اقبالؔ کی ایک جہت (۲) ڈاکٹر سیّدہ جعفر کی تنقید نگاری۔ (۳) اردو میں قصیدہ کی شناخت کا مسئلہ (۴) فضل تابش۔ شخص اور شاعر (۵) شعر سچ بولتا ہے۔

عرض یہ کرنا ہے کہ اس Repetition کا کیا جواز ہے؟ اس سلسلے میں تین ممکنہ سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں:

(۱) کیا مضمون نگار نے صفحات کی بے جا کھتونی کے پیش نظر یہ مضامین شامل کیے؟

(۲) مضمون نگار کے پاس نئے مواد و موضوع کی کمی ہے؟

(۳) یا پھر زیر نظر مشمولہ مضامین کی اہمیت و افادیت اس نوعیت کی ہے کہ ادب کے سنجیدہ قارئین کے لیے اس کی تکرار گراں باری کا سبب بن ہی نہیں سکتی ہے۔ بلکہ غور و فکر کے نئے ابواب کھلنے کے امکانات زیادہ روشن ہوں گے۔

سوال نمبر۔۱ کے حوالے سے کہنا یہ ہے کہ ایک ذمہ دار اور سنجیدہ قلمکار صفحات کی بے جا کھتونی سے گریز کرتا ہے۔ اس کی یہ گریز پائی اس کو ایک Genuine قلمکار کی صورت میں پیش کرتی ہے۔ پیش کردہ اس تصنیفی طریقۂ کار کا اطلاق جناب مختار شمیم پر ہوتا نظر آتا ہے۔

سوال نمبر۔۲ کے حوالے سے کہنا یہ ہے کہ جناب مختار شمیم کی تحریروں سے گزرنے کے بعد راقم کو یہ اندازہ ہوا کہ موصوف کی علمی و ادبی سرگرمیوں کی عقبی زمین حد درجہ زرخیز ہے۔ زمین کی یہ زرخیزی اس بات کا اشاریہ ہے کہ مستقبل قریب میں ان کے ادبی افکار و نظریات کے سوتے خشک ہونے والے نہیں ہیں۔

اب سوال نمبر۔۳ کے حوالے سے چند باتیں سن لیجیے:

اقبالؔ پر لکھے گئے مضمون میں جغرافیائی ماحول کے حوالے سے مطالعۂ اقبالؔ کی ایک جہت کو نشان زد کرنے کی کوشش کی گئی۔ مضمون سے اخذ کردہ یہ دو اقتباسات ذہن و فکر کو تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی مہمیز کرتے نظر آتے ہیں۔

(۱) ''شعرِ اقبالؔ کی تشکیل میں ملکی، جغرافیائی اور طبعی خصوصیات اگر شامل نہ ہوتیں تو اقبالؔ، اقبالؔ نہ ہوتے''

(۲) ''فکرِ اقبالؔ کا ارضیات سے رشتہ استوار کرنے کی ضرورت کو چنداں اہمیت نہیں دی گئی۔''

۱۰ ر صفحات پر مشتمل اس مختصر سے مضمون میں جناب مختار شمیم نے شعر اقبالؔ سے مختلف مثالیں دیکر اپنے اختیار کردہ موقف کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ در اصل انھوں نے اس مضمون میں Some Thing New and Thought-Provoking کے اصول کو پیش نظر رکھا ہے۔ اپنے اس طریقۂ نگارش کے فریضہ سے وہ کہاں تک عہدہ برآ ہوئے ہیں اس کا فیصلہ تو ارباب نظر ہی کر سکتے ہیں۔

مجھے تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ چوں کہ اقبالؔ کے فلسفۂ خودی اور تصورِ وطنیت کے حوالے سے صاحبانِ علم وفن نے ہزاروں صفحات سیاہ کر ڈالے ہیں ایسے میں اگر مختار شمیم انھی موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے تو شاید چبائے ہوئے نوالوں کو دوبارہ اُگلنے کا الزام ان پر چسپاں ہو جاتا۔

گیارہ (۱۱) صفحات پر مشتمل ''سیّدہ جعفر کی تنقید نگاری'' پر لکھا گیا مضمون گرچہ روایتی انداز کا حامل ہے، لیکن پھر بھی مضمون نگار کی عرق ریزی کی داد تو دینا ہی پڑے گی۔

''اردو میں قصیدہ کی شناخت کا مسئلہ''—۵ صفحات پر مشتمل اس مختصر سے مضمون میں قصیدہ گوئی کے مدحیہ انداز بیان میں موضوعات کے نئے امکانات کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

> ''صنفِ قصیدہ صرف مدح کی مرہونِ منّت نہیں ہے۔ بلکہ
> قصیدہ میں مدح کے بہانے سے بھی مختلف موضوعات کو نظم
> کرنے کی گنجایش نکلتی ہے۔''

یہ ایک حوالہ جاتی تحریر ہے۔ جس میں ڈاکٹر ابو محمد سحر، ڈاکٹر محمود الٰہی اور شمیم احمد کی تحریروں کے پیش نظر مضمون نگار نے نتیجہ برآمد کیا ہے۔ گفتگو ڈاکٹر ابو محمد سحر کے اس نتیجہ پر ہی سمٹ جاتی ہے:

> ''قصیدہ کا موضوع مدح یا ذم ہونے کے باوجود اس کا میدان اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔''

فضل تابش پر محنت سے لکھے گئے مضمون کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ ایک معتبر اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اگر کسی مضمون کے وسیلے سے فن کار کی تھوڑی بہت بھی تخلیقی شناخت متعیّن ہو جاتی ہے تو یہ مضمون نگار کی کامیابی کی دلیل ہے۔ لیکن پھر بھی راقم کو ایسا محسوس ہوا کہ اس مضمون کو شامل کرنے کا جواز جناب شمس الرحمٰن فاروقی کی وہ توصیفی سند ہے، جو انھوں نے فضل تابش پر لکھے گئے مضمون کے سلسلے میں دی ہے۔

''شعر سچ بولتا ہے'' ظفر گورکھپوری پر لکھا گیا ایک عمدہ مضمون ہے۔ وہ عمر کی جس منزل پر ہیں ان کی شاعری اس سے آگے کی منزل طے کرتی نظر آتی ہے۔ ظفر گورکھپوری کے کمالاتِ شعری سے راقم کی تھوڑی بہت واقفیت ہے۔ مختار شمیم نے ان کی شاعری کی مختلف جہتوں کا احاطہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس مضمون میں مختار شمیم کی انشا پردازانہ صلاحیت کی جھلکیاں جابجا دیکھنے کو ملتی ہیں۔

متذکرہ چار مضامین (''شعر سچ بولتا ہے'' کو چھوڑ کر) کے حواشی کے مندرجات جناب مختار شمیم کے وسیع المطالعہ ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ پر دو مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ یہ دونوں تاثراتی نوعیت کے ہیں۔ نارنگ صاحب کی ادبی شخصیت پر لکھے گئے مضمون میں جناب مختار شمیم کا یہ ریمارک محلِ نظر ہے:

> ''اردو ادب میں واقعہ یہ ہے کہ اصل تنقید شبلی و حالی سے آگے
> جا ہی نہیں سکی ہے۔''

یہ بات طے ہے کہ آج اردو تنقید حالؔی وشبلؔی سے زیادہ ترقی یافتہ صورت میں ہے۔ باوجود یہ کہ اردو اور فارسی ادب کے حوالے سے حالؔی وشبلؔی کا کلاسیکی ذہن حد درجہ رچا ہوا تھا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم نے بھی ''مضامین نو'' کے ایک مضمون میں عصرِ حاضر کی اردو تنقید کے وقیع ہونے پر کھل کر گفتگو کی ہے۔ یہ بحث طویل ہے جس کا یہاں موقع نہیں ہے!

زبیر رضویؔ نئی نظم کا ایک معتبر نام ہے۔ اور اپنی ایک آزادانہ شناخت رکھتے ہیں۔ ''سبزۂ ساحل'' ان کی نظموں کا ایک بیش قیمت اور معیاری انتخاب ہے۔ اس انتخاب کے حوالے سے زبیر رضوی کی نظم گوئی پر گفتگو کر کے مختار شمیم نے اپنے Genuine اور Selective مطالعاتی ذہن کا ثبوت پیش کیا ہے۔

میں اردو ادب کے سنجیدہ قارئین سے مختار شمیم کے اس مضمون کو پڑھنے کی سفارش کرتا ہوں۔

مشمولہ تمام مضامین پر گفتگو کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ اپنی اس تبصراتی تحریر کو اس امید کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ اردو کے ادبی حلقہ میں مختار شمیم کے یہ کتاب دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔

........☆........

(۵)

● فہیم انور

'ترجمہ آئینۂ فردا میں' یعنی [Translation in the mirror of tomorrow] جناب ایم۔ علی کا شاہکار ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد قارئین کی ملاقات اصل ایم۔ علی سے ہوتی ہے۔ جیسے جیسے قاری اس کتاب کا مطالعہ کرتا جاتا ہے۔ ایم۔ علی پرت اندر پرت کھلتے جاتے ہیں۔ انہوں نے ''بدلتے زاویے'' بھی لکھی ہے۔ **مختار مشرقی** کا شعری مجموعہ ''**انتخابِ مختار مشرقی**'' ترتیب دیکر انہوں نے دوستی کا حق بھی ادا کیا ہے اور ایک وقیع ادبی سرمایے کو امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں ضائع ہونے سے بخوبی بچالیا ہے۔

''**کیف بھوپالی۔۔۔ کچھ یادیں کچھ باتیں**'' نامی انکی کتاب ابھی زیرِ ترتیب ہے۔ انہوں نے متعدد گرانقدر ادبی کارنامے انجام دئے ہیں اور مستقبل میں بھی انکا یہ ادبی سفر جاری وساری رہے گا لیکن انکے ادبی سفر میں ''**ترجمہ آئینۂ فردا میں**'' کو ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے اور رہے گی۔ میرے خیال سے انکی شخصیت کا جائزہ اگر اس کتاب کے حوالے سے لیا جائے تو اصل ایم۔ علی تک رسائی ہو سکتی ہے۔ یہ کتاب بلا شبہ انکی شناخت بھی ہے اور انکا طرۂ امتیاز بھی۔

ایم۔ علی کا مطالعہ کافی وسیع، عمیق اور بسیط ہے۔ وہ صرف پڑھنا ہی نہیں جانتے بلکہ اپنے مطالعے کو

موزوں الفاظ کا جامہ پہنا کر قارئین کے لئے قرطاسِ ابیض پر سجانا بھی جانتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مطالعے کو سب کے ساتھ شیئر بھی کرنا چاہتے ہیں۔ ترجمہ کے بارے میں کافی سنجیدہ ہیں۔ اپنی اس کتاب میں انہوں نے ترجمہ کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ اسکی قانونی، ادبی، تاریخی، جغرافیائی اور تکنیکی حیثیتوں کا ذکر بھی جم کر کیا ہے۔ ترجمہ کے سلسلے میں یہ کتاب انکے تجربات، مشاہدات اور مطالعات کا نچوڑ یا ملخص ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ یہ کتاب تسلسل اور تواتر کے ساتھ نہیں لکھی گئی ہے بلکہ مختلف اوقات میں ترجمے کے سلسلے میں رقم کردہ انکے گراں قدر مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں اہم مترجمین کے ناموں اور انکی ادبی کارگزاریوں کا تذکرہ بڑے سلیقے سے کیا گیا ہے۔ ترجمہ کے اصولوں، نظریات، افکار، خیالات، ضروریات، استفسارات، مسائل اور انکے سدِ باب پر خاصی بحث کی گئی ہے۔ اچھے عناوین قائم کئے گئے ہیں اور ان پر کھل کر گفتگو بھی کی گئی ہے۔ یہ ذکر آیا ہے کہ کن کلاسیکس کا ترجمہ کس نے کیا ہے اور وہ اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب یا ناکام رہا ہے۔ ادب کے سنجیدہ قارئین نے انکے تراجم کو قبول کیا یا مسترد۔ کسی کسی ادب پارے کا ترجمہ دو یا تین مترجمین کے ذریعہ کئے جانے کا نہ صرف ذکر کیا گیا ہے بلکہ انکا تقابل اور موازنہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ ایم علی نے خود بھی متعدد انگریزی اور بنگلہ نظموں کے منظوم ترجمے کئے ہیں۔ جو اس کتاب کے قیمتی صفحات کی زینت ہیں۔ چند نثر پاروں کے تراجم بھی ایم علی نے پیش کئے ہیں جن سے انکی غیر معمولی ذہانت، فطانت اور لیاقت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

مختلف زبانوں مثلاً انگریزی، فرانسیسی، بنگلہ اردو اور بھوجپوری زبانوں کے چند الفاظ اور دیگر زبانوں میں انکے مترادفات و متبادلات کی موجودگی، عدم موجودگی، اطمینان بخش ترجمانی یا نامناسب و غیر مناسب ترجمانی سے کافی دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ ایم علی کا اندازِ بیان خاکسارانہ اور معروضی ہے۔ وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں Ardent ہو کر کہتے ہیں نہ خود بذبذب کا شکار ہوتے ہیں نہ قارئین کو تشکیک کا شکار ہونے دیتے ہیں۔ انکے یہاں ایک بات جو شدت کے ساتھ کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ انکی کچھ باتیں مبنی بر قیاس ہیں کہیں کہیں انہوں نے قیاس آرائیوں سے بھی کام لیا ہے۔ انکے یہاں جو بسیط مطالعہ ہے اسکی بنیاد پر انہیں اپنی باتیں دوٹوک انداز یا Authentic Way میں کہنی چاہیئے تھی۔ سطر سطر میں معلومات کا ایک کشادہ دریا اپنی سبک سارروانی کے ساتھ سرچشمے سے دہانے تک بہتا دکھائی دیتا ہے۔ موضوع سے متعلق بہت چھان بین اور غور و خوض کیا ہے انہوں نے اس لئے اطلاعات Informations کی کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ ایک ذمہ دار مصنف اور مترجم کے فرائض علی صاحب نے بطرزِ احسن نبھائے ہیں۔ ادب سے معمولی شغف رکھنے والا قاری بھی دورانِ مطالعہ کسی قسم کی اکتاہٹ یا قباحت محسوس نہیں کرتا بلکہ اسکی یہ خواہش ہوتی ہے کہ بس دو یا تین نشستوں ہی میں وہ اسکی ورق گردانی مکمل کرلے کیونکہ قارئین کو دیر تک باندھے رکھنے کی صلاحیت انکی تحریروں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ دلچسپ معلومات قارئین پر اپنی گرفت مضبوط کئے رکھتی ہیں۔ ایک قاری جیسے جیسے یہ کتاب پڑھتا جاتا ہے اسکے اندر تجسس بڑھتا ہی جاتا ہے۔ ہاں یہ ایک الگ بات ہے کہ ادب یا ترجمہ سے اسکا فطری لگاؤ بھی اس میں

بہت حد تک کام کرتا ہے۔

ترجمہ کے سلسلے میں کتاب کے مصنف نے مناسب اور متنوع سوالات قائم کئے ہیں اور ایک حد تک انکے تشفی بخش جوابات دینے کی حتی الامکان سعی کی ہے۔ مثلاً ترجمہ کیا ہے؟ ترجمہ کیوں کب اور کیسے؟ ترجمہ کی ضرورت اہمیت اور اقسام کے بارے میں بھی انہوں نے سوالات اٹھائے ہیں۔اس میں ارسطو کی مشہور کتاب بوطیقا اور انکے تراجم کا ذکر ملتا ہے۔کلیلہ و دمنہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔رابندر ناتھ ٹیگور، نیاز فتح پوری ،فراق گورکھ پوری ،شان الحق حقی ،ف س اعجاز اور علامہ شبلی کو بحیثیت ترجمہ نگار نہ صرف پیش کیا گیا ہے بلکہ انکے ترجموں کی مثالیں بھی پیش کی گیس ہیں۔رابندر ناتھ ٹیگور کے Self Translation گیتا نجلی کا ذکر کیا گیا ہے۔اسکا پیش لفظ انگریزی زبان کے معروف شاعر ٹی ایس ایلیٹ نے لکھا تھا لیکن جن صاحب نے رابندر ناتھ ٹیگور کے انگریزی ترجموں پر اعتراض کیا تھا۔انکے تراجم میں لسانی غلطیوں کی نشاندہی کی تھی۔انکا تذکرہ بھی ایم علی نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ساہتیہ اکیڈمی کے ایک ورکشاپ کا ذکر کرتے ہوئے ایم علی نے ڈاکٹر مظفر حنفی، جناب احسن شفیق اور جناب کلیم حاذق وغیرہ کے نام بھی لئے ہیں۔

جناب کیف بھوپالی کے ذریعہ کئے گئے سورہ فاتحہ کے منظوم ترجمے کا ذکر جہاں ایم علی نے کیا ہے وہاں انکے دو مصرعوں **'کسی کا مشورہ ہوگا نہ کوئی درمیاں ہوگا' اور 'تجھے آتی ہے اپنی آرزومندوں کی دلداری'** کے بارے میں بتایا ہے کہ ملمع کی طرح چمک کر رہ گئے ہیں اور اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔مگر میں سمجھتا ہوں کہ جناب کیف بھوپالی نے بدرجۂ مجبوری ایسا کیا ہے اور مترجم کو اتنا اختیار تو ہونا ہی چاہئے کہ بوقت ضرورت وہ ہلکی پھلکی ترمیم تنسیخ حذف اور اضافے سے کام لے۔

ماہنامہ انشاء کے مدیر جناب ف س اعجاز نے انگریزی کی چند منظوم سطروں کا جو منظوم اردو ترجمہ کیا ہے، انکا ترجمہ جناب ایم علی نے بھی کیا ہے۔اس کتاب میں منظوم انگریزی سطروں کے ساتھ دونوں کے منظوم تراجم بھی موجود ہیں۔میں یہاں بوجوہ انگریزی نظم کے حصے اور دونوں مترجمین کے منظوم اردو تراجم نقل کرتا ہوں اور فیصلہ قارئین کے صواب دید پر چھوڑتا ہوں:

The passers-by won't answer,
I dont know what to do,
I am freezing here since morning,
For only twenty sou.

جناب ف س اعجاز صاحب کا ترجمہ: راستہ چلتے لوگ بھی چپ ہیں
بجھ گئے میری آرزو کے دئے
صبح سے میں بھٹک رہی ہوں یہاں
بیس روپیوں کی اک رقم کے لئے

☆☆☆

جناب ایم علی کا ترجمہ: گزرنے والے جواب دینے سے مجھکو قاصر
کروں بھی کیا میں سمجھ نہ پاؤں
کہ صبح ہی سے ٹھٹھر رہی ہوں
میں بیس روپیوں ہی کی خاطر

☆☆☆

مغربی بنگال کے ایک کامیاب مترجم جناب شوکت عظیم کا ذکر اچھے لفظوں میں جناب ایم علی نے اس لئے کیا ہے کہ انکے گراں قدر مشوروں کو تسلیم کرتے ہوئے انہوں نے بنگلہ کی ایک نظم برشا۔۹۸ کا ترجمہ دوبارہ کیا۔

سترہ عنوانات قائم کر کے ترجمہ کے ضمن میں مصنف نے خامہ فرسائی کی ہے۔ جن میں دنیا کی پہلی زبان اور ترجمہ، لفظ ترجمہ کی حقیقت، ترجمہ نگار اور ترجمان، تھیوڈ اور اس کا نظریہ ترجمہ، بھارت میں ترجمہ اور تحریر کی ابتدا، شاعری کا ترجمہ۔ مسائل اور حل، کلامِ الٰہی کا ترجمہ لسانی تقابل کے تناظر میں، ترجمہ کی اہمیت اور اسکی آئینی حیثیت، شعری تخلیق کا نثری ترجمہ، ۱۹ ترجمہ نگار ایک تجربہ گاہ میں، مشینی ترجمہ کی ابتدا، ترجمہ نگاروں کا مقام کل اور آج، اور ترجمہ کا فن کافی اہمیت و افادیت کے حامل ہیں۔

صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ، جناب ابوالکلام قاسمی نے تاثرات کے عنوان سے بجا طور پر اعتراف کیا ہے کہ ایم علی نے اس کتاب میں اپنی برسوں کی ریاضت کا لب ولباب جمع کر دیا ہے۔

اب ایم علی صاحب کی کتاب سے کچھ ایسی معلومات افزا باتیں نقل کر رہا ہوں جنہیں پڑھنے کے بعد قارئین کے اندر یہ تشویق ضرور پیدا ہوگی کہ کم از کم ایک دفعہ وہ اس کتاب کا مطالعہ لازمی طور پر کر لیں، خصوصاً وہ افراد جو تفنن طبع یا کسی خاص مقصد کے تحت وقفے وقفے سے ادب پاروں کا منظوم یا منثور ترجمہ کر لیتے ہیں:

☆ آدم ہی رسم الخط کے موجد تھے ☆ قیاس آرائیاں کی جاسکتی ہیں کہ ساری زبانوں کا منبع اور مخرج کوئی ایک زبان ہی رہی ہوگی ☆ ابنِ منظور کی کتاب کا نام لسان العرب ہے ☆ Shelta آئرلینڈ کی ایک خانہ بدوش قوم کی زبان تھی ☆ ابوریحان البیرونی ایک سیاح تھا جس کو ہندوستانی تہذیب وتمدن اور زبان کی کشش یہاں کھینچ لائی، وہ بڑا علم دوست تھا۔ اس نے اپنے یہاں قیام کے دوران سنسکرت زبان سیکھی اور ایک دن ایسا آیا جب سنسکرت کے علماء اسے وِدیا ساگر کے نام سے یاد کرنے لگے ☆ All history is a fiction that is partly invented یعنی تاریخ حقیقت اور افسانے کا مجموعہ ہے ☆ جب لفظی ترجمہ میں معنیٰ افشانی ناکام ہو جاتی ہے تو معنوی ترجمہ کا سہارا لیا جاتا ہے ☆ محترم شان الحق حقی ایک قابلِ اعتبار مصنف، بلند پایہ شاعر، انتہائی کامیاب مترجم اور مستند صاحب لغت ہیں ☆ اگر متن میں طویل جملے ہیں تو انہیں بذریعہ تکسیر چھوٹے چھوٹے جملوں کی مدد سے ترجمہ کرنا چاہیئے ☆ Itmar Evan Zohar ایک تل ابیب باشندہ تھا، اسے فن، ترجمہ، عبرانی زبان و ادب اور تاریخ سے کافی دلچسپی تھی ☆ جو ترجمہ ہے وہی عبارت ہے، جو عبارت ہے وہی ترجمہ ہے ☆ کیا

مشینیں ترجمہ کی صلاحیت رکھتی ہیں؟ ☆ کیا مشینیں انسانوں جیسا ترجمہ کرسکتی ہیں؟ مشینی ترجمے خامیوں سے یکسر پاک نہیں ہو سکتے ☆ مورس ونیٹیز ہسٹری آف انڈین لٹریچر کا مصنف ہے ☆ بائرن ایک ایسا شاعر ہے جسے ترجمہ نہیں کیا جاسکتا ☆ کیٹس کی شاعری ترجمہ کی گرفت میں نہیں آسکتی ☆ شاعری کا ترجمہ کوئی سہل کام نہیں بلکہ انتہائی کٹھن اور صبر طلب ہے ☆ بے شک ترجمہ نگاری ایک دشوار کن عمل ہے لیکن اتنا دشوار بھی نہیں کہ اسے ناممکن قرار دے دیا جائے ☆ ایک ایسا ترجمہ نگار جو تخلیقی قوتوں کا حامل ہو اور رموز سخن سے پوری طرح آگاہ بھی ہو تو اس کی ترجمہ نگاری تخلیقی عمل کے ہم قدم ہو جاتی ہے ☆ دورانِ ترجمہ وقتاً فوقتاً ایسے مسائل بھی ابھرتے ہیں جن کا حل نکالنا انگلیوں سے پتھر توڑنا ہے ☆ ارسطو کی مایہ ناز کتاب بوطیقا کے سو سے زائد انگریزی ترجمے ہو چکے ہیں، اردو زبان میں بھی اسکے سات آٹھ ترجمے موجود ہیں انگریزی زبان میں بوچر کا ترجمہ اسکا کامیاب ترجمہ ہے ☆ الکزینڈر پوپ نے ہومر کی کتاب الیڈ کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا ہے لیکن پوپ کا ترجمہ اپنے اصل سے بہتر ثابت ہوا ☆ ترجمہ نگاری کی بنیاد اسی وقت پڑ گئی تھی جب انسانوں نے جماعتی زندگی گزارنے کا شعور حاصل کیا ☆ ایک غیر شاعر شاعری کا ترجمہ نہیں کرسکتا ☆ ہوائینس (Hawaiians) زبان میں شکر قند کے لئے ۱۰۸ الفاظ، ماہی گیروں کے جال کے لئے ۶۵ اور کیلے کے لئے ۴۷ الفاظ ہیں، البانی زبان میں مونچھ اور بھوؤں کیلئے ۲۷، ۱۲۷ الفاظ ہیں ☆ غالب کا ترجمہ غالب کی شاعری کی طرح کٹھن ہے ☆ جب کسی نظم کے ترجمہ کے وقت اکتا دینے والی کیفیت ہو جائے اس نظم کے ترجمہ سے کچھ دنوں کے لئے دستبردار ہو جانا چاہئے ☆ پمپا کنڑ زبان کا شاعر اور مترجم تھا، کنڑی کی تاریخ ادب میں اسے آدی کوی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کیونکہ اس نے اس زبان میں سب سے پہلے مہابھارت کا ترجمہ کیا تھا، کچھ لوگ اسے آدی انو وادک بھی کہتے ہیں ☆ بھوجپوری زبان کے لفظ لسرانا، اردو کے جنون اور بنگلہ کے ابھیمان کا بدل نہ اردو میں ہے نہ انگریزی میں ☆ عربی زبان فصاحت بلاغت میں اپنا جواب نہیں رکھتی، اس میں جتنی گہرائی و گیرائی ہے وہ دنیا کی کسی زبان کو نصیب نہیں، یہ ظالم کے ہاتھ سے تلوار گرا سکتی ہے، بیباک زبانوں کو گنگ کرسکتی ہے، اسکی سامعہ نوازی اور اثر انگیزی کے واقعات بڑے مشہور ہیں، نیتِ قتل کو جاں بخشی میں بدل دیتی ہے ☆ سترہویں صدی ہی میں ترجمہ کو ایک الگ شعبہ علم تسلیم کرتے ہوئے درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا ☆ ALTA یعنی American Literary Translation Association اس سلسلے کا مشہور فعال عالمی ادارہ ہے ☆ آج ترجمہ ایک آزاد اور اہم شعبہ علم ہے ☆ کل کا دور ترجمہ کا دور ہوگا ☆ پال اینگل کے مطابق شائد ایک دن روئے زمین پر موجود ساری مخلوق کی بقا کا انحصار لفظوں کے فوری ترجمہ پر ہوگا، زندگی کے بقیہ سالوں میں بس ایک ہی جملہ Translate or die توجہ طلب ہوگا ☆ ترجمہ نگاری بھی ایک عجیب مشغلہ ہے، کہیں اسکا سفر بہ آسانی طئے ہو جاتا ہے تو کہیں پاؤں پر چھالے پڑ جاتے ہیں ☆ سولہویں صدی میں فرانس کے ایک ترجمہ نگار کو موت کی سزا سنائی گئی، اسکا جرم بس یہی تھا کہ اس نے افلاطون کی ایک کتاب کا ترجمہ کرتے وقت قدرے آزادی سے کام لیا تھا، اس کا نام Etieme Dolet تھا

☆ انگلستان کے ولیم ینڈل کو موت کی سزا سنائی گئی، آج بھی اسے شہیدِ ترجمہ کے نام سے یاد کرتے ہیں ☆ موجودہ صدی کچھ تاخیر ہی سے سہی ترجمہ نگاروں کے نام سے منسوب کی جاسکتی ہے ☆ مشہورِ زمانہ فلسفی اور عالمِ ادب ژاک دریدا نے ایک مرتبہ کہا تھا لفظوں کا نہیں بلکہ مفاہیم کا ترجمہ ہونا چاہیئے ☆ وہ حزف و اضافہ جس سے تخلیق کی روح مجروح نہ ہواس کی اجازت ملنی چاہیئے ☆ ترجمہ اصل سے بہتر ہو جائے تو بھی ترجمہ ہی رہتا ہے۔

اپنے اس مقالے کی آخری سطور میں علی صاحب کی کتاب میں در آئی چند لسانی قباحتوں، اسقام، تسامحات اور فرو گذاشتوں کی طرف صفحہ نمبر کے ساتھ اس لئے اشارہ کرنا چاہوں گا کہ آئندہ اڈیشن میں انکی اصلاح کر لی جائے اور ترجمہ کے موضوع پر اتنی وقیع اور اہم کتاب کچھ حد تک عیوب و اسقام سے پاک ہو جائے۔ میرا مقصد تنقید برائے تنقید یا تنقیص نہیں بلکہ تنقید برائے اصلاح ہے:

☆ اسکی تنقید کی بنیاد سائنسی اصولوں پر مبنی تھی۔ صفحہ نمبر ۱۴ (بنیاد اور مبنی ایک ساتھ نہیں لکھنا چاہیئے کیونکہ دونوں الفاظ ایک ہی معنی دیتے ہیں اسے انگریزی میں Superfluous کہتے ہیں۔ یہاں ایسا لکھنا مناسب ہوتا۔ اسکی تنقید کی بنیاد سائنسی اصولوں پر تھی یا اسکی تنقید سائنسی اصولوں پر مبنی تھی)

☆ اس نے اپنی تحریر کے ابتدائی سطروں ہی میں۔ صفحہ نمبر ۳۰ (لفظ سطور چونکہ مونث ہے اس لئے ؛اس نے اپنی تحریر کی ابتدائی سطروں ہی میں ہونا چاہیئے کے ابتدائی سطروں میں نہیں) ☆ بوقتِ ترجمہ ایسے مصرعے اور سطور آجاتے ہیں صفحہ نمبر ۳۶ (مصرعے کے لئے ایسے ٹھیک ہے لیکن سطور کے لئے آجاتی ہیں ہونا چاہیئے آجاتے ہیں نہیں کیونکہ حرفِ عطف اور اس جملے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے) ☆ اوّل متن کی موجودگی دوئم متبادلات کی تلاش۔ صفحہ نمبر ۴۰ (لفظ دوم ہے دوئم نہیں) ☆ روسی اور فرانسیسی نظریہ سازوں نے متن کی حصار سے نکلنے کی کامیاب کوششیں کیں۔ صفحہ نمبر ۴۶ (کی حصار کی جگہ کے حصار استعمال ہونا چاہیئے)

☆ شرابِ گل کی ہو لذت خدا کا حمد بھی ہو۔ صفحہ نمبر ۶۰ (یہاں خدا کا حمد کی جگہ خدا کی حمد ہونا چاہیئے) ☆ جو آیاتِ کریمہ اتنے صفات کے حامل ہوں صفحہ نمبر ۹۷ (اس جملے میں اتنے کی جگہ اتنی اور کے کی جگہ کی ہونا چاہیئے) ☆ سورۂ یوسف کے آیت نمبر ۲ میں (سورۂ یوسف کی آیت نمبر ۲ لکھنا جائز ہے) ☆ متن کے قرائت کے ساتھ ساتھ صفحہ نمبر ۹۸ (متن کی قرائت کے ساتھ ساتھ) ☆ اسباب کی بناء پر انکے رنگ و روپ اور قد و قامت میں فرق آجاتا صفحہ نمبر ۱۰۵ (رنگ و روپ کے درمیان واؤ عطف کا استعمال جائز نہیں۔ یہاں واؤ عطف کی جگہ لفظ اور کا استعمال مناسب ہوتا) ☆ پانئی کی تحریر جو ایک جامع اصولوں کے تحت وجود میں آئی تھیں صفحہ نمبر ۱۰۹ (اس جملے کو مندرجہ ذیل دو طریقوں سے لکھا جاتا تو اسکی لسانی قباحتیں دور ہو جاتیں۔ پانئی کی تحریر جو ایک جامع اصول کے تحت وجود میں آئی تھی یا پانئی کی تحریریں جامع اصولوں کے تحت وجود میں آئی تھیں) ☆ ایسی لغت تیار کر رہے ہیں صفحہ نمبر ۱۱۰ (لفظ لغت مذکر ہے مونث نہیں لہٰذا اس کے لئے ایسا استعمال ہونا چاہیئے ایسی نہیں، اس لفظ کی جنس

کے بارے میں لوگ اکثر دھوکہ کھا جاتے ہیں) ☆انجمن ترقی اردو کے خدمت کبھی فراموش نہیں کیے جا سکتے صفحہ نمبر ۱۲۰(جملہ سرے سے غلط ہے یوں لکھنا مناسب ہوتا۔ انجمن ترقی اردو کی خدمات کبھی فراموش نہیں کی جا سکتیں) ☆بفضلہ تعالیٰ اب اسکے سارے بندوں کا ترجمہ ہو چکا ہے صفحہ نمبر ۱۲۹(انگریزی کے لفظ Stanzas کے لئے صرف بند لکھنا ہی کافی تھا، لفظ سارے جمع کے صیغہ کو ظاہر کر دیتا اس کے لئے بندوں لکھنا ضروری نہیں تھا) ☆صبو کے تہ سے بھی سارا افیم پی ڈالا صفحہ نمبر ۱۳۵(صبو کا یہ املا درست نہیں ہے س سے سبو لکھنا چاہئے اور کے تہ سے نہیں بلکہ کی تہ سے لکھنا درست ہے)وغیرہ وغیرہ۔ اب اپنی اس خام تحریر کو ترجمہ سے متعلق دو علماء کے اقوال پر سمیٹنا چاہوں گا:

A translation should be true to the translator not less than to be original

(A.K.Ramanujan)

Translation is always the reverse side of a Kashmiri Shawl. [?]

'آمد' میں اپنے کاروبار، ادبی، سماجی اور دیگر سرگرمیوں / کتابوں / اداروں کا اشتہار دے کر بین الاقوامی شہرت اور ہمہ جہت رابطے کو یقینی بنائیں۔ (ادارہ 'آمد')

☆☆☆

اعزازی کاپی بھیجنے سے ادارہ قاصر ہے۔ اس لیے 'آمد' کے مالی استحکام اور اس کے تسلسل کے پیشِ نظر خریداری قبول فرمائیں۔ ازراہِ کرم اسے اپنی ادب دوستی اور اردو نوازی پر محمول کریں۔

☆☆☆

شہرِ خیر و خبر

مکتوبات

● **اقبال مجید، بھوپال[مدھیہ پردیش]** : 'ادب کی جمہوریت' کے عنوان سے آپ نے جو سوالات اٹھائے ہیں وہ ہماری آج کی ادبی ثقافت کی منظرنامے کی ہی پیداوار ہیں، کیوں کہ جیسی ہماری ادبی ثقافت ہوگی ویسے ہی ہمارے ادبی فیصلے بھی ہونگے۔ آج کی ادبی ثقافت میں ناقد کا منصب مٹھ آدھیش کا سا ہے، جس کے ذمے الفاظ کا وارث ہونے کا کام کم، ادب کی اقلیم کا .M.D مینیجنگ ڈائرکٹر ہونا زیادہ ہے۔ ادب کے ادارے اکیڈمک نہ ہوکر کارپوریٹ کے خواص زیادہ رکھتے ہیں۔ آپ کے سوالات اپنی جگہ مگر بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا کیوں کہ نئے اذہان انھی Managing Directors کی چھتر چھایا میں ہی پروان چڑھ رہے ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ زمانے کی اتھل پتھل نے ہماری ثقافتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے نئی نئی ایجنسیاں بھی پیدا کردی ہیں اس لیے ادب ہماری ثقافتی ضرورتوں کو پورا کرے یا نہ کرے ہماری اولادوں کو اس کی زیادہ فکر نہیں ہے۔ جناب، جب ادب کا وہ کلچر ہی Outdated ہو چکا جو تعصبات کے بغیر ادبی بحث وتمحیص کو رائج کرتا ہے اور اب اس کے بغیر بھی ہمارے ادب میں روزانہ خود کو ہچیں دیگرے نیست کہنے والوں کے پیدا ہونے کا سلسلہ جاری ہے تو پھر فضول بحث وتمحیص کی دماغی ورزش کیوں کی جائے۔ حضور، ہمکو تو وقت نے اُس جگہ پر پہنچا دیا جہاں ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے یہ کہہ کر سب کچھ کنارے رکھ دیا جاتا ہے کہ ۔ 'ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا'۔ انور معظم کا مضمون میرے لیے بہت گاڑھا ہے، اس کو اور آسان بنا کر ہم جیسے قارئین کے لیے انھیں لکھنا چاہیے۔ ہم تو وہ ہیں جن کے زیرِ مطالعہ نہ قران مجید کی حکمت رہی ہے نہ فطری علوم وفلسفہ، نہ علم تفسیر و دینیاتی علوم سے ہی کوئی شغف رہا ہے۔ انور کے پاس اس موضوع کو لے کر بلاشبہ اتنی معلومات ہے کہ وہ اسے ہم جیسوں کے لیے اس طرح لکھ سکتے ہیں کے ہم اس کا بڑا حصہ انگیز کرسکیں۔ انھوں نے بہت سے فلاسفہ، شیوخ، صوفیا، علما اور حکما کے نام لیے ہیں جن کی تاریخ ساز اعلیٰ خدمات اور تعاون کا ہمکو اندازہ ہی نہیں۔ یہ ایک بہت وسیع موضوع ہے۔ یہاں انھوں نے دریا کو کوزے میں بند کیا ہے۔ میری ان سے درخواست ہے کہ ''آمد'' کے صفحات پر اسی کوزے کو اب دریا میں بند کرنے کا کام کچھ قسطوں میں کرڈالیں تو ہم جیسے کم علموں پر ان کا احسان ہوگا[؟]۔ ہمارے معاشرے کے ایسے مسائل جو آج بھی خاصی اہمیت کے حامل ہیں مثلاً قومیت کا مثبت تصور، ہندو مسلم اتحاد، مسلم تشخص پر مسلمانوں کا غیر معقول اصرار، لفظ جہاد اور قتال و تشدد کی شر پسندی میں واضح فرق، توہینِ رسالت اور مسلمانوں کی جاہلانہ جذباتیت وغیرہ کے موضوعات پر مولانا آزاد کے فکر انگیز اور علم افروز بیانات کو شافع قدوائی نے 'الہلال' اور 'البلاغ' کی جلدوں سے بڑی عرق ریزی کے ساتھ تلاش کرکے اُن

ماخذات کو آج کے قارئین کے لیے ایک بار پھر بصیرت افروز بنا دیا ہے، اُس پر خلوص کاوش کے لیے ہمیں بلاشبہ شافع صاحب کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ یہ تمام ماخذات مولانا کی خلاّقیت اور فطانت کی لازوال قوت سے لبریز تو ہیں ہی اس کے ساتھ مسلمانوں کی موجودہ معاشرتی قومی اور مذہبی کوتاہ اندیشی کو دیکھتے ہوئے ہمارے لیے آج بھی منارۂ نور کا کام دے رہے ہیں۔ میری جانب سے شافع صاحب کو دلی مبارکباد۔ مصطفیٰ کریم صاحب کے مضمون سے اندازہ ہوا کہ بڑا ناول لکھ لینا ہی کافی نہیں بلکہ غیر ملکی زبانوں میں اس کا ترجمہ کرنے والا بھی پیدا ہونا چاہیے جو دوسرے ملکوں میں اسے مقبول بنا سکے۔ یہ عقدہ تو کھلا کہ ناول میں عقیدہ کی بڑی اہمیت ہے لیکن یہ پتا نہ چلا کہ ٹالسٹائی کی طرح قرۃ العین کے یہاں آئیڈیل ازم میں عقیدہ ہے یا جوائس کی طرح Materialism میں، یا دونوں میں سے کسی میں بھی نہیں؟ اس سوال کا بھی جواب نہیں ملتا کہ کیا ناول کی مقامی اہمیت نہ ہونے پر بھی اسے آفاقی اہمیت حاصل ہو سکتی ہے؟ اس مضمون میں اس نکتے پر بھی روشنی نہیں پڑتی کہ 'آگ کا دریا' یا 'کئی چاند تھے سرِ آسماں' دیگر خوبیوں کے باوجود یولیسس کی عظمت کے درجے کو کن اسباب کے تحت نہیں پہنچ سکے؟ یہ الگ بات ہے کہ 'یولیسس' لکھے جانے کا تفصیلی نسخہ اور فارمولا اگر ہمیں معلوم بھی ہو جائے تو اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ ہم یولیسس لکھ بھی لیں گے۔ تنقید جس فیصلہ کن لہجے سے پرہیز کرتی ہے رحمان عباس نے اس لہجے میں کچھ فیصلہ کن باتیں کہہ دی ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ خود کو کسی ایک نکتے پر تادیر ٹھہرا کر پورے ارتکاز کے ساتھ غور کرنا پسند نہیں کرتے۔ پریم چند پر بات کرتے کرتے قرۃ العین کی شعور کی رَو انھیں یاد آجاتی ہے، پھر دو جملوں کے بعد اسے بھول جاتے ہیں۔ بقولِ مجاز:

اس کنارے نوچ لوں اور اُس کنارے نوچ لوں ❖ ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں

انکے کئی دعوے ہیں، مثلاً : (۱) قرۃ العین کا اسلوب ناول کے حق میں زیادہ کارگر نہیں۔ (کیوں کارگر نہیں، اس پر بھی بات ہو جاتی تو خوب ہوتا، یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ کون سا اسلوب کارگر ہوتا)۔ (۲) ترقی پسندوں کی سپاٹ سماجی حقیقت نگاری نے ناول کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچایا ہے۔ (کیسے؟ کسی نمائندہ ترقی پسند ناول کو لیکر وضاحت ہو جاتی تو اچھا تھا)۔ (۳) ہر ناول ایک ایسا تجربہ، احساس یا حقیقت ہوتی ہے جو سابقہ ناولوں سے کُلی طور پر الگ ہوتی ہے۔ (تو کیا تجربہ یا احساس یا حقیقت کی سطح پر کوئی ناول ہمارے یہاں قابلِ ذکر نہیں جو سابقہ ناول سے کُلی طور پر الگ رہا ہو؟ ڈپٹی نذیر احمد کے سابقہ ناول سے کیا کوئی ناول؟ کُلی طور پر الگ ہے، اگر نہیں تو کیوں؟)۔ (۴) ناول پر تنقید بے حد محنت اور جاں کنی کا کام ہے اور اس کام میں محمد حسن عسکری اور وارث علوی تک تماشائی رہے ہیں۔ (کاش کسی ایک ناول پر ہی اس مضمون میں بے حد محنت اور جاں کنی کے ساتھ تنقید کی گئی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا)۔ ایک سوال یہ کیا گیا ہے کہ تم ناول کیوں پڑھتے ہو؟ میرے خیال میں اس سوال کا جواب ابنِ صفی کو معلوم تھا، اس لیے وہ مہینے میں چار ناول لکھ لیا کرتے تھے اور وہ سب پھٹا پھٹ پڑھ لیے جاتے تھے۔ لیکن اکثر لکھنے والوں کو یہ معلوم نہیں ہوا کرتا کہ ناول کیوں پڑھا جاتا ہے۔ البتہ انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ناول کیوں لکھتے ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ جس سبب سے عمر ناول لکھتا ہے زید اس سبب سے نہیں لکھتا بالکل اس طرح سے یہ بھی درست ہے کہ جس سبب سے حامد ناول

پڑھتا ہے احمد نہیں پڑھتا۔ ظفر گورکھپوری، غضنفر، رئیس الدین رئیس کی بعض غزلوں کی ردیفیں مزہ دے رہی ہیں، وہاب صاحب پر محمود ہاشمی کا مضمون پرانے راگ پر قائم ہے۔ صفدر امام قادری کا شخصی خاکہ خوب ہے۔ ہمایوں صاحب کے مضمون سے علم ہوا کے وہاب صاحب افسانہ نگار بھی تھے۔ ایک آدھ افسانہ بھی شامل ہو جاتا تو اچھا ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ ابن صفی کے قلم نے جاسوسی ناول کو فنّی خوبیوں سے مزیّن کرنے کے علاوہ زبان و بیان کے اعتبار سے معتبر بنا کر اس کو دلچسپی اور تجسّس کی خوبیوں سے مالا مال کیا اور اس صنف کو قبولیت کا وہ درجہ دلایا جس کی اردو میں مثال نہیں ملتی۔ مگر اب جب کہ لمبے عرصے سے بھولے ہوئے اس فن کار کو پھر سے یاد کیا جا رہا ہے تو بعض لوگ جوشِ عقیدت میں اس کا مرتبہ بڑھانے میں اُن حدود کو بھی پار کرنے لگے ہیں جو اعلیٰ ادب کے نوجوان طالب علموں کو غلط پیغام پہنچا سکتی ہیں۔ ایسے موقعے پر ان طلبا کو مجنوں گورکھپوری کا مضمون نہیں بھولنا چاہیے۔ ابن صفی کی ناول میں ادبی عناصر تلاش کرتے وقت ہمیں نوجوانوں کو یہ بتانا چاہیے کہ جاسوسی ادب اور اعلیٰ ادب اپنے سماجی سروکاروں سے پہچانا جاتا ہے۔ [؟] اسی لیے ابنِ صفی اور دواستائیوسکی کے سروکاروں میں زمین آسمان کا فرق ہوا کرتا ہے۔ جبکہ واقعات کی سطح پر واستائیوسکی کی ناول Crime and Punishment میں بھی وہی ہوتا ہے جو ابنِ صفی کی بیشتر ناولوں میں ہوا کرتا ہے۔ یعنی پہلے ایک سنسنی خیز قتل ہوتا ہے، پھر دونوں کے یہاں پولیس یا خفیہ پولیس وغیرہ حرکت میں آ جاتی ہے پھر دونوں کے یہاں مجرم آخر کار اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ دونوں تحیّر و تجسّس کے عناصر کو جگہ دیکر ناول کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اتنی باتیں دونوں کے یہاں مشترک ہونے کے باوجود آخر وہ راز کیا ہے جو ایک کو جاسوسی ناول اور دوسرے کو ادبی ناول بناتا ہے یا ایک کو ابن صفی اور دوسرے کو داستائیوسکی بناتا ہے۔ اس موقعے پر ہمیں گفتگو کرتے ہوئے یہ بھی ضرور بتانا چاہیے کہ ایک کا سروکار یہ ہے کہ وہ خون ہونے کے تحیّر انگیز حالات کو دلچسپ بنا کر بیان کرے اور آگے بڑھ جائے جبکہ دوسرے کے یہاں خون ہونے کے معاشرتی، اخلاقی و نفسیاتی وجوہات کی تفصیلات میں جانا اہم ہے۔ ایک کے یہاں صرف ایک فرد بہ حیثیت قاتل گرفتار کیا جاتا ہے جب کہ دوسرے کے یہاں محض ایک مجرم ہی نہیں بلکہ پورا جرم ایک ادارہ بن کر کٹہرے میں کھڑا کیا جاتا ہے اور گرفت میں لیا جاتا ہے۔ ایک کے یہاں محض گوشت پوست کا ایک آدمی گرفت میں آتا ہے جبکہ دوسرے کے یہاں اس آدمی کے وسیلے سے انسانی کردار کی پیچیدگیوں اور اس کے رشتوں کی تہداریوں کو گرفت میں لیا جاتا ہے۔ ایک کے ناول کے اندر داخل ہونے کے بعد قاری اس سے صحیح و سالم واپس باہر آ جایا کرتا ہے اور مطمئن ہوتا ہے کہ چلو کچھ وقت کٹ گیا لیکن دوسرے کے اندر سفر کرنے والے باشعور قاری کے باطن میں اکثر کچھ ٹوٹ پھوٹ بھی ہو جایا کرتی ہے۔ ایک کا تحفہ محض تفریح اور وقت گزاری ہے تو دوسرے کا حال عرفان و آگہی میں اضافہ۔ معذرت خواہ ہوں کہ خط غیر ضروری طور پر طویل ہوتا جا رہا ہے۔ اگر چہ آپ نے دیسی اور بدیسی افسانے خاصے جمع کر لیے ہیں لیکن فرصت ملنے پر ایک ایک کر کے پڑھوں گا۔ کار لائقہ سے یاد فرمائیں۔ احباب کو مناسبات۔

نوٹ :لائق صد احترام اقبال مجید صاحب! ابن صفی کی فنّی خوبیوں اور زبان و بیان کی شگفتگی و دل پذیری کے آپ خود بھی

معترف ہیں، پھر بعض لوگ اگر جوشِ عقیدت میں ان کا ادبی مرتبہ بڑھانے میں لگے ہیں تو آپ کا فکرمند اور لاحق اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا ہونا بعید از قیاس بھی نہیں ہے۔ کیا یُرا ہے جو ابنِ صفی کے جاسوسی ناولوں میں جا بہ جا موجود ادبی وتخلیقی عناصر کے پیشِ نظر، ادبِ عالیہ کے نام پر لکھی گئی بعض لچر فکشن تحریروں کے مابین تقابل واحتساب کا عمل شروع ہو گیا ہے؟ خواہ مخواہ ابنِ صفی کو دوستو وسکی کے مقابلے میں پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ دوستو وسکی کے پایے کے کتنے ناول نگار اردو ادب میں پیدا ہوئے ہیں؟ ابن صفی کی بے پناہ عوامی مقبولیت کو منہا کرنے کی یہ کون سی حکمتِ عملی ہے؟ ابن صفی اور دوستو وسکی کا موازنہ کہاں تک مناسب اور معقول ہے؟ کیا اعلا اور ادنا ادب کی شناخت کے لیے محض 'سماجی سروکار' کا پیمانہ ہی کافی ہے یا دوسرے فکری وفنی اظہار واسالیب کے عوامل بھی زیرِ بحث آئیں گے؟ ان سوالوں پر بھی نگاہ ہونی چاہیے۔ کیا ہی اچھا ہوا گر 'آمد' کے قارئین آپ کے دانش ورانہ ردِ عمل کے تناظر میں، ابنِ صفی کے ادبی مقام ومرتبہ کے تعین کے حوالے سے دلائل وشواہد کے ساتھ، نئے مکالمے کا آغاز کریں! بہ صد ادب واحترام!! [خورشید اکبر]

● **اسیم کاویانی، ممبئی** : 'آمد' نمبر 5 میں آپ کا اداریہ چشم کشا ہے۔ شافع قدوائی کے مضمون میں توہینِ رسالت کے موضوع پر مولانا آزاد کے اس طرزِ فکر کو یاد دلانا اچھا لگا کہ ایسے معاملوں میں مسلمانوں کو جذباتی اور غیر منطقی طریق عمل سے بچنا اور حکومت اور عدالت کے اختیار کو اپنے ہاتھوں میں لینے سے گریز کرنا چاہیے۔ اسی طرح جہاد کی تشریح میں انبیا ورسل کے طرزِ عمل سے جہادِ لسانی کی مولانا کی دلیل بھی قائل کرتی ہے۔ مولانا کے ان افکار کا اعادہ اتنا زمانہ گزر جانے پر بھی معنویت کا حامل نظر آتا ہے۔ لیکن مولانا آزاد کی قومیت پر تنقید کا تذکرہ چھیڑنا بے وقت بھی ہے اور نامناسب بھی، جو کہ دراصل قومیت کے تعصب، قومیت کی انتہا پسندی، ثقافتی دہشت گردی، اور تشخص اساس قومیت یا مطلق العنانیت کے خلاف تھی۔ اسی طرح وہ جمہوریت کے پردے میں جاری امتیاز، عدم مساوات اور استبداد کے خلاف تھے نہ کہ جمہوریت کے۔ ہماری نظروں کے سامنے روسی قومیت متعدد ریاستوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ امریکا کی ریاستوں نے علاحدگی کا بگل بجا دیا ہے۔ مسلم مملکتوں کی کئی کئی دہائی سے چلی آ رہی آمریت کی پسپائی نے وہاں پر جمہوریت سے نو متعارف عوام کو باہم دست وگریباں اور پراگندہ کر رکھا ہے۔ ڈر ہے کہ اُن کے قومی تشخص کو عالمی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں قبائلی مزاج پروری سے ٹکڑوں میں نہ بانٹ دیں۔ خود اپنے وطنِ عزیز میں راشٹر میں 'مہاراشٹر' بنانے اور عوامی ہلاکتوں کے ملک کے ماتھے کے کلنک کو 'گجرات کا گورو' بنا کر اقتدار کے حصول کا گندہ کھیل کھیلنے والے لیڈر موجود ہیں۔ آپ اپنے اداریے میں اپنے بعض ترددات کے باوجود ادب میں جمہوریت کے پاس دار نظر آتے ہیں اس لیے مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ 'دو قومی نظریے' کے زخم کھا چکے اس فرقے کے لیے شافع قدوائی کا وہ حصۂ مضمون اس لیے بھی غیر موزوں ہے کہ مولانا اخیر وقت تک متحدہ قومیت کے لیے لڑتے رہے تھے۔ شافع، جامع مسجد کی 1947ء (غالباً) کی آخری یادگار تقریر میں مولانا آزاد کے دلِ دردمند کی ہندستانی مسلمانوں سے پُر حقیقت تلخ نوائی کو بھی یاد کر لیتے تو اچھا ہوتا۔ آزاد ہندستان میں ہم کتنے پچھڑ گئے ہیں اور کتنی ناانصافیوں کا شکار رہے ہیں، اس کا نالہ کرتے ہوئے کبھی کبھی 15% (سے 18%) ہندستانی مسلمان اس بات کا بھی محاسبہ کر لیا کریں کہ ایک ڈیڑھ فی صد

ہمسایوں کے تقابل میں وطنِ عزیز کے لیے شہید ہوجانے والوں میں ہم آج تک ایک حوالدار عبدالحمید اور ایک بریگیڈیر عثمان کو وجہِ ناز بنائے ہوئے ہیں! ناول کے فن پر مصطفا کریم اور رحمان عباس دونوں ہی کے مضامین اہمیت کے حامل ہیں۔ رحمان کے مضمون 'ناول کا فن اور اردو ناول کی تنقید کا المیہ' کی کچھ باتوں سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً یہی کہ قرۃ العین حیدر کے 'مصنوعی ڈکشن' کو ہاضمانے کے لیے کوئی ہاضمولا نہیں بنا تو پھر وہ برِصغیر میں اردو ادب کی (جاسوسی یا عوامی ادب کی نہیں) سب سے مقبول اور سب سے زیادہ فروخت ہونے والی مصنفہ کیسے بنیں! اُن کے ناولوں کے مطالعے سے قارئین نے عموماً فکر ونظر کی کشادگی حاصل کی ہے اور اپنے تاریخی وتہذیبی شعور کو درخشاں کیا ہے، کسی کا ہاضمہ ہی خراب ہو تو اور بات ہے۔ انگریزی اور عالمی ادب کے مشہور ناولوں پر رحمان کی اچھی نظر ہے۔ جب وہ ہمیں یہ سمجھاتے نظر آتے ہیں کہ جیمس جوائس یورپ کی چھے سو سال کی روایت کی پیداوار ہے، اس لیے اس کے اسلوب کو اس تاریخی پس منظر اور کافکا کو یورپ کی جنگوں اور چند دیگر لواحقات کے بنا مکمل طور پر سمجھا نہیں جاسکتا تو وہ قرۃ العین کے اسلوب کے یورپ کے سوسوا سو برس قبل کے اسلوب کی نقل ہونے اور منفرد و توانا نہ بن سکنے کا یہ جواز کیوں نظر انداز کردیتے ہیں کہ برِصغیر کا ذہن و مزاج ع لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو، کی دھن پر جارج الیٹ اور جین آسٹن سے بھی قبل کے عہد سے چمٹا ہوا تھا اور قرۃ العین کا فن آخر اپنے عہد اور عہد کی وراثت کا نمائندہ تھا! ان معروضات کی بنا پر مصطفا کریم کا یہ استفسار بھی حل ہوجاتا ہے کہ 'ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ' میں 'آگ کا دریا' کو مناسب توجہ کیوں نہ ملی۔ رحمان کا مقالہ ناول کے فارم اور تکنیک سے اُن کی فنی آگہی کا پتا دیتا ہے۔ اسی طرح اردو ناولوں میں اسالیب کی فرسودگی، بندھے ٹکے موضوعات کی جگالی اور ناول کی تشکیل اور کردار نگاری میں ندرت کی کمی پر اُنھوں نے بڑی بے باکی سے قابلِ قدر رایوں کا اظہار کیا ہے، لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ اُن کا تازہ ناول 'خدا کے سائے میں آنکھ مچولی' ناول کے فنی لوازمات پر پورا نہیں اُترتا اور وہ ایک طویل افسانہ بن کر رہ گیا ہے۔ مرکزی کردار ابتدا ہی سے اتنا Mature ہے کہ کوئی ارتقا نظر نہیں آتا۔ مذہب اور معاشرے کے تعلق سے اس کے انقلابی یا باغیانہ خیالات اُس کی ڈائری کا حصہ بنتے نظر آتے ہیں؛ کہانی کے ارتقا، ماجرے کی تفصیل اور نشیب وفراز سے اُبھتے نظر نہیں آتے۔ ''شپلا کے پھول' افسانے میں طاہرہ اقبال کا متاثر کن بیانہ اشیا کی جزئیات، مناظر کی تصویر کشی، ماحول کی مناسبات اور پس منظر کی کیفیتوں کو اس طرح سمیٹے ہوئے ہے کہ قاری خود کو بھیگے بھیگے موسم میں ڈھاکا کے بانس کے سیاہ گھنیرے جنگلوں میں شپلا کے تیرتے پانیوں پر رواں نوکا میں بیٹھا ہوا ساحل پر برپا تماشوں میں کھویا ہوا پاتا ہے۔ ایسے کم ہی افسانے ملتے ہیں جن میں انجام کی تشنگی کے باوجود افسانے کا حسن کم نہیں ہوتا۔ شاعری کے انتخاب میں اور کڑی نظر کی ضرورت ہے۔ مانا کہ آپ کو even نمبر زیادہ پسند ہیں (منتخب کلام دیکھ لیجیے) لیکن اگر کسی نے درجن بھر غزلیں بھیج دی ہیں تو ضروری نہیں کہ اُنھیں درجن کے حساب سے پیش کردیا جائے یا کسی کی دس نظمیں ہیں تو دس سے کم پر بس نہ کیا جائے! اس بار جمال اویسی کی تین غزلیں (سچ کیا ہے جاننے کے لیے بے قرار ہوں / ماضی کے کردار کو جینا میرے بس کا کام نہیں / بکھرا ہے میرا آسمان آنگن میں تیرے ایسا) اور شعیب نظام (دروں کو چنتا ہوں دیوار سے نکلتا

ہوں) سعید روشن (خوشبوؤں کی بارش تھی، چاندنی کا پہرا تھا) احمد سوز (میں اگر صرف صدا ہوتا تو!) مناظر حسن شاہین (گلاب رنگ تھے چہرے کئی، نظارہ کیا) اور غضنفر (کبھی تو موند لیں آنکھیں کبھی نظر کھولیں) متاثر کن تھیں۔

● **سیّد شاہد مہدی، آئی۔اے۔ایس (ریٹائرڈ)، سابق وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی** : ''آمد'' کتابی سلسلہ۔۵ ملا، (اکتوبر تا دسمبر ۱۲) ''نظریاتی ادعائیت کے خلاف، کشادہ ذہنی رویّوں کی دستاویز'' کا اعلان، مناسب لگا۔ ادب میں گروہ بندی کا میں بھی قائل نہیں ہوں۔ انور معظم صاحب کا مضمون، بہت جامع ہے، اور کئی بار پڑھنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ ''آمد'' میں اس طرح کے مضامین کے لیے مزید گنجائش نکالیے۔ میری خواہش ہے کہ پروفیسر حسن عسکری صاحب مرحوم پر اردو میں بھی تحقیقی مضامین لکھوائے جائیں۔ ایسی فنافی العلم شخصیات اب نادر ہیں۔ خدا بخش لائبریری سے عرصہ ہوا ایک جلد شائع ہوئی تھی، جو قابلِ اطمینان نہیں تھی۔ ان کے منتخب مضامین، اردو میں یا ان کے انگریزی ترجمے شائع کیے جاسکتے ہیں۔ اس خط کے ساتھ دو ہزار روپے (Rs.2000) کا ایک چیک بھیج رہا ہوں، قبول فرمائیں۔

● **ڈاکٹر جعفر عسکری، گولا گنج [لکھنؤ]** : مرحوم والدِ ماجد پر نیا مضمون لکھ کر روانہ کر رہا ہوں۔ نظرِ ثانی کا وقت بھی نہ تھا چنانچہ ابھی مکمل کر کے آپ کی خدمت میں روانہ کر رہا ہوں۔ براہِ کرم وصولیابی سے مطلع فرمائیے گا۔ سوال یہ ہے کہ کیا آپ اسے اپنے خصوصی نمبر میں شامل اشاعت بھی فرمائیں گے؟

● **پی۔پی۔سریواستو رند، نوئیڈا [اتر پردیش]** : غازی آباد سے ڈاکٹر ذکی طارق نے سہ ماہی 'آمد' کتابی سلسلہ۔۵ (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲ء) لاکر دیا۔ حالاں کہ آپ کے کتابی سلسلہ کا یہ دوسرا سال ہے، افسوس ہے کہ میری نظر سے پہلے نہیں گزرا جب کہ ہندستان سے شائع ہونے والے تقریباً سبھی رسالے مجھ تک پہنچتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ میرے نام اور میرے کام سے کہاں تک واقف ہیں۔ بہر حال، ایک اسّی (۸۰) سالہ بزرگ کا مشورہ یہ ہے کہ آپ کا کتابی سلسلہ بہت ضخیم ہے اور آج کے دور میں اور دوڑتی بھاگتی زندگی میں فرصت کے لمحے کم ہی نکل پاتے ہیں۔ ایک رسالے میں صرف اتنا ہی مواد ہونا چاہیے کہ قاری اس کو اطمینان سے پڑھ سکے اور ادب کا لطف لے سکے۔ کتابی سلسلے کا نثری حصہ بہت توانا ہے۔ آپ نے جو ستون قایم کیے ہیں وہ قابلِ ستایش ہیں۔ نظمیات کا حصہ حالاں کہ مختصر ہے مگر خوب ہے۔ اللہ آپ کو اپنے مشن میں کامیاب کرے! کچھ تازہ کلام بھیج رہا ہوں اگر کسی لائق نکلیں تو اپنی بزم میں شامل کرلیں۔

● **شاہد عزیز، اُودے پور [راجستھان]** : ''آمد'' کا پانچواں شمارہ آپ کی محبتوں کے ساتھ مجھے کچھ عرصے پہلے مل گیا تھا، تب سے یہ میرے مطالعہ میں ہے۔ ابھی پچھلے شمارے کا خمار باقی تھا کہ نئے شمارے نے آکر خمار کو نشے میں بدل دیا۔ بڑا معیاری اور کامیاب پرچہ رسالوں کی اس بھیڑ میں آپ نے اپنے پڑھنے والوں کو دیا ہے۔ اس قدر ضخیم پرچے کے لیے اتنا معیاری ادب جمع کرلینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ سب آپ کے نام اور کام سے ہونا ممکن ہو پارہا ہے۔ میں رسالے میں پہلے تو اپنی چیزوں کو پڑھتا ہوں۔ اگر ملنے والے رسالے میں میری کوئی تخلیق ہوئی تو پھر خطوط پڑھتا ہوں کیوں کہ خطوط کسی بھی پرچے کا آئینہ ہوتے ہیں۔ اور اس آئینے میں سب نظر آتا ہے جو کسی وجہ سے ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوگیا ہو۔ تو اس طرح تخلیقات پر لوگوں کے تاثرات پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ خطوط کے بعد،

میں اداریہ پڑھنا پسند کرتا ہوں۔ آپ کا منظوم اداریہ بھی خوب ہے اس کی پسندگی کا عکس خطوں میں بھی نظر آرہا ہے۔ اور اس تازہ شمارے میں بھی آپ کا اداریہ بعنوان ''ادب کی جمہوریت'' بہت خوب ہے جس میں آپ نے بہت توجہ طلب باتیں کی ہیں، اس سے آپ کے وسیع مطالعہ کا پتہ بھی چلتا ہے۔ چونکا دینے والے اداریوں کی وقتی اہمیت اپنی جگہ مگر سنجیدہ اداریوں کی ادبی اہمیت اپنی جگہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محمود ایاز کے لکھے گئے ''سوغات'' کے اداریے آج بھی یاد کیے جاتے ہیں بلکہ حوالوں میں کام آتے ہیں۔ حصۂ نظم کا انتخاب بھی خوب ہے، غزل کے انتخاب میں کچھ اور سختی کی ضرورت ہے مگر جمال اویسی کی غزلوں نے غزل کا وقار بڑھایا ہے۔ جمال ۱۹۸۰ کے بعد کے غزل گویوں میں اپنا الگ ایک مقام رکھتے ہیں ان کی غزل اکیسویں صدی کی بڑی غزل میں شمار ہونے والی غزل ہے۔ ان کے پاس زندگی کو اپنی الگ نظر سے دیکھنے سمجھنے کا شعور ہے کیوں کہ وہ ہر چیز کو تنقیدی نظر سے دیکھتے ہیں۔ جن لوگوں نے ان کے مضامین پڑھے ہیں وہ میری اس بات سے ضرور اتفاق کریں گے۔ آپ نے دو بڑے فن کاروں پر دو مختصر گوشے شائع کیے ہیں۔ ان میں بہت کچھ معلومات سمٹ آئی ہے۔ اس لیے یہ بہت کم ہونے کے باوجود کافی کچھ ٹھیک ہے۔ ابنِ صفی کو ادب میں ادب کے ٹھیکیداروں نے کوئی مقام نہیں دیا ہے مگر ابنِ صفی نے ادب کے آئینے میں زندگی کو دیکھا ہے۔ ابن صفی کے کردار کوئی ہوائی کردار نہیں ہیں۔ وہ زمینی حقیقتوں سے جڑے سانس لیتے ہوئے لوگ ہیں۔ ابن صفی نے سماج کے ہر فرد کے دکھ درد کو محسوس کیا ہے۔ اس نے عشق و محبت کے نازک احساسات کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ابن صفی کے کردار دوسروں کے دکھ درد کو بھی خوب سمجھتے ہیں اور انھیں انصاف دلانے کے لیے اپنی جان بھی دے سکتے ہیں۔ اسی جذبے سے کام کرنے والے کردار آپکو منٹو اور کرشن چندر کے ناولوں میں بھی مل جائیں گے۔ وہی ناقدین جن کو ابن صفی صرف جاسوسی ناول نگار لگتا ہے۔ چھپ کر انکو پڑھتے رہتے ہیں۔ مگر ادب میں ابنِ صفی کی اینٹری پر روک لگا رکھی ہے۔ وہاب اشرفی اردو ادب کے اہم ترین ناقد ہیں۔ ان کے نام، کام اور کارناموں سے اہلِ ادب خوب واقف ہیں۔ ان کا یوں چلا جانا ایک بڑا خسارہ ہے مگر ان کی کتاب ''تاریخ ادبیاتِ عالم'' ان کی کمی کو کبھی محسوس نہیں ہونے دیگی۔ حسن جمال کا افسانہ ''نادیدہ یلغار'' کا افسانوی موضوع بڑا توجہ طلب ہے۔ ایسے موضوع پر افسانے لکھے بھی نہیں گئے ہیں۔ حسن جمال ایک اوسط درجے کے افسانہ نگار ہیں مگر ہر کوئی ایسا ضرور کرنا چاہتا ہے کہ اس کی کوئی چیز ہو جس پر کچھ چرچا ہوتا رہے۔ شاید یہی سوچ کر حسن جمال نے کچھ اس طرح کے جملوں کا استعمال کیا ہے۔ ''اس کوٹھا کانے لگانے سے پہلے کچھ لطف لے لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ بے شک یہ گناہ ہے لیکن خدا نے مومنوں سے وعدہ کر رکھا ہے کہ جنت میں حوروں کے علاوہ غلمان بھی ملیں گے'' ان جملوں سے قارئین کے ذہن میں جو معنی ابھرتے ہیں وہ بحث طلب ضرور ہیں۔ مگر میری سوچ کچھ اور ہے۔ میں نے رسالوں میں حسن جمال کے خط پڑھے ہیں وہ اکثر لکھتے ہیں جب شاعری میرے سامنے آتی ہے تو میں رسالے کے ان صفحات کو بدل دیتا ہوں۔ میں شاعری نہیں پڑھتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو حضرات شاعری نہیں پڑھتے ہیں وہ ذہنی طور پر بیمار ہوتے ہیں۔ وہ کبھی اردو ادب کی تہذیب سے واقف نہیں ہوتے۔ کیوں کہ ادب میں شاعری ہی سب سے بڑی چیز ہے۔ وہ ادب، ادب ہی نہیں ہوتا جس میں شاعری نہ ہو۔ جو

شاعری سے ناواقف ہیں وہ ادب کی تہذیب سے ناواقف ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اس طرح کے جملے لکھ دیتے ہیں۔ رسالے میں اور بھی بہت کچھ ہے جس کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ مگر ایک ضخیم پرچے میں اشاعت پذیر تمام چیزوں پر تبصرہ ممکن نہیں ہوتا۔ میرے ایک دوست ہیں محمد فاروق رضا، ان کی خواہش ہے کہ ان کی ایک غزل، میں اپنے خط میں رکھ کر آپ تک پہنچاؤں جو منسلک ہے۔ اگر قابلِ اشاعت ٹھہرے تو شاملِ اشاعت کریں۔

● **ولی عالم شاہین، [کینیڈا]** : ایک مہینے پہلے 'آمد'۔۵ مل گیا تھا۔ اس نوازش کے لیے ممنون ہوں۔ میں نے اب تک تین شمارے دیکھے ہیں اور یہ احساس ہوا کہ آپ خوب سے خوب تر کی طرف گامزن ہیں۔ مشمولات میں تنوع، نیا پن، اور تازگی ہے۔ دس صفحے کا اداریہ ادب کے تئیں گہرے خلوص اور فکری استحکام کا مظہر ہے۔ دس نکات پر مشتمل آپ کے سوالنامے کو بنیادی خاکہ ٹھہرا کر کم از کم ایک مشترک ذو اضاف اقل کے طور پر اتفاق رائے کی بات کی جا سکتی ہے۔ وہاب اشرفی اور ابن صفی پر بالترتیب اکیاون اور ترسٹھ صفحات کے گوشے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک مختصر سا مضمون اور گیارہ غزلیں منسلک ہیں۔ ان میں سے جتنی پسند آئیں انھیں کسی قریبی اشاعت کے لیے رکھ لیجیے۔ اتنی ہی غیر مطبوعہ نظمیں بھی جمع ہوگئی ہیں۔ انھیں بھی آپ کہیں گے تو آئندہ حاضر کروں گا۔ آپ کو اہل و عیال سمیت نئے سال کی مبارک باد۔

● **صبا اکرام، کراچی [پاکستان]** : ''آمد'' کا شمارہ ۵ (میں تو شمارہ ہی کہوں گا) موصول ہوا۔ شکریہ! یہ گزشتہ شماروں سے بھی زیادہ وقیع ہے، اب ایک رُخ نظر آنے لگا ہے۔ آپ کا اداریہ Enlightening ہے، ادبی فیصلوں سے عوام کو دور رکھنے کی اشرافیہ ذہنیت کی سازشوں نے ماضی میں نقصان ضرور پہنچایا ہے، مگر اس کا زور اب کافی حد تک ٹوٹ چکا ہے۔ آپ نے غیر منقسم ہندو پاک و بنگلہ دیش میں زندہ اور توانا ادب کی تخلیق کی بات کی ہے جو ادیبوں اور شاعروں کے اپنی ثقافتی جڑوں سے وابستہ اور پیوستہ ہونے کے سبب ہوا۔ یہ بات درست ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی ''اوراق'' کے پلیٹ فارم سے اس کا ہمیشہ پرچار کیا۔ ابنِ صفی کا آپ نے بڑا جاندار خصوصی گوشہ ترتیب دیا ہے۔ مجنوں گورکھپوری اور ابوالخیر کشفی صاحبان کی تحریریں مطبوعہ ہونے کے باوجود گوشے کی اہمیت میں اضافہ کرتی ہیں۔ گوشے میں شامل دیگر تحریروں نے عین اپنا حق ادا کیا ہے۔ مناظر عاشق ہرگانوی نے بڑی محنت سے ابن صفی کے ناولوں کی فہرست مرتب کی ہے۔ راشد اشرف کی تحریر بھی دلچسپ ہے۔ یہاں ان کو ابنِ صفی پر اتھورٹی کی حیثیت حاصل ہے۔ ابنِ صفی پر ان کی مرتب کردہ کتاب ''کہتی ہے تجھ سے خلقِ خدا غائبانہ کیا'' اسی سال مئی کے مہینے میں شائع ہوئی ہے، اور خاصے کی چیز ہے۔ محمد حامد سراج کے افسانہ ''ہوٹل'' نے بے حد متاثر کیا۔ وہ لکھتے کیا ہیں، غضب ڈھاتے ہیں۔ چند سال قبل کراچی تشریف لائے تھے تو افسانہ نگار امین الدین کے یہاں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان کے گردے کے ٹرانسپلانٹ کی خبر ''آمد'' سے ہوئی۔ یہاں ہم تمام احباب دعا گو ہیں، اللہ ان کو اور ان کے صاحبزادے کو مکمل طور پر صحت یاب کرے۔ آمین! وہاب اشرفی صاحب کے گزر جانے کا دکھ یہاں بھی ان کے دوستوں اور قدر دانوں کو بہت زیادہ ہے۔ آخری بار ان سے میری ملاقات سن ۲۰۰۱ء میں ہوئی تھی جب میں چینئی امن کانفرنس میں شرکت کے

بعد واپسی پر پٹنہ میں تین چار دنوں کے لیے رکا تھا۔ ایک روز شام میں چائے پر بلایا تو نواب حسین [حسن نواب] صاحب اپنی کار میں جناب شفیع مشہدی اور رضوان احمد (مرحوم) کے ہمراہ مجھے ان کے یہاں ہارون آباد [ہارون نگر] لے گئے تھے۔ معروف فکشن رائٹر عبدالصمد، میرے پرانے دوست شکیب ایاز اور اعجاز علی ارشد وہاں پہلے سے موجود تھے۔ باتیں ہوئیں، چائے پی گئی اور شعر سنے گئے۔ افغانستان میں بامیان کے اسٹیچو کو مسمار کیے جانے کے سانحے کے حوالے سے کہی گئی میری نظم ''وہ'' انھوں نے مجھ سے لے کر رکھ لی تھی، جسے انھوں نے ''مباحثہ'' کے اگلے شمارے میں شائع کیا تھا۔ سن ساٹھ کے وسط میں انھیں جیسا دیکھا تھا اب جسمانی طور پر آدھے بھی نہیں رہ گئے تھے، مگر علمی اور ادبی اعتبار سے ان کی شخصیت جتنی قدآور ہو چکی تھی، اس کے برابر کی پاک و ہند میں اب دو چار شخصیتیں ہی رہ گئی ہیں۔ جمال اویسی ایک ممتاز شاعر کے ہونہار فرزند ہیں۔ وہ تو سوچیں گے ہی کچھ خاص کرنے کی۔ ممکن ہے کوئی نیا زاویہ ان کے یہاں سامنے آ ہی جائے۔ دعویٰ کرنا ہی بڑی بات ہوتی ہے اور اس کا اظہار تو انھوں نے کر ہی دیا ہے۔ آپ نے بھی ان کی غزلوں اور نظموں کو خاص کہہ کر ہی شائع کیا ہے۔ غزلوں سے تو میں اپنے عہد کی مایوسی اور زندگی کے رائگاں ہونے کے وجودی احساس کی راہوں سے ایک شناسا کی طرح کسی مرحلے پر بغیر الجھے ہوئے گزر گیا۔ ہاں، دو ایک نظموں (آدیکھ مجھے، پُراسرار) میں سیکنڈ پرسن سے گفتگو کا جو رنگ سامنے آیا ہے وہ ایسی پرچھائیوں کو جنم دیتا ہے، جن سے دھندلا سا ایک پیکر جھانکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہ شبہہ ذرا اور روشن ہو لے، پھر بات ہو سکتی ہے۔ مصحف اقبال توصیفی اور شاہد احمد شعیب کی نظمیں پڑھ کر مزہ آ گیا۔ ان میں دونوں کی انفرادیت کا رنگ گہرا ہی نہیں ہوا بلکہ کچھ اور نکھرا ہوا سا محسوس ہوتا ہے۔ عظیم ناول کے موضوع پر ڈاکٹر مصطفےٰ کریم کا Research Based مضمون بہت خوب ہے۔ اس نے اردو کے کئی اہم رمعروف ناولوں کے بارے میں ہماری رائے کو بدل ڈالا۔

● **غالب عرفان، کراچی [پاکستان]** : ''آمد'' کا تازہ شمارہ۔۵ حسبِ معمول، عزیزم معراج جامی کے توسط سے موصول ہوا۔ مسرّت ہوئی۔ پیہم نوازشوں کے لیے شکرگزار ہوں۔ یوں تو ''آمد'' کا یہ شمارہ بھی حسبِ روایت ادب اور زندگی کا خوبصورت میلان بن کر نظر نواز ہوا لیکن خاصے کی چیز، میرے لیے ابنِ صفی کی ۹۳ صفحات پر پھیلی ہوئی، جاسوسی ناولوں کی سرگزشت اور اس سے متعلق مختلف ناقدوں اور ماضی کے اکابرین کی آرا اور انکشافات ثابت ہوئے۔ ایک ایک لفظ سے، مجھے اپنے طالب علمی کا زمانہ اور جاسوسی دنیا میں کھو جانے کا زمانہ یاد آ گیا۔ برسبیلِ تذکرہ یہ عرض کرتا چلوں کہ جمشید پور (جھارکھنڈ، بھارت) جہاں سے میں پاکستان منتقل ہوا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں جاسوسی دنیا کو متعارف کروانے کا سہرا میرے ہی سر جاتا ہے۔ ہوا یوں کہ اُن دنوں جب میں ہائی اسکول کا طالب علم تھا، والدہ محترمہ (مرحومہ) ہر سال کی طرح، حیدرآباد دکن گئیں تو واپسی میں کھڑگپور جنکشن میں ٹرین تبدیل کرنے اتریں اور اے۔ ایچ۔ وہیلر کی بُک اسٹال سے 'جاسوسی دنیا' کا تازہ شمارہ وقت کاٹنے کے لیے نو (۹) آنے میں خرید لیا۔ گھر پہنچیں تو قبل اس کے کہ وہ اپنا اسباب سفر کھولتیں، میں نے اوپر ہی سے وہ ''جاسوسی دنیا'' اچک لیا جو دراصل نہ صرف پہلا شمارہ تھا بلکہ ''دلیر مجرم'' کا جاسوسی ناول تھا۔ قصہ مختصر، میں نے راتوں رات، دلچسپی سے وہ ناول ختم کر لیا اور اگلے روز اسکول لے کر گیا بس

پھر کیا تھا وہاں کلاس روم میں ''جاسوسی دنیا'' تبرک بن گئی۔ پھر یہ طے ہوا کہ اِسے جمشید پور میں ہر ماہ منگوایا جائے۔ بسٹو پور میں ایک پان کی دکان ہی دراصل نصیر نیوز ایجنسی تھی جہاں اوپر ایک رسّی پر 'شمع'، 'بیسویں صدی' اور دوسرے ماہنامے ٹنگے رہتے تھے اُسی کو یہ ذمہ داری سونپی گئی۔ اُس زمانے میں ہمیں اتنا جیب خرچ بھی نہیں ملتا تھا۔ ہم تین دوست مل کر نو آنے کی رقم پوری کرتے اور باری باری اپنے ساتھ رکھ کر اس تبرک کا فیض حاصل کرتے تھے بلکہ اسے جلد سے جلد ختم کرنے کی شرطیں لگا بیٹھتے تھے۔ بہر کیف، ابنِ صفی نے الحفر ین کے زمانے میں ہمارے ذہنوں کی تربیت کی تھی۔ مسلسل تین نسلوں پر مرحوم کا احسان ہے۔ ہم نے ابن صفی کے اسلوب سے بہت کچھ سیکھا بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ میں نے سب سے پہلے پہل نثر میں اور پھر شاعری میں اپنے آپ کو آزمایا تو شاید اس میں بھی ابن صفی کی پُرکشش طرزِ نگارش کا دخل ہے۔ اللہ مرحوم کی مغفرت کرے! اب بھی پاکستان میں اُن کے مشہور ناولوں کے نئے ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ Hot Cakes کی طرح بک جاتے ہیں۔ افسانے سارے کے سارے پسند آئے۔ لیکن پسندیدہ ترین افسانہ جیلانی بانو کا ''گوشت کی دکان'' تھا جس میں موجودہ دور کے مسیحاؤں کی بے حسی اور ہسپتالوں کے تجارتی ماحول کو بہت خوبصورتی سے اجاگر کیا گیا ہے۔ ویسے دوسرے بہتر افسانے میں بھی عجیب اتفاق ہے کہ سندھی ادیب نورالہدیٰ شاہ نے گوشت ہی کا استعمال کیا ہے۔ ''باسی گوشت'' یقیناً بہت دنوں تک یاد رکھا جانے والا افسانہ ہے لیکن مترجم شاہد حنائی کا یہ دعویٰ کہ وہ مشہور ادیبہ محترمہ زاہدہ حنا کے صاحبزادے ہیں، قطعاً غلط ہے۔ ایک مرتبہ اب سے بیس سال پہلے بھی مجھ سے وہ یہ غلط بیانی کر چکے ہیں جس کی میں نے زاہدہ حنا کو فون کر کے اُسی وقت تصدیق کر لی تھی براہ کرم آپ آئندہ صفحہ ۱۶ پر لکھے گئے بیان کی تردید کر دیں۔ ان کے علاوہ شافع قدوائی کا مضمون ''الہلال کے حوالے سے'' اور شہرِ نقد و نظر کے مضامین بھی نہ صرف معلوماتی ہیں بلکہ مشعلِ راہ بھی! حسبِ روایت چار تازہ غزلیں اور نظم (سب غیر مطبوعہ) منسلک ہیں۔ امید ہے آپ کی تحویل میں رکھی ہوئیں اور تخلیقات کے ساتھ یہ بھی ''آمد'' میں جگہ پائیں گی۔ عظیمہ فردوسی صاحبہ کو سلام۔

نوٹ: جناب شاہد حنائی کی زبانی اطلاع کی تردید کے لیے آپ کا بیان کافی وشافی ہے۔ ویسے خود شاہد حنائی صاحب نے بھی 'آمد۔۵ کی اشاعت کے بعد، بذریعہ فون، سچ کا انکشاف کر دیا ہے۔ اگر انھوں نے ازراہِ عقیدت زاہدہ حنا کو 'ماں' کہہ دیا تو اس پر سوائے محترمہ حنا کے کسی اور کو معترض نہیں ہونا چاہیے۔ اس رشتے کے تعلق سے زاہدہ حنا صاحبہ نے ہنوز اپنا کوئی ردِ عمل یا منفی تاثر ظاہر نہیں کیا ہے۔ اس لیے شاہد حنائی کو ان کی 'پاکیزہ جسارت' کے صدقے میں مرتکبِ گناہ تصور نہیں کیا جانا چاہیے۔ معذرت کے ساتھ! [خورشید اکبر]

● **احمد صفی [پاکستان]** : میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے سہ ماہی 'آمد' کا تازہ شمارہ بذریعہ ڈاک مجھے ارسال فرمایا۔ بے حد شکریہ۔ اس کی رسید دیر سے دینے پر معذرت قبول کیجیے کہ اس دوران اس قدر مصروفیت رہی کہ سکون سے دو سطور لکھنے کا موقع نہ مل سکا۔ اب ایک عدد وائرس کا شکار ہو کر بخار اور سینہ جکڑے جانے کے باعث صاحبِ فراش ہوا تو موقع غنیمت جان کر یہ مراسلہ بھیج رہا ہوں۔ اس خصوصی جریدے کے صفحات کے عکس 'فیس بک' پر دیکھ چکا تھا اور اس سوچ میں تھا کہ آپ کو خط لکھوں۔ اسی دوران الٰہ آباد سے برادرم اسرار گاندھی صاحب سے رابطہ ہوا تو انھوں نے

مجھ سے پتہ لے کر آپ تک پہنچایا اور اس طرح ''آمد'' کا شمارہ مل سکا۔ اسے ہاتھ میں لیتے ہی دل سے دعا نکلی۔ رسالہ فی الحقیقت تسرالناظرین ہے۔ انٹرنیٹ پر پوسٹ کیے گئے عکسہاے صفحات سے اس کی اصل خوبصورتی اور خوب سیرتی کا کماحقہٗ اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ گوشۂ ابن صفی شائع کرنے پر مبارکباد اور شکریہ۔ لیکن یہ اظہارِ تشکّر میں ان کا فرزند ہونے کی حیثیت میں نہیں کر رہا بلکہ ان کے لاکھوں پرستاران کی نمائندگی کرتے ہوئے کر رہا ہوں جو انھیں اب بھی پڑھتے ہیں اور ان سے محبت کرتے ہیں۔ ان پڑھنے والوں کی اوسط عمر بیس سے تیس سال تک گنی جا سکتی ہے۔ 'فیس بک' پر موجود ابن صفی صفحہ اس بات پر دلالت کرتا ہے۔ آپ کے موقر جریدے 'آمد' میں ابن صفی پر گوشہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ مدیران کرام کا ہاتھ قارئین کی نبض پر ہے اور انھیں قارئین کی ادبی پیاس بجھانے میں ملکہ حاصل ہے۔ گوشہ کے مضامین بہت خیال سے چنے گئے ہیں اور میرے لیے اعزاز کی بات ہے کہ میرا ایک مضمون بھی والد صاحب کے بارے میں شاملِ اشاعت کیا گیا۔ اس کا الگ شکریہ۔ دیگر مضامین سب اپنی جگہ موتیوں کی صورت جڑے ہیں۔ قندِ مکرّر کے طور پر شامل کیے گئے مضامین شاید بہت سے پڑھنے والوں کے لیے نئے ہوں مگر جو واقعی نئے مضامین تھے ان میں خان احمد فاروق صاحب کا مضمون 'مجھ کو دہراؤ گے محفل میں مثالوں کی طرح' بہت ہی خوب ہے۔ لئیق رضوی صاحب خصوصی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے تحقیق کے ایک اچھوتے موضوع پر قلم اُٹھایا اور غیر روایتی مضمون 'ابن صفی کے وِلین (منفی کردار) لکھ کر اپنی انفرادیت مستحکم کر لی۔ وہاب اشرفی صاحب پر شائع شدہ گوشے نے ان کے فن اور شخصیت کے کچھ ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی جو اس سے پہلے کم از کم میری نظر سے نہ گزرے تھے۔ تمام مضامین معلوماتی اور دلچسپ تھے۔ یقیناً یہ گوشہ وہاب اشرفی صاحب پر تحقیق کرنے والوں کے لیے ایک بہترین نقطۂ آغاز ثابت ہوگا۔ اس کے لیے بھی بہت شکریہ۔ دیگر شہر ہاے 'آمد' کے بارے میں کیا لکھوں کہ اس شمارے کو سینت سینت کر رکھتا ہوں اور ایک ایک مضمون الگ الگ نشست میں پڑھتا ہوں اس خوف سے کہ سارا ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا تو پھر کیا ہوگا؟ رسالے کی ترتیب و تنظیم کا جواب نہیں ہے۔ ایکبار پھر ایسے خوبصورت جریدے کی اشاعت پر دلی مبارکباد۔ آپ لوگوں کی محنت ورق ورق اور سطر سطر سے عیاں ہے۔ اللہ ''آمد'' کو دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔

- **رومانہ رومی [پاکستان]** : سہ ماہی 'آمد' کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا شکریہ، پابندی سے رسالے کی اشاعت اور خوبصورت سرورق پر پہلے تو مبارک باد قبول کریں۔ آپ کا خوبصورت اداریہ 'جو ادب میں جمہوریت،؟' پر گفتگو کرتا ہوا آخر میں سب تخلیق کاروں کے مختصر تعارف پر مکمل ہوا، پسند آیا یہ ایک نئے انداز کا اداریہ تھا، مولانا ابوالکلام آزاد کے حوالے سے شافع قدوائی صاحب کا مضمون سیر حاصل رہا۔ انھوں نے اس مضمون میں مولانا آزاد کے خیالات کی وہ شکل بیان کی جو ایک درست حقیقت ہے جہاں تک میرے مطالعے میں مولانا کی شخصیت رہی میں نے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔ شہرِ نقد و نظر میں ''عظیم ناول کی شناخت؟'' مصطفیٰ کریم کا مضمون لاجواب رہا بلکہ اُن کے آخری پیراگراف تو اس قدر سچائی پر مبنی ہیں کہ تاریخ میں ریکارڈ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شہرِ غزل میں ''پیشِ رو غزلیں'' آپ کے انتخاب کی داد دیتی ہیں جب کہ جمال اویسی کی 'دس خاص غزلیں'' آپ کی سخن شناسی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

شہرِ اعتراف میں ''وہاب اشرفی'' پر گوشہ جس میں مشاہیر کی آرا، قمر رئیس، محمود ہاشمی، صفدر امام قادری، ڈاکٹر ہمایوں اشرف اور سرور حسین کے مضامین نے ''وہاب اشرفی صاحب'' کی شخصیت اور اُن کے فن کو مختلف زاویوں سے ہمارے سامنے پیش کیا۔ شہرِ نایاب میں گوشۂ 'ابنِ صفی'' میں پروفیسر مجنوں گورکھپوری صاحب نے نہ صرف ابن صفی کے جاسوسی افسانہ پر ایک تفصیلی گفتگو کی بلکہ ہماری معلومات میں بھی اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ باقی مضامین اور خود ابن صفی صاحب کی اپنے بارے میں گفتگو اور آخر میں اُن کے تمام ناولوں کی فہرست ایک ریکارڈ ہے۔ شہرِ افسانہ میں 'گوشت کی دکان' محترمہ جیلانی بانو، 'نادیدہ یلغار' جناب حسن جمال اور 'ہوٹل' جناب حامد سراج عہد حاضر کی عکاسی کرتے ہوئے افسانے ہیں۔ شہرِ اشتراک میں نورالہدیٰ شاہ کا افسانہ 'باسی گوشت' ایک لاجواب تحریر ہے یہ ایک بولتا ہوا افسانہ ہے۔ شہرِ ملال میں شفیق فاطمہ شعریٰ پر ڈاکٹر ذکیہ عابد کی چند یادیں اظہارِ خیال اور اظہارِ عقیدت محسوس ہوئیں۔ اتنی محنت اور لگن سے 'آمد' کی آمد دل کو اچھی لگی۔ اُمید ہے کہ آئندہ بھی 'آمد' کی آمد اتنی ہی خوبصورت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنی امان میں رکھے (آمین)۔

● **راشد اشرف، کراچی [پاکستان]** : آمد کا تازہ پرچہ کراچی پہنچا۔ وہاب اشرفی صاحب کی خودنوشت 'قصہ بے سمت زندگی کا' ہم نے یہاں کراچی میں دلچسپی سے پڑھی تھی اور اس پر مضمون بھی لکھا تھا۔ اداریہ انتہائی اہم ہے اور کئی اہم مسائل کی جانب توجہ دلاتا ہے۔ اسی طرح شہرِ نقد و نظر میں شامل مضامین بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ کویت میں مقیم ہمارے دوست شاہد حنائی کا سندھی ادب سے ترجمہ پسند آیا۔ راقم کی معلومات کے مطابق شاہد حنائی اردو خاکوں کے مجموعوں کے ایک بہت بڑے (شاید سب سے بڑے) شخصی ذخیرے کے مالک ہیں۔ ان کی قلمی صلاحیتوں کا فائدہ اس صنف ادب میں بھی اٹھانا چاہیے۔ آمد دیکھ کر حیرت اور خوشی ہوئی اور بہت ہوئی۔ ایک تو پرچہ اس قدر دیدہ زیب کہ کیا ہی کہنے، اس پر اس کا وزن جو نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہمارے یہاں ایسی صورت میں کاغذ کا معیار گرا دیا جاتا ہے، وہ کچھ کچھ پیلاہٹ لیے ہوتا ہے جسے دیکھ کر دل بیٹھ جائے اور یوں لگے کہ جیسے کوئی کرم خوردہ نسخہ کہیں سے برآمد ہوا ہے لیکن آمد میں استعمال شدہ کاغذ کا معیار بھی عمدہ ہے۔ گوشۂ ابن صفی پر صفی صاحب پر ایک محقق کی حیثیت سے توجہ مرکوز رکھنا چاہوں گا۔ اس مرتبہ آپ نے گوشۂ ابنِ صفی شائع کر کے صفی صاحب کے ان گنت پرستاروں کے دلوں کو خوشی سے بھر دیا ہے۔ اداریے سے علم ہوا کہ آپ کو بیشتر مضامین ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے توسط سے موصول ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی مبارکباد پیش کرتا ہوں، لائقِ تحسین عمل ہے۔ بیشتر مضامین دکن سے ڈیڑھ برس قبل شائع ہوئے 'قومی زبان' کے ابن صفی نمبر سے لیے گئے ہیں اور یہ بات بھی عرض کرتا چلوں کہ مدیر 'قومی زبان' کو یہ مضامین خاکسار ہی نے مہیا کیے تھے۔ لئیق رضوی صاحب کا مضمون پسند آیا، مضمون کے لکھے جانے کے دوران لئیق صاحب کا راقم سے رابطہ رہا اور انھوں نے ابن صفی سے متعلق چند نکات پر بات بھی کی۔ آپ نے اداریے میں ابن صفی کے احیا کا ذکر کیا ہے۔ ۲۰۰۹ کے بعد ہونے والے احیا ابن صفی نے یہاں پاکستان میں ادب کے ناخداؤں کو خاصے اچنبھے میں ڈال دیا ہے۔ گرچہ پرانے لوگوں کے اٹھنے کے بعد نئی نسل سے تعلق رکھنے والوں کے دل منجانب ابن صفی کشادہ ہیں

لیکن پھر بھی ادب عالیہ اور سری ادب کی بحث سے ادبی ذوق رکھنے والا ہر شخص بخوبی واقف ہے۔ 'آمد' میں خاکسار کے مضمون کے ابتدائی فقروں میں مذکورہ صورتحال کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ 'آمد' میں شامل کیا گیا پروفیسر مجنوں گورکھپوری کا مضمون ''اردو میں جاسوسی افسانہ'' راقم کی ابن صفی پر مرتب کردہ کتاب ''کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا'' میں بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہ ایک اہم مضمون ہے جس کا ذکر آپ نے اداریے میں خصوصی طور پر کیا ہے (آپ کے الفاظ ہیں: ''پروفیسر مجنوں نے بہت پہلے ایک مفصل اور مدلل مضمون لکھا تھا)، یہ اب تک ابن صفی پر لکھے گئے سینکڑوں مضامین میں ایسا واحد مضمون کہلاتا ہے جو تنقیدی ہے۔ قارئین کی دلچسپی اور ریکارڈ کی درستگی کے لیے یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ مذکورہ مضمون سب سے پہلے جولائی ۱۹۷۲ میں کراچی سے ایچ اقبال (ہمایوں اقبال) کی زیر ادارت شائع ہونے والے 'الف لیلہ ڈائجسٹ' کے 'ابن صفی' نمبر میں شائع ہوا تھا اور اسے مجنوں صاحب نے ایچ اقبال کی خصوصی فرمائش پر تحریر کیا تھا۔ ایچ اقبال صاحب ماشاء اللہ حیات ہیں اور راقم الحروف ان سے رابطے میں ہے۔ بعد ازاں یہ مضمون مشتاق احمد قریشی صاحب نے اپنے جریدے 'نئے افق' (اولین نام ابن صفی میگزین) میں بھی شائع کیا۔ اس کے بعد یہ مضمون حیدر آباد دکن کے 'قومی زبان' کے 'ابن صفی نمبر' کے لیے خاکسار سے طلب کیا گیا تھا۔ اسی طرح 'آمد' میں شائع ہوا مضمون ''ابن صفی، اسرار ناروی اور میرے ابو'' فرزند ابن صفی، احمد صفی کا تحریر کردہ ہے۔ مضمون کا ماخذ برطانیہ سے حضرت مقصود الہی شیخ کی زیر ادارت شائع ہونے والا ادبی جریدہ ''مخزن'' ہے۔ اس کا سن اشاعت ۲۰۰۸ ہے۔ جناب ابن صفی کا تحریر کردہ ''میں نے لکھنا کیسے شروع کیا''، سب سے پہلے کراچی کے عالمی ڈائجسٹ میں ۱۹۷۰ میں شائع ہوا تھا۔ دہلی سے مکرمی عارف اقبال کے اردو بک ریویو کا ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ضخیم ''ابن صفی نمبر'' شائع ہونے کو ہے، تیاریاں زور و شور سے جاری ہیں۔ یہ تمام خبریں خوش کن ہیں۔ ہندوستان میں ابن صفی کے پرستار آج بھی اپنی عقیدت کا گاہے بگاہے مظاہرہ کرتے رہتے ہیں، یہ دیکھ کر ان کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ 'آمد' ایک خالص ادبی پرچہ ہے جس نے کم وقت میں ادبی حلقوں میں اپنی جگہ بنائی ہے۔ آمد کا ابن صفی پر توجہ دینا ایک خوش آیند عمل ہے۔ یہاں پاکستان کے ایک بڑے اخباری گروپ 'دنیا نیوز' کا ٹی وی چینل خاصا مشہور ہے۔ 'روزنامہ دنیا' کی اشاعت کا آغاز ایک ماہ قبل ہوا تھا اور آج ۱۲ نومبر ۲۰۱۲ کو کراچی سے اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ صبح ہی سے ٹی وی چینل پر ایک ہنگامہ بپا ہے۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ پاکستان کے معروف ادیب، کالم نویس و دانشور حسن نثار، کہ روزنامہ جنگ کی برسوں کی وابستگی کو خیر باد کہہ کر 'دنیا' سے منسلک ہوئے ہیں، کا روزنامہ 'دنیا' میں آج کا کالم بعنوان ''ابن صفی کے شہر کو سلام' خاکسار کی ابن صفی پر مرتب کردہ کتاب پر ہے۔ حسن نثار کے کالم کے آخری فقرے یہ ہیں: ''اک روایت ہے کہ پہلوان ہو یا گائیک، آغاز سے پہلے استاد سے اجازت طلب کرتا ہے۔ ابن صفی میرے فکری اساتذہ میں سے ہیں۔ ہم 'روزنامہ دنیا' کو کراچی سے بھی لانچ کر رہے ہیں۔ میں ابن صفی کے شہر کو سلام پیش کرتے ہوئے ان کی اجازت کا طلبگار ہوں۔ استاد محترم ابن صفی صاحب! اجازت ہے؟'' سو، جناب والا! برف پگھل رہی ہے۔ جمود ٹوٹ رہا ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی مرتب کردہ ابن صفی کے ناولوں کی فہرست نظر سے گزری۔

نہایت عمدہ کام کیا ہے، محنت اور توجہ سے کیے گئے اس کام کی جتنی بھی ستائش کی جائے، کم ہے۔ لازماً ڈاکٹر صاحب نے یہ تمام معلومات ہندوستانی نسخوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یکجا کی ہوں گی۔ ریکارڈ کی درستگی کے لیے چند باتیں عرض کرتا ہوں۔ سب سے پہلے تو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ابن صفی اپنے ناول کا نام خود تجویز کیا کرتے تھے، کراچی میں اشاعتی مراحل کی شروعات کے ساتھ ہی ناول کے مسودے کی کاربن کاپی الہ آباد جایا کرتی تھی اور یہ کچھ وقفے کے بعد وہاں سے شائع ہوا کرتا تھا۔ لہٰذا اصولاً ان ناموں میں سر مو فرق نہیں ہونا چاہیے۔ (کم از کم عباس حسینی کی زندگی میں تو اس کا تصور بھی محال تھا) صرف ایک مثال ہمیں ایسی ملتی ہے جب یہ فرق بوجوہ آیا تھا۔ ابن صفی نے روزنامہ حریت کے لیے 'ڈاکٹر دعاگو' قسط وار لکھنا شروع کیا جس کا آغاز ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۳ سے ہوا اور یہ کتابی شکل میں مارچ ۱۹۶۴ میں شائع ہوا۔ بھارتی قارئین کو طویل انتظار کی زحمت سے بچانے کے لئے عباس حسینی نے ابن صفی کی مشاورت سے یہ طے کیا کہ جب ڈاکٹر دعاگو کی اتنی قسطیں شائع ہو جائیں جو کہ عمران سیریز کے ایک عام شمارے کے برابر ہوں تو اسے الہ آباد سے بھی شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ بھارت میں 'ڈاکٹر دعاگو' تین حصوں میں شائع ہوا جن کے نام بالترتیب 'گھر کا بھیدی' (جون ۱۹۶۴)، 'موت کا مہمان' (جولائی ۱۹۶۴) اور 'ڈاکٹر دعاگو' (اگست ۱۹۶۴) تھے۔ دوسرے لفظوں میں پاکستان سے ڈاکٹر دعاگو ایک جلد میں اسی نام سے جبکہ ہندوستان سے تین جلدوں میں مختلف ناموں سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کی مرتب کردہ جاسوسی ناولوں (جسے جاسوسی دنیا کے مروجہ عنوان کے بجائے فریدی سیریز لکھا گیا ہے جو کہ غلط ہے) کی فہرست کا ۱۳۱واں ناول 'بھیانک جزیرہ' ہے۔ جس کے بعد 'ہیرے کی کان'، 'تجوری کا گیت'، 'آتشی پرندہ' اور 'خونی پتھر' کے نام غائب ہیں۔ انور اور رشیدہ کے مذکورہ ناولوں کو فہرست کے آخر میں علاحدہ سے درج کیا گیا ہے جو کہ درست نہیں۔ اس طرح ناولوں کے تسلسل میں فرق آتا ہے۔ مثال کے طور پر فہرست مذکورہ میں 'زمین کے بادل' سیریل نمبر ۷۰ پر دکھایا گیا ہے جبکہ یہ بات ہر خاص و عام کے علم میں ہے کہ یہ شہرہ آفاق ناول جس میں عمران اور فریدی کو پہلی اور آخری مرتبہ یکجا کیا گیا تھا، ابن صفی کی جاسوسی دنیا کا ۷۵واں ناول ہے۔ یہ اپنے نمبر کی مناسبت سے ڈائمنڈ جوبلی نمبر تھا اور ڈائمنڈ جوبلی نمبر کا مطلب ہوا ۷۵واں ناول۔ انور اور رشیدہ کے ناولوں کی علاحدہ فہرست میں سیریل نمبر ۲۴۶ پر ناول "آتشی پرندہ" کو "آتشی بادل" لکھا ہے جو کہ غلط ہے۔ آتشی بادل، عمران سیریز کا ناول ہے۔ اسی طرح سیریل نمبر ۲۴۴ پر ناول "ہیرے کی کان" کو "ہیرے کے کان" لکھا گیا ہے۔ ابن صفی نے انور اور رشیدہ کے سلسلے کے ناول 'بھیانک جزیرہ' ہی کے بعد تحریر کیے تھے۔ نیز صفحہ ۲۱۷ پر 'انور اور رشیدہ سیریز کے ناول' کے تحت 'ساڑھے پانچ بجے' اور 'پیش گوئی کا شکار' کے نام لکھے گئے ہیں جو کہ سرے سے غلط ہیں۔ 'ساڑھے پانچ بجے'، سراغرسی اور سسپنس پر مبنی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ 'پیش گوئی کا شکار' نامی کوئی کتاب یا ناول نہ تو ابن صفی نے تحریر کیا تھا اور نہ ہی یہ ان کی متفرق تحریروں کے کسی مجموعے کا نام ہے۔ نمبر ۹۳ پر ناول کا نام 'رائفل کا فتنہ' درج ہے جبکہ درست نام 'رائفل کا نغمہ' ہے۔ ناول نمبر ۱۰۶ اور ۱۰۷ بالترتیب "سائے کا قتل" اور "روشنی کی آواز" ہیں جو کہ ایک حیران کن بات ہے۔ ان ناموں کے ابن صفی نے ناول کبھی لکھے ہی نہیں تھے۔ خاکسار نے ابن صفی پر اپنی پہلی کتاب "کہتی ہے تجھ کو خلق خدا

غائبانہ کیا'' میں اس امر کی جانب اشارہ کیا تھا اور کہا تھا کہ ''ہندوستان میں ابن صفی کے اکثر ناولوں کے نام تبدیل کر دیے گئے ہیں'۔۔۔ جسے پڑھ کر'اردو بک ریویو' کے مدیر جناب عارف اقبال کا کہنا تھا کہ ان کے لیے یہ بات انکشاف کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ بھی دیکھنے والی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی مرتب کردہ مذکورہ فہرست کا ماخذ کیا ہے؟ اگر عباس حسینی مرحوم کے ادارہ نکہت، الہ آباد سے شائع ہوئے ناولوں کے ناموں کو یکجا کیا گیا ہے تب تو ٹھیک ہے، بصورت دیگر یہ معاملہ کسی ایک بھی جعلی ناول کے نام کی وجہ سے مشکوک ہو جاتا ہے۔ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ ہندوستان میں صفی صاحب کے ناولوں کی اشاعت کا اہتمام الہ آباد سے جناب عباس حسینی کیا کرتے تھے۔ آج بھی ہندوستان کے مختلف شہروں کے کئی گھروں میں یہ ناول محفوظ ہیں۔ اب آیئے عمران سیریز کے ناولوں کی جانب۔ سب سے پہلے تو یہ بات کہ ان ناولوں کے نمبر شمار کو جاسوسی دنیا کے ناولوں کے ساتھ تسلسل میں رکھا گیا ہے، غلط ہے۔ اس طرح عمران وفریدی کے ناولوں کی درست تعداد ایک نظر میں معلوم نہیں ہوتی۔ صفحہ نمبر ۲۱۵ پر عمران سیریز کا آغاز ''عام شمارے'' سے ہوا، اگلے صفحے پر ''خاص نمبر'' اور پھر ''سلسلہ وار ناول'' کے تحت یہ نام درج کیے گئے ہیں۔ اس طرح ان کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ سیریل نمبر ۱۹۶ پر ''زلزلے کا سر'' لکھا ہے جبکہ درست نام ''زلزلے کا سفر'' ہے۔ عمران سیریز میں ۱۶۴ پر 'چوتھی لکیر' کا نام درج ہے۔ عمران سیریز میں اس نام کا کوئی ناول نہیں ہے۔ شاید یہ ''چار لکیریں'' کا ذکر ہے جو عمران سیریز کا ناول نمبر ۳۰ ہے، یہ ناول اسرار پبلیکیشنز کراچی سے ۱۲ جولائی ۱۹۵۸ کو شائع ہوا تھا۔ واضح رہے کہ کراچی سے شائع ہونے والے ناولوں پر تاریخ، ماہ وسن اشاعت ابن صفی خود لکھا کرتے تھے۔ اسی مہینے ناول، نکہت الہ آباد سے شائع ہوتا تھا لیکن عباس حسینی ناول کے 'اداریے' میں تاریخ اشاعت نہیں لکھا کرتے تھے۔ ماہ وسن اشاعت (تاریخ نہیں)، ناول کے عقبی صفحے پر درج ہوتا تھا۔ عمران کے ناولوں میں بالترتیب سیریل نمبر ۱۴۵ اور ۱۶۵ پر ایک ہی ناول ''جہنم کی رقاصہ'' کو دو مرتبہ درج کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی اہم ہے کہ ابن صفی نے عمران سیریز کے کل ۱۱۶ ترتیب وار ناولوں کے علاوہ کل چار ایسے ناول لکھے تھے جن پر سیریل نمبر درج ہی نہیں تھا، یہ چاروں خاص نمبر تھے۔ جبکہ مذکورہ ناولوں کو بھی عمران کی فہرست میں بالترتیب ۱۷۳، ۱۷۷، ۱۷۸ اور ۱۷۹ پر درج کیا گیا ہے۔ (حوالہ: صفحہ نمبر ۲۱۶)۔ متفرق ناولوں/ مجموعہ مضامین میں ''ڈپلومیٹ مرغ''، ''پرنس چلی''، ''شمال کا فتنہ'' ''قابل اعتراض تصویر''، ''آدمی کی جڑیں'' اور ''شیطان صاحب'' کے نام موجود نہیں ہیں۔ ''شمال کا فتنہ''، عمران سیریز کی فہرست میں ۱۴۱ پر درج ہے جو کہ غلط ہے۔ واضح رہے کہ 'ڈپلومیٹ مرغ' ہندوستان میں غیر قانونی طور پر' کتاب والا، ۴۷۹۴، گلی جھوت والی، پہاڑی بھوجلہ، نئی دہلی سے شائع ہوا تھا۔ لیکن اگر یہاں بات ہندوستان اور پاکستان میں ابن صفی کے ناولوں کی غیر قانونی اشاعت کی کی جائے تو یہ اس قدر عمیق موضوع ہے اور اس میں اتنا کچھ کہنے کی گنجائش ہے کہ ایک علاحدہ مضمون کا متقاضی ہوگا۔ راقم الحروف کی درخواست پر شاگردِ ابن صفی، جناب مشتاق احمد قریشی نے اس پر حال ہی میں قلم اٹھایا ہے۔ دیکھیے صاحب! بات کچھ یوں ہے کہ اگر میں کسی ایسے موضوع پر کوئی دعوی کروں جس کا تعلق خالصتاً ہندوستان سے ہو تو لازم ہے کہ اس سلسلے میں میرے پاس مطلوبہ مواد ہونا چاہیے، بصورت دیگر غلطی کا

امکان رہے گا۔ مثلاً آج ہی کی بات لیجیے۔ دہلی سے (ابن صفی سیمینار کے تعلق سے) ایک صاحب کی ہنگامی ای میل آئی، دریافت کیا کہ ابن صفی نے اپنے کتنے ناولوں کا انتساب کیا تھا اور کن کن لوگوں کے نام کیا تھا۔ یہ بات طے ہے کہ سوال پوچھنے والے کے پاس کراچی ایڈیشن کے ناول موجود نہیں تھے۔ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب دینے کے لیے لازم ہے کہ ہم صفی صاحب کے کراچی سے شائع ہوئے تمام ''اوریجنل'' (اشاعت اول) ناولوں کو دیکھیں اور پھر کوئی بیان دیں۔ سو ہم نے دیا۔ اگر یہی سوال خاکسار ہندوستان میں کسی سے کرتا تو اس طرح کرتا کہ ''عباس حسینی'' نے ابن صفی کے نکہت کے تحت شائع کردہ کتنے ناولوں کا انتساب کیا تھا اور کن کن لوگوں کے نام کیا تھا؟۔۔۔ جواب اسی صورت میں درکار ہوتا جب میرے پاس یہاں نکہت کے ناول موجود نہیں ہوتے اور یوں میں کسی سے مدد کا طلبگار ہوتا اور اس سلسلے میں اپنی جانب سے کچھ بھی لکھنے کا مطلب سوائے ریکارڈ کو بگاڑنے کے، اور کچھ نہ ہوتا۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے مضمون ''ابن صفی کے جاسوسی ناولوں میں طنز و مزاح'' میں صفحہ ۱۹۶ پر درج ہے: 'آخری آدمی' ابن صفی کا آخری ناول ہے لیکن اس سے پہلے انھوں نے 'رات کا بھکاری' کے نام سے ناول لکھا تھا جو ان کے انتقال کے بعد ۱۹۸۰ میں شائع ہوا تھا۔ یقیناً ڈاکٹر صاحب کا اشارہ ہندوستان میں 'رات کا بھکاری' کی اشاعت کے سلسلے میں ہے، پاکستان (کراچی) میں 'رات کا بھکاری'، ابن صفی کی زندگی ہی میں شائع ہوگیا تھا۔ یہ ناول ۵ جون ۱۹۸۰ کو اسرار پبلیکیشنز سے شائع ہوا تھا۔ گزشتہ کل مناظر صاحب کی کتاب ''ابن صفی کے جاسوسی ناولوں میں طنز و مزاح'' (ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ ۲۰۱۳) یہاں کراچی میں جامی صاحب کے توسط سے موصول ہوئی۔ 'آمد' میں شائع ہوئی ناولوں کی یہی فہرست تمام تر غلطیوں کے ساتھ اس کتاب کے اوائل میں بھی شامل کی گئی ہے۔ یہاں یہ خوف دامن گیر ہوتا نظر آرہا ہے کہ اب کتاب مذکورہ میں شائع ہوئی اس فہرست کو ہندوستان میں ابن صفی پر تحقیق کرنے والے یقیناً بطور حوالہ استعمال کریں گے اور یوں اغلاط در اغلاط کا یہ سلسلہ طول پکڑتا جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب سے درخواست ہے کہ اس کے اگلے نسخے میں یہ اغلاط دور فرمالیں، نیز اس بات کا حوالہ ضرور دیں کہ یہ فہرست کس ادارے کے تحت شائع ہوئے ناولوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہے۔ نہایت بہتر ہوگا کہ اس فہرست کو ناولوں کی سلسلہ وار اشاعت (صرف جاسوسی ناول۔ باقی ناولوں کو متفرق کے عنوان کے تحت شامل کیا جائے) کے اعتبار سے مرتب کیا جائے۔ اس سلسلے میں ہیچمداں عرض کرتا ہے کہ صرف اور صرف ادارہ نکہت کے تحت جناب عباس حسینی کے شائع کردہ تمام ناولوں کے ایک مرتبہ بغور جائزے سے اس سلسلے میں پائے جانے والے تمام ابہام دور ہو سکتے ہیں۔ ''ابن صفی کے جاسوسی ناولوں میں طنز و مزاح'' کے پس ورق سے علم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی ایک اور کتاب ''ابن صفی کا سنسار'' زیر طبع ہے اور اس میں خاکسار کا ایک مضمون بھی شامل کیا گیا ہے۔ راقم الحروف اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا شکرگزار ہے۔ ''آمد'' کے بعد باسٹن کے سہ ماہی ''دیدہ ور'' میں بھی گوشہ ابن صفی شامل کیا گیا ہے۔ جامعہ ملیہ میں پہلی مرتبہ ہونے والے عظیم الشان ''ابن صفی سیمینار'' کی خبر تو آپ کو مل ہی گئی ہوگی۔ حال ہی میں دکن کے جریدے شگوفہ میں ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی کا ابن صفی سے متعلق مضمون شائع ہوا تھا۔ مضمون مذکورہ میں کئی فاش غلطیاں تھیں جن کی نشان دہی راقم نے جولائی ۲۰۱۲ کے شمارے میں ایک مکتوب کے ذریعے

کی۔ خاکسار نے چند روز قبل ''ابن صفی: فن اور شخصیت' مکمل کی ہے۔ جس کی اشاعت کے بعد، امید ہے کہ کئی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے گا۔ ان میں صفی صاحب کی تاریخ پیدائش سے لے کر ناولوں کی درست تعداد (بشمول عمران سیریز کے ناول 'بھیانک آدمی' کا جاسوسی دنیا کے تحت شائع ہونا) جیسے معاملے بھی شامل ہیں۔ پہلی کتاب ''کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا'' میں اگاتھا کرسٹی کے بارے ابن صفی، دیے گئے معروف بیان پر بھی تفصیل سے بات کی گئی ہے۔۔۔ اسی سلسلے میں ایک اہم بات عرض کرتا چلوں۔ جناب ابن صفی سے متعلق معلومات کے لیے مستند ترین (آفیشل) ویب سائٹس کے پتے یہ ہیں: www.ibnesafi.info اور www.wadi-e-urdu.com

دونوں ویب سائٹس غیر تجارتی یا نان کمرشل ہیں۔ مکرمی خان احمد فاروق سے نیاز مندی کو ایک برس ہونے کو آیا ہے۔ یہ میرے کرم فرما ہیں۔ خاں صاحب نے راقم الحروف کا ایک افسانہ ''خودکش'' (آمد کے لیے بھیج رہا ہوں) کا ہندی ترجمہ بھی کیا ہے جو ہندی جریدے 'آکار' اور بعد ازاں راجندر یادو کے ہندی پرچے 'ہنس' کے تازہ شمارے میں شائع ہوا ہے۔ خان احمد فاروق کا طویل مضمون نہایت محنت سے لکھا گیا ہے۔ ان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ راقم الحروف نے مذکورہ مضمون سے چند انتہائی اہم معلومات اپنی تازہ کتاب (زیر طبع) ''ابن صفی: فن اور شخصیت'' میں شامل کی ہیں۔ مضمون کے تعلق سے چند معروضات پیش خدمت ہیں۔ صفحہ ۲۰۷ پر لکھا ہے ''ابن صفی کی بہن عذرا ریحانہ آج بھی پاکستان میں بقید حیات ہیں''۔ عذرا صاحبہ کا انتقال ۲۰۰۵ میں کراچی میں ہوا تھا۔ صفحہ ۲۰۸ پر ہارپر کالنس کے شائع کردہ چند ناولوں کے نام درج ہیں۔ ان میں بھی کچھ نام غلط نظر آئے یعنی اوریجنل فہرست کے مطابق نہیں ہیں۔ ان میں عمران سیریز کے ''بہروپیا نواب''، چٹانوں میں آگ''، ''خوف کا سوداگر'' جبکہ جاسوسی دنیا کے ''جنگل میں لاش''، کنویں کا راز''، ''چال باز بوڑھا'' اور ''نقلی ناک'' شامل ہیں۔ معاملہ یہ نظر آتا ہے کہ چٹانوں میں فائر کو چٹانوں میں آگ، خطرناک بوڑھا کو چال باز بوڑھا، پراسرار کنواں کو کنویں کا راز اور مصنوعی ناک کو نقلی ناک کر دیا گیا ہے۔ ایسا کیوں کیا گیا ہے اور کیونکر اس کی ضرورت پیش آئی، متعلقہ لوگ بہتر جانتے ہوں گے لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ جناب ابن صفی کے رکھے اصلی عنوانات کو تبدیل نہ کیا جاتا۔ صفحہ ۲۱۰ پر لکھا ہے ''ابن صفی کے دیرینہ دوست اور ابن صفی ڈاٹ کام کے خالق محمد حنیف۔۔۔''۔ ہمارے مربی محمد حنیف، ابن صفی کے دوستوں میں سے نہیں تھے، بلکہ ان کی تو کبھی صفی صاحب سے باوجود کوشش کے، ملاقات بھی نہ ہو پائی تھی۔ براہ کرم اس کی تصحیح کر لی جائے۔ صفحہ ۲۱۱ پر خرم علی شفیق کی ''رانا پیلس'' کا ذکر ہے۔ یہ عرض کرتا چلوں کہ یہ کتاب آٹھ ماہ قبل کراچی سے شائع ہو گئی ہے اور اب اس سلسلے کی تیسری اور آخری کتاب ''دانش منزل'' شائع ہو گی۔۔ صفحہ ۲۱۳ پر فلم دھماکہ کا سن نمائش ۱۹۷۵ لکھا گیا ہے جبکہ درست ۱۹۷۴ ہے۔

نوٹ: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی مرتب کردہ فہرست میں کہیں کہیں کمپوزنگ کی خامیاں راہ پا گئی ہیں جس کے لیے ادارہ 'آمد' معذرت خواہ ہے۔ غالباً، ابن صفی کے ناولوں کی فہرست نکہت پبلی کیشن، الہ آباد کی ہندستانی اشاعتوں پر مبنی ہے۔ [ادارہ 'آمد']

● ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگل پور [بہار]: ''آمد''۔۵ بھی محفوظ رکھنے کے لیے اور بار بار استفادہ

کرنے کے لیے ہے۔ میں اس پر جلد ہی ''رنگ و بو'' [حیدرآباد] میں تبصرہ کروں گا۔ ابن صفی کے ناولوں کی فہرست میں ایک فاش غلطی راہ پا گئی ہے جس کی نشاندہی ضروری ہے۔ صفحہ ۲۱۶ اور ۲۱۷ پر ''عمران سیریز: سلسلہ وار ناول'' کے تحت کمپوزر صاحب اور پروف ریڈر صاحب نے اس نشاندہی کو کمپوز نہیں کیا ہے جس سے پتہ چل سکے کے کون کون سے ناول سلسلہ وار ہیں۔ یہ ایک تاریخی غلطی ہے۔ میں نشان زد کر کے وہ حصہ منسلک کر رہا ہوں تاکہ قارئین ریکارڈ درست کرلیں۔ میری دونوں کتابیں ''ابن صفی کے جاسوسی ناولوں میں طنز و مزاح'' اور ''ابن صفی کا جاسوسی سنسار'' منظر عام پر آچکی ہیں۔ پہلی کتاب کا اجرا ''غالب اکیڈمی، دہلی'' میں یکم نومبر کو ہوا۔ میں ''عبدالحلیم شرر ایوارڈ'' لینے کے لیے گیا تھا، پروفیسر اختر الواسع، وائس چانسلر ریاض پنجابی، ڈاکٹر فراز حامدی اور پریم گوپال متل کے ہاتھوں اجرا ہوا۔ کتاب جلد ہی بھیجوں گا۔ حسب وعدہ احتشام حسینؔ سے انٹرویو روانہ کر رہا ہوں۔

نوٹ :عمران سیریز: سلسلہ وار ناول کی مکمل فہرست ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی تصنیف ''ابن صفی کے جاسوسی ناولوں میں طنز و مزاح'' مطبوعہ: ۲۰۱۳ء، ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۔ ۶ کے صفحہ نمبر ۲۹ تا ۳۵ پر ملاحظہ فرمائیں۔ اس تعلق سے راشد اشرف [پاکستان] کا مکتوب [آمد ۔ ۶] بھی فہرست کی درستگی کے پیش نظر لائق مطالعہ ہے [ادارہ 'آمد']

● **عبدالرحیم نشتر، ناگپور [مہاراشٹر]** : اپنے رفیق دیرینہ مدحت الاختر سے ''آمد'' کے تین شمارے ملے۔ تین تا پانچ۔ ہر شمارہ ایسا ہے کہ کیا کہوں۔ تعریف و توصیف کے لیے الفاظ کم پڑ جائیں، پھر مشمولات پر اظہار خیال کے لیے تو گویا سمندر اچھالا پڑ رہا ہے مگر اسے حیطۂ تحریر میں باندھنے سے قاصر ہوں۔ ''آمد'' کے ذریعہ پہلی بار چند نئے ناموں سے واقف ہوا، اور یوں لگتا ہے کہ اب تک انھیں نہ پڑھ کر کس قدر محروم رہ گیا ہوں۔ ان ناموں میں سب سے نمایاں نام صفدر امام قادری صاحب کا ہے۔ گزشتہ شماروں میں بھی ان کی بے پناہ تحریریں شامل تھیں اور تازہ شمارے میں بھی وہاب اشرفی: شخصی حوالہ'' نہایت عمدہ تحریر ہے۔ اسی طرح ناوک حمزہ پوری سے متعلق جو تبصراتی تحریر ہے وہ بھی لاجواب ہے۔ ابن صفی اور وہاب اشرفی پر آپ نے بے مثال گوشے شائع کیے ہیں۔ افسانوں میں جیلانی بانو کا ''گوشت کی دکان'' اور طاہرہ اقبال کا ''شپلہ کے پھول'' مجھے بے حد پسند آئے۔ طاہرہ اقبال کو بھی پہلی بار پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ ''آمد'' کا ہر گوشہ، ہر شعر نہایت پُرکشش ہے۔ میں ان سب پر اظہار خیال کی اپنے اندر صلاحیت نہیں پا رہا ہوں۔ بس اتنا کہہ سکتا ہوں۔ مبارک ہو، بے حد مبارک ہو۔ ''آمد'' اسی طرح قائم و دائم رہے۔ (آمین) عبدالرحیم نشتر ستر اور اسی کی دہائیوں میں جدید غزل کا ایک اہم اور معتبر نام تھا۔ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۳ء تک جدید شاعری کے سالانہ انتخابات اور اس دور کے اہم ترین رسائل و جرائد کتاب، تحریک، صبا، پیکر، سب رس، آہنگ، مورچہ وغیرہ میں مسلسل شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۶۸ء میں ہندو پاک کی جدید اردو غزل کا انتخاب ''چاروں اُور'' شاہد کبیر اور مدحت الاختر کے اشتراک سے شائع کیا۔ دو شعری مجموعے ''اعتراف'' (۱۹۷۲) اور ''شامِ گراں'' (۱۹۷۸) میں شائع ہوئے تھے۔ مہاراشٹر، بہار، بنگال اور اتر پردیش کی اردو اکادمیوں کے انعامات بھی پائے ہیں لیکن گزشتہ دس پندرہ برسوں سے ادبی رسائل و جرائد سے بوجوہ غائب رہا اس لیے اس طرح کے تعارف اور اظہار کی ضرورت پیش آئی ہے۔ اب دوبارہ ادبی رسائل میں

جگہ ملنے لگی ہے۔ ''آمد'' کو دیکھ کر اس میں شائع ہونے کی شدید خواہش نے سر اٹھایا۔ لہٰذا یہ دس غزلیں آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔ یقین تو ہے کہ پسند آئیں گی۔ پھر بھی ممکن ہے آپ انھیں ناقابلِ اشاعت گردانیں۔ بہر حال اپنے فیصلے سے مطلع فرمائیں تو نوازش ہوگی۔

نوٹ : آپ کی دس خاص غزلیں اسی شمارے میں شاملِ اشاعت ہیں۔ اُردو ادب میں آپ کی واپسی کا دل سے استقبال ہے۔ خوش آمدید! [خورشید اکبر]

● **علی احمد فاطمی [الٰہ آباد]** : آمد کا تازہ شمارہ ملا۔ شکریہ۔ یہ شمارہ ہر اعتبار سے متوجہ کرتا ہے۔ دو اہم گوشے تو ہیں ہی۔ ناول پر دو اہم مضامین بھی ہیں۔ اس بار افسانے بھی نئے مزاج کے ہوں گے کہ ان میں زیادہ تر نام پاکستان کے ہیں۔ انھیں ضرور پڑھوں گا۔ میں سر دست آپ کے اداریہ سے متعلق چند باتیں عرض کرنا چاہوں گا کہ اس بار آپ کا اداریہ واقعی ایسا ہے جس پر نہ صرف بار بار گفتگو کی جائے بلکہ اس کی توسیع کی جائے۔ آپ نے اس مکمل گفتگو کا عنوان 'ادب کی جمہوریت' قرار دیا۔ بہت عرصہ کے بعد یہ ترکیب، یہ اصطلاح نظروں کے سامنے سے گزری ورنہ بہت پہلے ہمارے بزرگ ترقی پسند نقاد مجنوں گورکھپوری نے 'ادب اور زندگی' میں، احتشام حسین نے 'ادب اور سماج' وغیرہ میں ان موضوعات پر علمی و معروضی گفتگو کی تھی اور اس عہد کے قارئین نے پسند بھی کیا تھا لیکن جدید نقادوں نے اسے جارحانہ طور پر رد کیا اور خارجیت، سماجیت، نعرے بازی وغیرہ کا الزام لگایا۔ خوشی کی بات ہے کہ خورشید اکبر جیسا شاعر، دانشور اس موضوع پر اداریہ لکھ رہا ہے جو کسی سیاسی ایجنڈے سے وابستہ نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ ادب کی جمہوریت اور جمہوریت کا ادب دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اوّل کے بارے میں تو آپ نے لکھ دیا کہ تخلیق کا پہلا وظیفہ آزادیِ اظہار ہے۔ یہ تو ادب کی جمہوریت ہوئی کہ ہر ادیب و شاعر کو اپنی بات اپنے انداز سے کہنے کا حق ہوتا ہے۔ سردار جعفری نے ایک جگہ کبھی لکھا ہے کہ ادب میں سماج سے بھی بڑی جمہوریت ہوا کرتی ہے یہ الگ بات ہے کہ ادب کی گفتگو بھی ادبی و علمی انداز سے ہونا چاہیے [؟] کہ ادب بہر حال ایک تہذیبی عمل بھی ہوا کرتا ہے۔ دوسری بات سماج کی جمہوریت سے تعلق رکھتی ہے۔ یوں تو عمدہ ادب کی تخلیق کا کوئی پیمانہ یا شرط نہیں ہوا کرتی لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ عمدہ ادب اکثر کرائیسس کے دور میں تناؤ و تصادم کے دور میں حبس اور جبر کی فضا میں نمو پاتا۔ آپ نے بھی لکھا ہے کہ ''نامساعد حالات اور جبر و استبداد میں بھی تخلیق پنپ سکتی ہے۔'' میرا خیال ہے کہ ایسے ماحول میں دھاردار تخلیق زیادہ ہوتی ہے کہ حسیت پر جب قدغن لگتی ہے تو اس میں اشاراتی و معنیاتی کیفیت زیادہ پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی مقصدیت اور معنویت کے انداز بھی بدل جاتے ہیں۔ جیسا کہ ان دنوں پاکستان کے ماحول میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ تانیثیت وغیرہ کی جو لہر پاکستان میں ہے وہ ہندستان میں کم از کم اردو میں نہیں ہے۔ آزادی اور جمہوریت بلاشبہ عمدہ چیزیں ہیں لیکن اچھے ادب کے لیے جمہوریت ہرگز ضروری نہیں بلکہ کبھی کبھی نقصان دہ ہوتی ہے [؟] جیسا کہ فلابیر کے بلیغ اشارے میں دیکھا جا سکتا ہے لیکن آدمی اور آزاد زندگی کے لیے جمہوریت بہر حال مقدم و مقدس ہے۔ آپ نے قدیم ادب کی بہتری کی وجہ نقادوں کی غیر موجودگی یا عدم برتری بتائی ہے، ہو سکتا ہے یہ بات سچ ہو لیکن یہ ایک معمولی وجہ ہے۔ یہ سچ

ہے کہ فی زمانہ تنقید کا رول بڑھ گیا ہے اور آپ کا جو درد ہے وہ بھی سمجھا جا سکتا ہے، لیکن تنقید پھر بھی دوسرے نمبر کی چیز کل بھی تھی اور آج بھی ہے۔ عمدہ ادب کی تخلیق کے اسباب ہمیشہ سماجی اور سیاسی ہوا کرتے ہیں، ثقافت تو ایک میڈیم کی طرح کام کرتی ہے [؟] وہ خود اپنے آپ میں موضوع کم ہوتی ہے پھر بھی اس کے رول سے انکار نہیں۔ میں آپ کے اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا کہ ترقی پسندوں نے سیاسی ایجنڈے کے جبر سے کام لیا۔ [؟] یہ صحیح نہیں ہے۔ [؟] اوّل تو معدودے چند ترقی پسند ادیب تھے جو سیاسی پارٹی سے وابستگی رکھتے تھے ورنہ زیادہ تر کا تعلق کسی بھی سیاسی ایجنڈے سے نہیں البتہ زندگی سے تھا، عوام سے تھا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین دو طرح کے ترقی پسندوں کا گلدستہ تھی۔ ترقی پسند ہونے کے لیے پارٹی یا جماعت سے وابستہ ہونا ہرگز ضروری نہ تھا۔ سجاد ظہیر، فیض، سردار وغیرہ پارٹی سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی اپنے کسی مضمون، کسی خیال میں سیاسی ایجنڈے کی بات نہیں کرتے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا اپنا ایک الگ منشور تھا اور چونکہ یہ ادیبوں کی انجمن تھی اس لیے منشور بھی خالص ادبی و ثقافتی تھا۔ ان سبھی نے، احتشام حسین نے ادب کی ادبیت، شعر کی شعریت۔ جمالیاتی اقدار کی ہمیشہ حمایت کی۔ خود کارل مارکس جب زبان و ادب کی بات کرتا ہے تو اینٹی مارکس ہو جاتا ہے۔ یہ ضرور ہوتا ہے کہ جب رجحان تحریک کی شکل اختیار کرتا ہے تو پھر ہر طرح کے لوگ داخل ہو جاتے ہیں اور اچھی بری شاعری ہونے لگتی ہے لیکن گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ہم اچھی مثالوں کے ذریعہ ہی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہیں۔ جدیدیت کا سارا زور ترقی پسندی کے خلاف تھا لیکن وہ اس لیے نہیں چلا کہ کوئی بھی خیال، نظریہ محض مخالفت کی بنیاد پر زیادہ دیر تک نہیں کھڑا رہ سکتا جب تک اس کے اپنے خیالات و نظریات نہ ہوں پھر یہ بھی کہ وہ ایک بڑی حقیقت کی نفی کرنے کی غیر فطری و غیر فکری کوششیں کر رہے تھے جس میں وہ بری طرح ناکام ہوئے لیکن پھر بھی انجانے میں ایک کام تو ہوا ہی کہ شاعری میں نئی زبان اور کرافٹ میں قدرے تازگی آئی لیکن چند جینوئن شعرا کے یہاں جو اپنی روایت سے باخبر تھے۔ مابعد جدید کے حوالے سے آپ نے نئی نسل کے بارے میں جو کمنٹ کیے ہیں وہ غور طلب ہیں اور بڑی حد تک افسوسناک بھی۔ جسے آپ تجاہل عارفانہ کہتے ہیں میں اسے غلامانہ ذہنیت کہتا ہوں ساتھ ہی مفاد پرستی اور ضمیر فروشی بھی۔ ایک ادیب، اسکالر، پروفیسر کی سب سے قیمتی شے اس کی آزادانہ سوچ ہے۔ اظہار رائے کی بے باکی ہے، جرأت مندی ہے۔ آرزوئیں اور اُمنگیں ہیں لیکن وہ انسان اور انسانیت سے ہٹ کر صرف اپنی ذات اور مفاد تک سمٹ جائیں تو اس سے بڑی ادب اور ادیب کی توہین اور کیا ہوگی۔ شاعری اور فنکاری میں آزادی کے ساتھ ساتھ کج کلہی کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے اور اس کے بانکپن کا بھی۔ بہ قول مجروح۔ ''اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ''۔ بڑے کام اور بڑی سوچ کے لیے دنیاداری سے الگ ہٹ کر، افراد سے ہٹ کر اونکار و اقدار سے آنکھیں ملانے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ میں آپ کے اس خیال سے صد فی صد متفق ہوں کہ تنقید کا ایک بڑا کام ہم عصر تخلیق کا جائزہ لینا، اس کی ہمت افزائی کرنا اور فضا سازی کرنا بھی ہے جو ان دنوں ہرگز نہیں ہو رہا ہے۔ اسی لیے میں نے اپنے ایک مضمون (نئی تنقید کا سنگھرش) میں کہا تھا کہ تنقید بھٹک گئی ہے، گمراہ ہوگئی ہے اور گمراہ کر رہی ہے۔ مضمون ذرا سخت تھا لیکن مرحوم وہاب اشرفی نے پسند فرمایا تھا اور شاباشی بھی دی تھی۔ آپ کی بیشتر تجاویز

لائق توجہ اور لائق عمل ہیں۔ میں ان کی حمایت کرتا ہوں۔ آپ کے پاس ایک رسالہ ہے۔ پلیٹ فارم ہے۔ دوسروں کو تختۂ مشق بنائے بغیر، اہمیت دیے بغیر، آپ ان تازہ صورتوں، مسئلوں پر آج کے قارئین، شائقین و ناقدین کی زیادہ سے زیادہ توجہ مبذول کرائیے، یہی بڑا کام ہوگا۔ اردو کی ادبی صحافت میں ایسے کئی رسائل گزرے ہیں جنھوں نے جغادریوں کی طرف دیکھے بغیر نئی نسل کی آبیاری کی ہے، انھیں شاعر وادیب بنایا ہے جن کا اعتراف وہ کرتے رہے ہیں۔ 'آمد' اور خورشید اکبر یہ کام کرے تو اصلاً حق ادا ہوگا۔ چلتے چلتے ایک بات اور، ابن صفی کی طرف لوگوں کی توجہ کوئی منصوبہ نہیں ایک اشارہ ہے اس عوامی ادب، عوامی طبقہ کی طرف متوجہ ہونے کا جس پر بہت پہلے نظیر اکبرآبادی نے توجہ دی تھی لیکن شرفائے ادب نے اُسے بازاری شاعر کہہ کر راندۂ درگاہ کردیا تقریباً سو سال کے بعد نیاز فتح پوری نے ۱۹۴۰ء میں نگار کا نظیر اکبرآبادی نمبر نکال کر اور ترقی پسند ادیبوں سے پہلی بار ادب اور عوام، نظیر اور عوام، ادب اور جمہوریت جیسے موضوعات پر مضامین لکھوا کر ایک نئی بحث چلائی جو تحریک بن گئی اور دھنیا جیسی عورت اور کالو بھنگی اور منگو کوچوان جیسے مرد بڑے کردار بن کر تاریخ کا حصہ بن گئے نیز نئی جمالیات قائم ہوئی۔ نئے تصورات و نظریات سامنے آئے لیکن بعد میں پوری جدید تنقید اس تحریک و تنقید کے خلاف ہوگئی اور بقول آپ کے کہ ایسی دھول اُڑائی کہ ادب گم ہوگیا۔ نئے حالات اور ماحول کے جبر اور تقاضائے عصر کے تحت سب کچھ پھر سے بدل رہا ہے۔ زمانہ کروٹ لے رہا ہے اس کروٹ کو ہم نے اگر نہیں سمجھا اور وقت کے ساتھ نہیں چلے تو وقت ہمیں معاف نہیں کرے گا۔ اس نئی آمد کو آپ کا 'آمد' اپنے آپ میں جذب کرے اور پوری دیانت داری کے ساتھ نئے ادب و ادیب کو اپنائے، نئی نئی بحثیں چلائے، یہی کام ایک عمدہ مدیر کا ہے، ایک بڑے رسالہ کا ہے۔ بقول شاعر :

زندگی سے نظر ملا کے چلو
راستہ بس یہی بچاو کا ہے

اچھے شمارہ اور اچھے اداریہ کے لیے میں پھر مبارک باد دیتا ہوں۔

● **رؤف خیر، قلعہ گولکنڈہ [حیدرآباد]** : شہرِ تحقیق میں جناب عبدالسمیع نے رشید حسن خان صاحب کے بارے میں ان کی حیثیت کے مطابق ہی لکھا ہے۔ شہرِ اعتراف میں ڈاکٹر صفدر امام قادری صاحب نے ڈاکٹر وہاب اشرفی سے اپنے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے اور ان کا (بلکہ دونوں کا) ایک اچھا امیج ابھر کر سامنے آتا ہے حالاں کہ اس سے پہلے انھوں نے کلیم الدین احمد وغیرہ کے حوالے سے وہاب اشرفی کی تنقیدی بصیرت پر کھل کر لکھا تھا۔ وہ بھی حق ہے، یہ بھی حق ہے۔ ابنِ صفی کے تعلق سے ڈاکٹر خان احمد فاروق (کانپور) کا مضمون بے حد جامع ہے۔ انھوں نے ابنِ صفی کے فکر و فن کا بڑا اچھا جائزہ لیا ہے۔ ابوالخیر کشفی اور احمد صفی کے مضامین، میں 'الحمرا' اور 'مخزن' میں پڑھ چکا تھا۔ ہمارے ہاں حیدرآباد میں ایک افسانہ نگار ہوا کرتے تھے جو ابن صفی کو سخت ناپسند کیا کرتے تھے۔ میں نے اُن سے کہا تھا جو ابنِ صفی کو نہیں پڑھتا اُسے قلم نہیں پکڑنا چاہیے۔ میں تو جیمس ہیڈلی چیز کو بھی انگریزی کا ابن صفی کہا کرتا ہوں۔ میں نے ابن صفی ہی کی ناولوں کی طرح چیز کی بھی تقریباً سبھی ناولیں پڑھ رکھی ہیں۔ باقی تخلیقات بھی خوب ہیں چند منتخب تازہ غزلیں نذر ہیں، شائع فرما کر ممنون فرمائیے گا۔

● **راشد جمال فاروقی، دہرہ دون [اترا کھنڈ]** : گزشتہ شب فون پر عرض کر چکا ہوں کہ 'آمد' کے دونوں شماروں کا کچھ اسطرح مُطالعہ کر رہا ہوں کہ کبھی شمارہ ۔۴ کبھی شمارہ ۔۵ اور کبھی آپ کے اداریے اور قارئین کے خطوط کچھ احمد جمال پاشا، کچھ ابنِ صفی اور کچھ پروفیسر وہاب اشرفی کے تعلق سے بے ترتیب طریق پر یوں پڑھنا اور بھی لطف دے رہا ہے کہ دو چار دن کی چھٹیاں ہیں۔ تفصیلی مطالعہ کے بعد، انشا اللہ آپ کو اپنی رائے ضرور بھیجوں گا۔ آپ نے فون پر حکم دیا تھا کہ چند نظمیں ارسال کی جائیں، لہٰذا مختصر نظمیں ارسال خدمت ہیں اور ایک غزل بھی۔ چند چیزیں اس سے قبل بھی تھیں لیکن میرا اصرار ہرگز یہ نہ ہوگا کہ آپ اپنے معیار سے سمجھوتہ کریں۔ میری مرسلہ تخلیقات میں سے اگر کوئی آپ کے معیار پر کھری اترے تو شاملِ اشاعت فرمائیں ورنہ نہیں۔

● **ڈاکٹر ذکی طارق [غازی آباد]** : آپ کے ارسال کردہ پانچ شمارے موصول ہوئے۔ غازی آباد ایک صنعتی شہر ہے۔ اردو زبان وادب کے سلسلہ سے یہاں کوئی ادیب، شاعر نہیں ہے اور جو حضرات اردو کا دم بھرتے ہیں اُن سے مطالعہ کوسوں دور ہے۔ بہر کیف یہ پانچوں شمارے اپنے قریبی احباب کو جو شہر کے گردونواح میں قیام کرتے ہیں تقسیم کر دیے ہیں۔ شاید ''آمد'' کے ذریعہ اُن کا ذوقِ مطالعہ بیدار ہو جائے۔ 'آمد' کا ذکر سنا تھا لیکن پڑھنے کا اتفاق پہلی بار شمارہ ۴ کے ذریعہ ہوا۔ اور اس بات کی تصدیق ہوئی کہ پرچہ یقیناً آپ کی ادارت میں نکل رہا ہے۔ شعر وادب کی گوناگوں جہتیں لیے مختلف موضوعات پر جو مواد شاملِ اشاعت کیا گیا ہے وہ یقیناً ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُمید ہے کہ پانچواں شمارہ مزید آپ کی ذہانت کا ثبوت ہوگا۔ قیمت میں ابھی اضافہ نہ کریں تو بہتر رہے گا۔ سرِ دست ۱۰ غزلیں ارسال کر رہا ہوں شاید 'آمد' کے صفحات پر جگہ پاسکیں۔ آپ کی شاعری کے حوالے سے مضمون مکمل ہے۔ عنقریب اُس کو بھی Post کروں گا۔

● **ڈاکٹر ظفر مراد آبادی [نئی دہلی]** : سہ ماہی 'آمد' کی آمد مجھ تک تاخیر سے پہنچی پھر بھی بروقت پہنچی، اردو ادب کے تعلق سے یہ احساسِ کم تری دور ہوا کہ صرف پاکستانی ادبی رسائل زیادہ ضخیم اور معیاری ہوتے ہیں لیکن بے شمار شہر ایک ہی جریدے میں دیکھ کر مدیران کی خوش ذوقی اور خوش طبعی نے یقیناً متاثر کیا جو مدیران کی تخلیقی اور حساس فطرت کی ضامن ہے۔ ہر کام کے لیے ایمانداری اور دیانت داری بنیادی شرط ہے جواب تک کے تمام شماروں کی اساس ہے جس کے لیے مدیران یقیناً کلماتِ تحسین کے مستحق ہیں۔ موجودہ دور میں ادبی ادارے خواہ وہ سرکاری ہوں یا عوامی جو پروگرام پیش کرتے ہیں وہ زیادہ تر چبائے ہوئے نوالے دوبارہ سجانے کا کام کرتے ہیں۔ ابھی تک اقبالؔ، غالبؔ اور قدیم شعرا اور نثر نگاروں پر ہی سیمینار، مشاعرے اور تنقیدی مباحثے پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ آمد کے مشمولات میں اردو کے علاوہ دیگر زبان سے تراجم اور زندہ فن کاروں پر تجزیے نئی پیش رفت ہیں۔ ہم قدما سے صرفِ نظر نہیں کرنا چاہتے کیوں کہ وہ ہمارے ادب کے بنیاد گزاروں میں ہیں لیکن موجودہ ادب پرور فن کاروں کو نظر انداز کرنے کا جو چلن ہے وہ ختم ہونا چاہیے جس کے لیے 'آمد' نے پہل کی ہے اور نئے لوگوں پر تجزیے، تبصرے کے ساتھ ان کی فنی حیثیت کو اجاگر کرنے کی بنیاد ڈالی ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ ادب کی قدریں ہر دور میں تبدیلی کے مراحل سے گزرتی

ہیں لیکن ہر اقتداری سلسلہ اپنے تنظیمی اور بنیادی اصولوں سے تجاوز نہیں کرتا بلکہ یہ تبدیلی صرف وسائل کی حد تک ہوتی ہے اور وسائل یقیناً آئندہ بھی تبدیل ہوتے رہیں گے اور اسی کے سبب نئے اور پرانے ادب کا امتیاز بھی قائم رہے گا۔

● **جمال اویسی، محلہ فیض اللہ خاں، دربھنگہ [بہار]** : ''آمد'' کا پانچواں شمارہ دستیاب ہوا۔ تمھارا رسالہ پیش کش میں خوبصورت تو تھا ہی پانچواں شمارہ اور بھی حسین ہوگیا ہے۔ مبارک ہو! مگر شاید رسالہ کی لاگت پہلے سے بڑھ گئی ہو گئی؟ اداریہ میں تم نے میرے خط کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے اس کے متعلق کیا اظہار خیال کروں، سوائے اس کے کہ یہ خط برائے اشاعت نہیں تھا۔ کچھ اور باتیں جو تم لکھ گئے ہو ظاہر ہے کہ مجھے اچھی نہیں لگیں۔ لیکن تم نے فون پر کہہ دیا تھا تو اس کا خیال کیا۔ میں اپنے ہمعصروں اور ہم عمروں سے کچھ اور ہی توقع رکھتا ہوں جو شاید تم بھی رکھتے ہو گے۔ کیوں کہ ہمارا سامنا ایک سفاک ادبی دنیا سے ہے۔ اس مرتبہ رسالے کے مشمولات بہت متموّل ہیں۔ انور معظم صاحب کا مضمون اگر حاصلِ شمارہ کہا جائے تو مناسب رہے گا۔ ناول کے فن پر لکھے گئے مضامین بھی اچھے ہیں۔ گوشۂ وہاب اشرفی میں تاثرات کے ذیل میں فاروقی صاحب کی رائے جتنی وزنی اور پُر وقار محسوس ہوئی اسے شاید تم نے بھی محسوس کیا ہوگا۔ ابھی ابھی ''ایوان اُردو'' کا وہاب اشرفی نمبر آیا ہے۔ اس میں بہت سی تصویریں ہیں۔ ایک تصویر میں تم نارنگ صاحب سے محوِ گفتگو ہو، شاید تم نے دیکھا ہو۔ ابن صفی کا گوشہ، میں ابھی پڑھ نہیں پایا ہوں۔ اطمینان سے پڑھوں گا۔ ابن صفی آج بھی میری پہلی پسند ہیں۔ شاعری کے حصے میں اس بار جناب ظفر گورکھپوری کی غزلوں نے بہت متاثر کیا۔ بہت اچھی غزلیں ہیں۔ نظموں اور غزلوں کے حصوں میں اور بھی اچھی چیزیں ہیں لیکن اس بار ظفر گورکھپوری صاحب کی غزلوں نے مسحور کردیا۔ شمارے کے آخر میں ادیبوں اور شاعروں کے ایڈریس دے کر اچھا کیا۔ اور ہاں تمھارے اداریہ کا ہر لفظ پڑھا، قائل کردینے والی باتیں ہیں۔

پسِ نوشت: میری غزلوں کی کمپوزنگ میں کئی جگہ غلطیاں دَر آئی ہیں جن کی میں نشاندہی نہیں کر سکا جیسے ''نیا عہد سر سے گزرتا ہوا'' میں 'سر سے'، سرے ٹائپ ہوگیا ہے۔ [جمال اویسی]۔

● **ڈاکٹر حسن رضا، سابق استاد، شعبۂ اردو، رانچی یونیورسٹی رانچی** : سہ ماہی اردو آمد کے پانچوں شمارے ایک کرم فرما کی عنایت سے موصول ہوتے رہے۔ شمارہ کے سرورق 'ادب کے زندہ لہو کی گردش'۔۔۔ اور اس کے پہلے صفحہ پر 'نظریاتی ادعائیت کے خلاف کشادہ ذہنی رویوں کی دستاویز'۔۔۔ دیکھ کر ایک دلچسپی پیدا ہوئی۔ اب ان پانچ شماروں کو دیکھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اس میں محض کاغذ، قلم اور روشنائی کا استعمال ہی نہیں ہوا ہے بلکہ دردِ دل، سوزِ دماغ اور خونِ جگر سب شامل ہے۔ پہلا شمارہ جب ملا تھا اس وقت شبہ تھا کہ یہ آمد ہے یا آورد؟ کیوں کہ اس طرح کا شوق فضول عمر کی ایک خاص منزل میں پہنچنے کے بعد بعض ادیبوں اور فن کاروں کے اندر انگڑائیاں لینے لگتا ہے۔ خاص طور سے جن کا تعلق ادب سے 'اوما ملکت ایمانکم' کی طرح ہو لیکن چوتھے شمارہ تک کے مضامین و مشمولات کو دیکھ کر یقین ہوگیا کہ آورد نہیں بلکہ آمد ہے۔ چوتھے شمارے کے منظوم اداریے نے بھی اس یقین کو مستحکم کردیا۔ پوری نظم میں ایک خوب صورت روانی ہے۔ خصوصی طور پر آخری بند میں شاعری کی تخلیقی سطح ایک اعلا نورانی مدار کے اردگرد نئے عرفان، نورِ ایقان اور

نئے امکان کی متلاشی نظر آتی ہے۔ جو ادب کے بدلتے ہوئے منظر نامے میں ایک امید کی کرن بن جاتی ہے۔ تیسرے شمارے کا اداریہ 'ادب: سیاست کا ذیلی نظام' میں دستور اضافی کردار کے احتساب و تطہیر کا جیسا بھی سامان کیا گیا ہو، ادبی پرچے کے اداریہ نگار کا مقدس فریضہ ہر حال میں مجروح ہوتا ہے۔ یہاں اپنے دل کی دھڑکن کو بھی حیات و کاینات کی دھڑکن بنا کر پیش کرنا پڑتا ہے۔ اس میں واقعاتی اور ذاتی حوالے کا رنگ بہت نمایاں ہو گیا ہے۔ بت شکنی اچھی چیز ہے لیکن بتوں کو برا بھلا کہنے سے قرآن میں منع کیا گیا ہے۔ دونوں کے فرق کو سمجھنا چاہیے۔ موجودہ شمارے میں مسلم تہذیب میں حکمت بہ طور ماخذ علم پسند آیا ہے۔ علامہ حمید الدین فراہی نے حکمت قرآنی پر بہت اچھی بحث کی ہے۔ اس سے بھی استفادہ کرنا چاہیے تھا۔ فراہیؒ لکھتے ہیں۔ "تعلیم حکمت۔۔ صحابہ کرام کے بعد اس کے حامل بہت کم ہوئے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جب امت مسلمہ پر دنیا کے دروازے کھل گئے تو باہمی جھگڑوں اور بحثوں نے ان پر غلبہ پالیا اس کے نتیجے میں خلافت اور حکمت ان سے سلب کر لی گئی اور ان کے بجائے خلافت کی جگہ ملوکیت اور حکمت کی جگہ فلسفہ دے دیا گیا۔" (حکمت قرآن) اس شمارے میں عبدالوہاب اشرفی مرحوم کا تعزیتی اور ابن صفی کا خصوصی گوشہ قابل تحسین ہے۔ ڈاکٹر صفدر امام قادری نے شخصی حوالہ کے عنوان سے مرحوم کی شخصیت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے مضمون کے آخری پیراگراف میں بڑی فیاضی اور ایمان داری سے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ جس کی معنویت ان کے گزشتہ مضمون 'وہاب اشرفی بہ نام کلیم الدین احمد' کے پس منظر میں اور نکھر جاتی ہے۔ دونوں مضامین مل کر ڈاکٹر صفدر امام قادری کی دیانت دارانہ جرأت، بے مروّت تنقیدی جراحی اور بامروّت تعلّق اور ذاتی شرافت کی دلیل ہیں۔ اس کا اظہار بے جا نہ ہوگا کہ ڈاکٹر صفدر امام قادری کے تبصرے کھرے، بے لاگ اور مختصر لیکن بہت جامع ہوتے ہیں۔ وہ رسمی تبصرہ نہیں کرتے بلکہ تصنیف پر آڑی ترچھی نظر بھی ڈالتے ہیں، اہم نکات نمایاں کرتے ہیں۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی کی کتاب 'معاصر تنقیدی رویے'، 'بہار کی ادبی تاریخ نویسی اور مظفر اقبال کی تحقیق'، 'ناوک حمزہ پوری کی نقادی'۔۔۔ سب پر بامعنی تبصرہ کیا ہے۔ آخر میں ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ پانچویں شمارہ میں 'نادیدہ یلغار' تخلیق کی پوری آنچ سے محروم بڑا کچا افسانہ ہے۔ سورہ الاعراف کی آیت نمبر بھی غلط لکھی گئی ہے۔ 81 تا 84 کی جگہ پر 150 تا 157 ہے۔ خدا کرے ادب کے محاذ پر 'سہ ماہی اردو آمد' کی کوششیں ثمر بار ہوں۔

نوٹ: محترم حسن رضا صاحب، آپ کے تحسینی کلمات 'آمد' کی نمو پر بار احساں کی طرح ہیں جو ابرِ نیساں بنتے بنتے رہ گئے ہیں۔ آپ کی تلقینِ خاص لائق توجہ ہے۔ خیال رہے کہ خاکسار پیشہ ورانہ اداریہ نگاری کے گُر سے واقف ہے نہ اس کی ادبی روایت میں یہ شامل ہے۔ جس نفسیاتی اذیت کے تحت 'آمد۔۳' کا اداریہ معرضِ وجود میں آیا تھا اس سے نجات کی یہی ایک راہ تھی۔ کاش! آپ پس منظر سے آگاہ ہوتے! [خ۔ا]

● **اقبال حسن آزاد، مونگیر [بہار]** : آمد ۵ تقریباً دو ماہ قبل موصول ہوا تھا لیکن ۳۲۰ صفحات کے ضخیم رسالے کو پڑھنا اور پھر اس پر رائے دینا ایک دشوار عمل ہے۔ بہر کیف! شہر مدعا کے تحت میری تقی میر کا مشہور زمانہ شعر:

شعر میرے ہیں سب خواص پسند ❖ پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

اور Thomas A Harris اور walt whitman کی تحریروں کے اقتباسات آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں پر دال ہیں۔ خاص طور پر Thomas A Harris کی تحریر پڑھ کر قاری بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آپ کا اداریہ کافی تفصیلی ہے اور دل و ذہن کو مجبور کر رکھ دیتا ہے۔ ابن صفی کے تعلق سے آپ کا یہ کہنا صد فی صد درست ہے کہ ان کی تحریروں کو پڑھ کر ادب کے کتنے ہی لوگوں نے بامحاورہ، شگفتہ اور برجستہ نثر لکھنے کا ہنر سیکھا ہے۔ شاید خاکسار بھی انھی میں سے ایک ہے۔ حسب سابق آپ کا اداریہ بے حد جاندار اور شاندار ہے۔ آپ نے نہایت تفصیل سے ادب اور جمہوریت کے رشتے پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جمہوریت میں جہاں بہت ساری خوبیاں ہیں وہاں بے شمار خامیاں بھی ہیں اور دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں البتہ اس میں ادیب کو یہ فیصلہ لینے کی آزادی حاصل ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ شافع قدوائی نے مولانا ابوالکلام آزاد پر عمدہ مضمون تحریر کیا ہے جو نہ صرف معلوماتی ہے بلکہ بصیرت افروز بھی ہے۔ شہر نقد و نظر میں رحمان عباس کا مضمون ''ناول کا فن اور اردو ناول کی تنقید کا المیہ'' لائق مطالعہ ہے۔ افسانے حسب معمول عمدہ ہیں۔ جیلانی بانو کا افسانہ ''گوشت کی دکان'' اور محمد حامد سراج ''ہوٹل'' خاص طور پر پسند آئے۔ محمد حامد سراج کی تحریر پختہ اور رواں ہے۔ وہ کہانی کہنے کے فن سے بخوبی واقف ہیں۔ ماحول سازی میں تو انہیں کمال حاصل ہے۔ طاہرہ اقبال کا افسانہ ''شپلا کے پھول'' طویل ہوتے ہوئے بھی دلچسپ ہے۔ سندھی افسانہ ''باسی گوشت'' اپنے موضوع کے لحاظ سے ''باسی'' ہے لیکن ترجمہ نگار نے اس کا ترجمہ ایسی شگفتہ زبان میں کیا ہے کہ بے ساختہ انھیں داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ شہر اعتراف کے تحت وہاب اشرفی پر گوشہ خوب ہے۔ سارے مضامین عمدہ ہیں۔ صفدر امام قادری کا مضمون ''وہاب اشرفی...... شخصی حوالے'' لطف لے لے کر پڑھا۔ انہوں نے لیک سے ہٹ کر اپنی باتیں کہی ہیں اور یہی بات مجھے پسند آئی ہے۔ اس مضمون سے ڈاکٹر وہاب اشرفی کی شخصیت کے کئی ان چھوئے پہلوؤں تک رسائی ہوگئی۔ مبارکباد۔ ہمایوں اشرف نے وہاب اشرفی کی افسانہ نگاری پر اچھا مضمون تحریر کیا ہے۔ ابن صفی پر خصوصی گوشہ شائع فرما کر آپ نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ ابن صفی کی تحریر ''میں نے لکھنا کیسے شروع کیا'' نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ اس سے ان کے ادبی نظریات پر بھی بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ اور یہ تحریر آج بھی ریلیونٹ (Relevelant) ہے۔ مجنوں گورکھپوری کا مضمون کافی پرانا ہے اور لگتا ہے کہ انھوں نے ابن صفی کے محض تین چار ناولوں کو سامنے رکھ کر ہی اپنے خیالات پیش کیے تھے۔ پھر بھی تاریخی حیثیت سے اس مضمون کی خاصی اہمیت ہے۔ البتہ ابوالخیر کشفی کا مضمون لاجواب ہے۔ احمد صفی، راشد اشرف اور خان احمد فاروق نے بھی اچھے مضامین تحریر کیے ہیں۔ شہر ملال کے تحت شفیق فاطمہ شعری پر مختصر گوشہ بھی پسند آیا۔ بشر نواز، ظفر گورکھپوری، غلام مرتضی راہی، مشتاق جاوید، شمیم قاسمی، رئیس الدین رئیس، اور شعیب نظام کی غزلیں پسند آئیں۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ اردو فورم مونگیر کی ۵۳۰ ویں ماہانہ نشست کے لیے ''آمد۔ ۵'' میں مطبوعہ شعیب نظام کی غزل:

خود اپنی خاک پر اب خود ہی سلطانی کریں گے ہم ❖ اسی مٹی پہ رنگوں کی فراوانی کریں گے ہم

کے مصرع:

کہاں تک اتنے خوابوں کی نگہبانی کریں گے ہم۔

کو بطور مصرع طرح تجویز کیا گیا تھا اور اس موقع پر فورم کے کئی ممبران نے عمدہ غزلیں کہیں۔

صفدر امام قادری نے مظفر اقبال کی کتاب ''بہار میں اردو نثر کا ارتقا'' پر عمدہ مضمون لکھا ہے۔ یہ کتاب تلکا مانجھی بھاگلپور یونیورسٹی میں بی اے اردو آنرس کے نصاب میں شامل ہے اور اس لحاظ سے یہاں کے طلبا کے لئے مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ دیگر مشمولات میں ''پدم شری قاضی عبدالستار کا ایک ذاتی خط خورشید اکبر کے نام'' اور نسیم انصاری کی نظم ''تمھیں آمد مبارک ہو'' بھی رسالے کی زینت بڑھانے میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔ سراج، فیروز عابد، رئیس الدین رئیس، سعید ریاض اور وصیہ عرفانہ کے خطوط خصوصی توجہ کے حقدار ہیں۔

● **سلطان احمد ساحل، جمشید پور [جھارکھنڈ]** : سہ ماہی کتابی سلسلہ نمبر ۴ ''آمد'' بابت جولائی تا ستمبر نظر نواز ہوا۔ شمارے کے تمام تر ادبی محاسن آپ کی مخلصانہ کاوشوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ آپ کی ادبی کاوشیں قابل تحسین ہیں۔ سہ ماہی آمد کا ہر نقش ثانی پہلے سے کہیں زیادہ بہتر اور عمدہ ہے۔ مشمولات علم کے نئے زاویے کے ساتھ دل و دماغ کے دریچوں کو وا کرتے ہیں۔ آمد کی افادیت اور معیار تیزی کے ساتھ بلندیوں کی طرف گامزن ہیں، میری جانب سے دلی مبارکباد قبول فرمائیں! آپ کا منظوم اداریہ ''مکتی گیت'' کا اثاثہ خوب رہا۔ آپ کا تحریر کردہ ہر ہر لفظ اردو سے آپ کی محبت اور شفقت کی عکاسی کرتا ہے۔ دیگر مشمولات غزلیں، نظمیں، تنقید و تحقیق، افسانے، تبصرے، مضامین غرضیکہ کوئی صنف ایسی نہیں جو آمد میں نہ دکھائی دے۔ البتہ ایک چیز کی خاصی کمی محسوس ہوتی ہے اور وہ ہے طنزیہ و مزاحیہ تحریروں کی۔ اس طرف بھی توجہ فرمائیں۔ اس صنف پر اچھے اور مشہور لکھنے والوں کی کمی نہیں ہے کیوں کہ اس اسلوب بیان اور طرز تحریر سے ذہنی تناؤ میں کمی آتی ہے موجودہ دور کے حالات کے افراد کے لبوں پر تبسّم اور مسکراہٹ بکھیرنا اور چند لمحوں کے لیے اذلی تلخیوں کی شدت کو دور کرنا بھی ایک اچھا عمل ہے؟ شمارہ ہذا میں آپ نے اچھے مضامین کے خوش رنگ گلدستوں کو سجایا ہے جن میں کئی تخلیقات خاصے کی ہیں مثلاً ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اسیم کاویانی، ڈاکٹر ظفر کمالی، علی احمد فاطمی اور ادبی مکالمہ 'آہنکار' وغیرہ بہت سے افکار، مباحث اور بہت ہی تابناک حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں اور اپنی اپنی سوچ کو نئے زاویے عطا کرتے ہیں جو اپنی جگہ ایک الگ چھاپ چھوڑ جاتے ہیں! 'شہر غزل' اور پیش رو غزلیں دیکھ کر خوشی ہوئی: ندا فاضلی، کرشن کمار طور، ضیا فاروقی، شبیر رسول، شاہین، راشد جمال فاروقی، سلیم انصاری، علی عباس امید، ظفر اقبال ظفر، راجیش ریڈی اور احمد کمال حشمی کی غزلیں اور تمام نظمیں کافی پر مغز اور پسندیدہ ہیں، احساس اور ہم آہنگی کی کیفیت سے لبریز ہیں۔ 'شہر اعتراف': منو صدی کے نام اور فکر و فن میں تاثیر ہے، تحریک ہے، کرب ہے، اور ایک الگ قسم کا احتجاج بھی ہے جو ایک عرصہ سے اردو ادب کے افق پر روشن ہیں۔ تجزیہ کے تحت معلوماتی نوعیت کو اہمیت دے کر سلیقے سے تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے! فنی اعتبار سے آپ بامعنی افسانوں کے ذریعے تجربوں کو آگے بڑھانے کی پیہم کوشش میں مصروف ہیں۔ افسانوں میں موضوعات کا تنوع اور مروجہ تکنیک کی بجائے کہانی کو اپنے طور پر برتنے کی جرأت پائی جاتی ہے۔ اقبال مجید کی کہانی بعنوان ''معجزہ'' جہد و عمل اور علم و دانش کی برکتوں کو جذباتی طور پر بیان

کرتے ہوئے مذہب، خدا، علم، نیکی، پاکیزگی، وفاشعاری اور روحانی قدروں کی افادیت اور اپنی ذات کے انکشاف کے لیے کائنات کے پہلو کا تجزیاتی سفر پیش کرتی ہے تاکہ زندگی اس کی نظر سے اوجھل نہ رہنے پائے! اقبال حسن آزاد کی کہانی بعنوان ''حصار'' زمانے کی بدعنوانی، جو ہماری زندگی کی روزمرّہ میں شامل ہوگئی ہے اور مہلک بدبو کی طرح سماج اور معاشرے کو اپنی گرفت میں لے چکی ہے، متوجہ کرنے میں کامیاب ہے لیکن ہم پھر بھی اس مہلک پھیلتی ہوئی بدبو سے انجان اور غافل ہیں۔ انور امام کا افسانہ بعنوان ''مکڑی'' ایک نئی سوچ اور فکر کی تیزابی کیفیت لیے ہوئے ہوس کی لاعلاج بیماری کی طرف اشارہ کرتا ہے جو پڑھنے والوں کو پوری طرح سے اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔ افسانہ میں ساوتری کا یہ کہنا: ''ماں! اگر میں نے شادی کرلی تو غضب ہو جائے گا۔ وہ مجھے نہیں سمجھ پائیگا اور مجھے پا کر سوچے گا کہ اُس نے کچھ کھو دیا ہے اور بالکل یہی کیفیت میری بھی ہوگی۔ ماں میں ایک ایسی بنجر دھرتی ہوں جسے سیراب کرتے کرتے وہ مر جائے گا، لیکن میری پیاس پھر بھی نہیں بجھے گی''۔ افسانہ کا یہ نچوڑ قاری کو اپنے ساتھ باندھے رکھتا ہے۔ زبان اور بیان کی منظرکشی بھی قابلِ تعریف ہے۔ ویسے 'مکڑی' افسانہ جنونی کیفیت کے موذی مرض میں مبتلا ایک جنونی قسم کا جرم بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ رسالے کی کامیاب اشاعت کے لیے دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ میری نیک تمنائیں اور دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

● **محمد ضیاء الاسلام رضوی، سبور، بھاگل پور [بہار]** : 'کئی رفتگاں پر مشتمل' 'آمد' کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ ابن صفی پر خصوصی توجہ وقت کی ضرورت بھی ہے اور ہم جیسوں کے لئے باعثِ تسکین بھی۔ ایک طرف آپ ادب کے جمہوری کردار کی بحالی کی بات کرتے ہیں اور دوسری طرف لوگ فحش نگاری اور عریاں نگاری پر نمبر نکال کر قاری کو تذبذب میں ڈال رہے ہیں۔ ادب، شعور کی تربیت کرتا ہے مگر صورتِ حال سے یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ جیسے پھر کسی رجحان کو ادب کے سر پر لادنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اللہ، قارئینِ اردو ادب پر رحم کرے۔ یا پھر یہ شعوری تگ و دو 'موت کی کتاب' جیسی تخلیق کو جواز فراہم کرنا بھی ہو سکتا ہے اور آئندہ کے لئے زمین ہموار کرنا بھی۔ آپ کا اداریہ قابلِ غور ہے اور ادب کو صحیح سمت و رفتار دینے والا ہے۔ اتنا اچھا رسالہ نکالنے پر مبارک باد۔

● **کہکشاں تبسم، بھاگل پور [بہار]** : امید ہے بخیر ہوں گے۔ 'آمد' ملا شکریہ۔ ہمیشہ کی طرح اداریہ قابلِ غور و فکر ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم ذہنی طور پر ناقدوں کے غلام ہو گئے ہیں۔ امپورٹ شدہ نظریات سے شعر و ادب کے نمونے پر کھے جا رہے ہیں۔ جو ان طئے شدہ فارمولوں پر فٹ نہیں ہوتا اسے خارج کرنے کا رجحان اپنی جڑیں گہری کرتا جا رہا ہے۔ آپ کا خیال سوفی صد درست ہے کہ جب ناقدوں کا وجود نہیں تھا تو زیادہ بہتر، زندہ اور توانا ادب تخلیق کیا گیا۔ آج فارمولا سامنے رکھ کے ادب خلق کرنے کی کوششیں ہیں تو ایسی مصنوعی تخلیق کی زندگی کا ثبات کیا۔ یہ پروجکشن کس کے مفاد میں ہے۔ فن کے، فن کار کے، قاری کے یا ناقد کے ؟ بظاہر تو ناقدوں کی دکان داری پروان چڑھ رہی ہے۔ کوئی ایسا ادبی شہ پارہ سامنے نہیں آتا جو دور تک اور دیر تک قاری کے ذہنی سفر کا ساتھ دے۔ جب کہ تجزئے، تبصرے اور تنقیدی محاکمے کا بازار آسمان چھو رہا ہے اور بیشتر فن کار دست بستہ صف باندھے ناقدین کی ڈیوڑھی پر حا

ضرا اپنے مقدر کی باریابی کے منتظر ہیں۔ گرافٹنگ کا عمل جدت طرازی کا مظہر تو ہے مگر اس کا ہماری تہذیبی اور ثقافتی آب وہوا سے ہم آہنگ ہونا بہت ضروری ہے ورنہ یہ پودا کتنا ثمر آور ہوگا ؟ ایسی کوششیں تو رائیگاں ہی ٹھہریں گی لیکن خسارہ تخلیقی کاوشوں کا ہوگا۔ آج کا ہمارا شعروادب لوک کلچر سے دور ہو گیا ہے۔ دیسی روایتیں ماضی کا حصہ بن چکی ہیں ۔اصلی جڑوں سے توانائی کی کشید بے معنی ٹھہرائی جارہی ہے۔ پاؤں کے نیچے زمین ندارد ہے اور وجود جیسے خلا میں معلق۔ نہ ستاروں کی تابانیاں ہی مٹھی میں ہیں نہ تلووں پہ مٹی کا نم۔ بے جڑ کے پودوں کی یہ فصل بس گملوں میں اگائی اور سجائی جارہی ہے کہ دہلیزوں کی رونق ہری بھری رہے۔ ایسی مصنوعی اور میکانکی فضا کے سحر کو توڑنا ضروری ہے۔ دنیا بھر کے شعروادب کا مطالعہ بھی ہونا چاہئے اور ان سے استفادہ بھی لیکن اپنی تہذیبی' ثقافتی اور ادبی روایات کے فطری رجحانات اور آفاقی قدروں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کا ردوقبول ہونا چاہئے۔ کیوں کہ آنکھیں بند کر کے آگ میں کود پڑنے کا عمل آتشِ نمرود کو گلزار تو نہیں کر سکتا۔ اس کہرآلود فضا میں گم ہم عصر تخلیق کاروں کی حوصلہ افزائی بھی ہونی چاہئے اور ساتھ ہی نئی فکر کے حامل اذہان پر بھی توجہ دینی چاہئے کہ وہ اپنے عہد کی ادبی کاوشوں کا جائزہ لیں۔ محض نظریات کی روشنی میں تخلیق کی چھان پھٹک نہ ہو بلکہ اس کے بطون میں جھلک مارتے خیال وفکر اجاگر کئے جائیں اور دیانت داری کے ساتھ جائزے یا محاکمے سامنے آئیں۔ نام نہاد ناقدین کو جو کام کرنا تھا وہ کر چکے اب ان کو ٹارگٹ کرنے کے بجائے نئے اذہان کو دعوتِ فکر دی جائے کہ وہ بنا کسی لاگ لپیٹ اور تحفظات وتعصبات کے وسعت نظری کے ساتھ اپنے ہم عصروں سے مکالمے قائم کریں پھر دیکھیں گے کہ موجودہ منظر نامہ کس طرح بدلتا ہے اور سکہ رائج الوقت کیسے چلن سے باہر ہوتا ہے بس شرط ادبی خلوص اور دیانت داری کی ہے۔ یہ چند باتیں اداریہ پڑھتے ہوئے ذہن میں آ گئیں تو لکھ دیا۔ ایک بات اور ابن صفی پر گوشہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی میرے خیال میں وہ واحد لکھاری تھا جس نے اردو سماج کو چائے خانوں سے لے کر درس گاہوں تک اور جھونپڑوں سے لے کر محلوں تک اپنی کرشماتی تحریر سے جوڑے رکھا۔ ایسی ناقابل فراموش شخصیت پر خصوصی توجہ دینی ہی چاہئے۔ پورا رسالہ پڑھنا تو ابھی باقی ہے۔

● **تفضیل احمد** [موتی ہاری] : 'آمد' کے چار شمارے تواتر سے زیر مطالعہ آچکے ہیں۔ گذشتہ اداریوں اور تازہ منظوم اداریہ بشمول دیگر مناسب اور غیر مناسب تحریروں سے یہ تاثر پختہ ہوتا نظر آرہا ہے کہ آپ کو بھی معاصر ادبی جمگھٹ کے نشیب وفراز سے نبرد آزما ہونا پڑا جس نے آپ کو ایک بے باک بولتا ہوا اسٹیج دے کر سنبھال لیا ہے۔ رسالے پر مخصوص رنگ کے اثرات عموماً تخلیقیت کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔ صحت مند اور مہذب علمی اختلافات کی ہر زمانے میں ضرورت رہتی ہے جبکہ شخصیت پرستی سمِ قاتل ہے۔ خبر نامہ شب خون، دہلیز اور دیگر اشاعتوں میں 'آمد' کا ردِ عمل بھی دیکھنے کو ملا۔ لب ولہجہ سنبھالے رکھیے تو بڑے کام ہو سکیں گے۔ تنقیصی مراسلات اور تاثرات پر قینچی چلانے کا حق بہر حال مدیر کو حاصل ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب تک ناگزیر نہ ہو تحریروں کے نیچے اپنا موقف لکھنے سے احتراز زیادہ مناسب ہے۔ رسالے میں ناولوں کی اشاعت کا سلسلہ بطور خاص پسند آرہا ہے۔ احمد جمال پاشا کی طرح بھولے بسرے متعدد فن کار 'آمد' کے صفحات پر جلوہ افروز ہو سکیں تو خوشی ہوگی۔ آمد ۴ کے صفحۂ آخر پر شائع تحریر میں

پوشیدہ کسک متاثر کن ہے۔ 'آمد' کے لیے دس خاص غزلیں لے کر حاضر ہوں۔ اب آپ جیسا بہتر سمجھیں کریں۔ تازہ شمارہ بھی غالباً آنے ہی والا ہوگا۔

● **معراج احمد معراج، کلٹی** [مغربی بنگال] : 'آمد' کا چوتھا شمارہ دستیاب ہوگیا ہے۔ اس کے مطالعے نے بڑی ذہنی آسودگی بخشی اور ایسا محسوس ہوا کہ عظیم آباد سے نکلنے والا یہ رسالہ خالص ادبی تخلیقات کا مرقع ہے جس میں ساری اردو کی کائنات سمیٹ دی گئی ہو۔ برسوں سے ایک ایسے رسالے کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی جس میں ادب کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہ ہو اور جس میں معتبر قلم کاروں کے رشحات شاملِ اشاعت ہوں، سواب یہ امید بر آئی۔ آپ کا منظوم اداریہ واقعی لائقِ ستائش ہے، اس کے علاوہ ندا فاضلی، شکیل اعظمی اور شہپر رسول کی غزلوں نے دل کو چھولیا۔ ڈاکٹر ظفر کمالی کا مضمون 'ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ' عمیق مطالعے کا نتیجہ ہے۔ سعادت حسن منٹو کے تعلق سے جو بھی تخلیقات شامل ہیں وہ سب بہت معلوماتی ہیں۔ اقبال مجید کا افسانہ 'معجزہ' ان کے تجربات زندگی کا آئینہ ہے۔ ہر شمارے کی طرح یہ شمارہ بھی ایک شاہکار ہے۔

● **ڈاکٹر سحر افروز، شعبۂ اردو، جی۔ ڈی۔ کالج، بیگوسرائے** [بہار] : ''آمد'' کے لیے شکریہ۔ ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت لگا۔ آپ کو مبارکباد۔ 'آمد' میں دو خاص چیزیں ہوتی ہیں: ''اداریہ'' اور خطوط پر آپ کے نوٹ۔ اداریہ تو آپ کا زبردست سے زبردست ہوتا جارہا ہے، واقعی۔ نوٹ ہونا چاہیے، اچھا لگتا ہے۔ 'ابنِ صفی' کا گوشہ تھوڑا ادھورا لگا۔ تقریباً سارے لوگ بہت دنوں سے ابن صفی کو پڑھ رہے ہیں، پڑھتے ہیں، ان کے کرداروں کو ذاتی زندگی میں بھی جینے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے لگا کہ تھوڑی کمی رہ گئی اور بڑے صفحات پر اسے لے جایا جاسکتا تھا۔ بہر حال، یہ میری ناقص رائے تھی۔ جیلانی بانو کا افسانہ بالکل حقیقت پر مبنی ہے۔ اچھا لگا کیا کہ یہ دیکھی ہوئی بات بھی ہے۔ غزلوں اور نظموں کا انتخاب بلکہ شاعری کا انتخاب آپ کا لاجواب ہے۔ خدا کرے آپ کی محنت ہمیشہ یوں ہی رنگ لاتی رہے۔

نوٹ: ابنِ صفی کا گوشہ آپ کو تشنہ لگا اور مجھے اپنی نارسائی کا عرفان ہوا۔ ویسے 'پسند اپنی اپنی، خیال اپنا اپنا'۔ [خورشید اکبر]

● **اصغر شمیم، کولکاتہ** [مغربی بنگال] : ''آمد'' کے کتابی سلسلے کا پانچواں شمارہ اور دوسرے سال کا پہلا شمارہ موصول ہوا۔ پرچہ اپنے ٹائٹل سمیت اپنے مندرجات کے طور سے بہت خوب ہے۔ آپ نے بہت محنت سے رسالے کا معیار بلند کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''آمد'' اپنی علاحدہ پہچان بنانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کو اچھے لکھاری دوستوں کا ساتھ بھی میسر آگیا ہے۔ آپ کا اداریہ ''ادب کی جمہوریت'' بہت سے سوالات قائم کرتا ہے۔ وہاب اشرفی اور ابن صفی پر گوشے بہت پسند آئے۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ''آمد'' کا یہ شمارہ ۳۲۰ صفحات پر مشتمل ہے لیکن شعری حصے کے لیے صرف ۴۰ صفحات......... کیوں؟؟ ویسے آپ بھی بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں — — پھر شعری حصے کے ساتھ ایسی ناانصافی کیوں......؟ خیر غزلیں، نظمیں اور افسانے حسبِ معمول اچھے اور قابلِ توجہ ہیں!!

نوٹ : برادرم، اس بار شعری حصے کے صفحات میں قدرے اضافہ کیا گیا ہے۔ [خورشید اکبر]

● ڈاکٹر حنا افشاں، شعبۂ اردو، دیا نند پی۔ جی۔ کالج، کانپور [یوپی] : آمد کا نیا شمارہ ملا۔ ہر شمارہ آمدِ بہار کی روداد معلوم ہوتا ہے۔ پڑھنے، سمجھنے اور سوچنے کے لیے کیا نہیں ہوتا۔ مثلاً اس بار کے دونوں گوشے: وہاب اشرفی کے گوشے میں قمر رئیس اور محمود ہاشمی کے مضامین پرانے ہونے کے باوجود اس گوشے میں ضروری تھے۔ صفدر امام قادری کا مضمون اچھا ہے۔ اسی کے ساتھ ہی سرور حسین کا مضمون بھی توجہ طلب ہے۔ ابن صفی کے گوشے پر بھی آپ نے خاصی محنت کی ہے۔ کئی مضامین جو اب مشکل سے ہی ملتے ہیں آپ نے انھیں تلاش کر کے شائع کر دیا ہے، جس سے ابن صفی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ خاص طور پر ابوالخیر کشفی اور مجنوں گورکھپوری کے مضامین۔ دیگر مضامین میں خان احمد فاروق اور لئیق رضوی کے مضامین خاصے اچھے ہیں اور ہمیں ابن صفی کے تعلق سے نئی اطلاعات فراہم کرتے ہیں۔ وقت کا کھیل بھی خوب ہے۔ بزرگانِ ادب نے ابن صفی کو ادب کے ڈسٹ بن میں ڈال رکھا تھا لیکن وہ بہر حال وہاں سے نکل آئے اور اب فی الحال تو ان کا ہی ڈنکا بج رہا ہے اور بڑے بڑے تنقید نگار بھی ان کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ اس بار آپ کا اداریہ بہت اہم ہے۔ یہ اداریہ نو واردانِ ادب کے لیے سوچنے اور سمجھنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ آپ نے جو سوال اٹھائے ہیں وہ یقیناً اہم ہیں اور اس نہج پر سوچنے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہی صورت حال انور معظم کے مضمون کی بھی ہے۔ ان کا مضمون بے حد سنجیدگی سے پڑھا جانے والا مضمون ہے۔ پڑھتے وقت ذرا سی بھی لاپروائی نفسِ مضمون کو سمجھنے میں مشکل پیدا کر سکتی ہے۔ آپ دونوں مدیران مبارک باد قبول کیجیے۔ شافع قدوائی کا مضمون بھی پُر مغز ہے۔ رحمان عباس کا مضمون بھی خوب ہے۔ افسانوں میں جیلانی بانو کا افسانہ ''گوشت کی دکان'' دیر تک ذہن پر حاوی رہا۔ انھوں نے انسانی نفسیات کی بہت اچھی تصویر کشی کی ہے۔ حسن جمال کی 'نادیدہ یلغار' بھی اچھی لگی۔ شاعری میں ظفر گورکھپوری، شمیم قاسمی اور احتشام اختر کی غزلیں پسند آئیں۔ آخر میں بس اتنا کہ ''آمد'' کے اس شمارے نے اگلے شمارے کے انتظار میں شدت پیدا کر دی ہے۔

٭٭٭
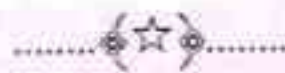
خصوصی گزارش

جن ادبا، شعرا، قارئینِ کرام کو 'آمد' شمارہ نمبر ۳ سے بھیجا جا رہا ہے ان کے زرِ تعاون کی مدت 'آمد' کے چھٹے شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ اس لیے متعلقہ حضرات سے خصوصی گزارش ہے کہ فوراً سے پیشتر تجدیدِ خریداری پر توجہ فرمائیں۔ ساتھ ہی جن احباب نے ابھی تک 'آمد' کی سالانہ رُکنیت قبول نہیں فرمائی ہے اور انھیں بدستور پرچہ ارسال کیا جا رہا ہے ان سے بھی اس سمت میں عملی پیش قدمی کی توقع ہے۔ امید کہ ہماری اپیل پر لبیک کہہ کر آپ اردو نوازی کا ثبوت فراہم کریں گے اور 'آمد' کے تسلسل کے ضامن بھی بنیں گے۔ [ادارہ 'آمد']

مصنّفین کے پتے

- Prof. Shamim Hanfi, B-114, Zakir Bagh, Jamia Nagar, New Delhi- 110025
- Prof. Abul Kalam Quasmi, Dept. of Urdu, A.M.U., Alighar-202002 (U.P.)
- Iqbal Majeed, B-132, Housing Board Colony, Koh-e-Fiza, Bhopal - 462001 (M.P.), Mob. : 09893764746
- Abid Suhail, 22-SP, Sector- "C", Aliganj, Lucknow-226024 (U.P.), Mob. : 08052630407
- Ratan Singh, A-402, Beta-1, Greater Noida, Dist. Gautam Budha Nagar (UP) PIN - 201301, Mob. : 09911146994 / 011202326378
- Dr. Jafar Askari, 239-Mumtaz Mahal Compound, Gola Ganj, Lucknow-226018, (U.P.) Mob. : 09956323840
- Manazir Ashique Harganwi, 'Kohsar', Bhikhanpur, Gumiti No. - 3, Bhagalpur - 812001 (Bihar) Mob. : 09430966156
- Dr. Akbar Mahdi Muzaffar, Deptt. of Urdu, Saket P.G. College, Ajodhya, Faizabad, E-mail: urdu.saket@gmail.com, Mob.: 91 9454326552
- Syed Ameen Ashraf, 4/54, Gul-e-Samnan, Badar Bagh, Aligarh - 202002 (UP), Mob. : 09359858735 / 0571-2706272
- Krishna Kumar Toor, 134/E-Khanyara Road, Dharmsala-176215, Himachal Pradesh
- Saba Ekram (N. Haque), G.M. Admin & H.R. Cornpak Limited, Plots-11 & 26, Sector-20, Korngi Industrial Area, Karachi-74900 (Pakistan), Mob. : 00923002164282 / 0092213203206
- Midhatul Akhtar, Warispura, Kamti-441002 (Maharashtra), Mob. : 07109282202
- Qaus Siddiqui, Mohalla- Mahatwana, Phulwari Sharif, Patna-801505 (Bihar), Mob. : 09931713567
- Abdul Rahim Nashtar, Plot No. 43, Second Floor, Geeta Colony, Mahesh Nagar Road, Nagpur-13, Mob. : 09272908151
- Suleman Khumar, LIG-83, Jal Nagar, Bijapur- 586109 (Karnataka), Mob. : 09341722005
- Rashid Taraz, Moh.- Dilawarpur, P.O.- Munger, PIN Code-811201 (Bihar), Mob. : 09341722005
- Mannan Bijnori, G-3, OM Sai Ekta HSG Society, A-Wing, Gilbert Hill Road, Andheri (W), Mumbai-400058, Mob. : 09224664615

- Dr. Zaki Tarique, 564- Kela Road, Gaushala Phatak, Ghaziabad-201009 (U.P.), Mob. : 09818860029
- Rashid Jamal Farooqui, C-1452, I. D.P.L Township, Virbhadra (Rishikesh) Dehradun- 249202 (Uttrakhand), Mob. : 09456753096
- Meraj Ahmad Meraj, At-Neechu Gram, P.O.- Kulti, Dist. Burdawan PIN Code - 713342, (W.B.) Mob. : 09734722994
- Sohail Akhtar, JM (D), IDCO Tower Janpath, Bhubaneshwar-751022, Mob. : 09437044651
- Dr. Zafar Moradabadi, 1889 F.F., Gali Kohlian, Suiwalan, New Delhi-110002, Ph. : (R) 011-23251809, Mob. 09958345584
- Hanif Sahil, 14-Ashiana Park, Mahemadabad - 387130, Dist.- Kheda, (Gujarat), Mob. : 09427597795
- Dr. Ali Abbas 'Ummid', 01, Star Residency, Idgah Hills, Bhopal-462001 (M.P.)
- Dr. Nisar Jirajpuri, 67- Jalandhari, Azamgarh-276001 (U.P) Mob. : 09198558492 / 08960378862
- Tariq Mateen, C/o.- Kohinoor Computer, Near Jama Masjid, Topkhana Bazar, Munger-811201, Mob. : 07549807809
- Qurban Atish, Khetari Mohalla, Ara - 802301 (Bihar) Mob. : 09304085344
- Tafzeel Ahmad, Homeo Medicine, Ganja Chowk, Motihari-845401, East Champaran (Bihar) Mob. 9709802163
- Hasan Iqbal, 43 A/48, Nai Abadi Nagla, Mewati Tajganj, Agra-282001, Mob. : 09837469173
- Naushad Ahmad Karimi, Ganj No.- 1, Bettiah- 845438, Distt. West Champaran (Bihar) Mob. : 09931068612
- Asgar Shamim, C/o - Baitul Qasim, 12/3/H/1-Patwar Bagan Lane, Kolkata-9 (W.B), Mob. 09836224948, e-mail:asgar.ara@gmail.com
- Ghalib Irfan, 'Saiban', 2-263, Sector-8, North Karachi, Karachi-75850 (PAK.)
- Iftekhar Raghib, Post Box 11671, Doha (Qatar), E-mail : iftekhar_raghib@hotmail.com
- Shakil Azmi, 5-B/002, Venus, Narendra Park, Naya Nagur, Mira Road (East) Mumbai-401107, Mob. : 09820277932
- Kahkashan Tabassum, C/o- Prof. Z. I. Rizvi, Department of Urdu, Sabour College, Sabour, Dist- Bhagalpur, PIN Code-813210
- Tabassum Fatima, D-304, Taj Enclave,Geeta Colony, New Delhi- 110031
- Khawar Naqueeb, "Tarweej", Koodsingra, Dist. Cuttak-754221 (Orrisa)
- Wahidul Hasan (Wahid Ansari) 229 Thomas Jafferson Terrace Elkton, MD 21921 (USA)

- Mamun R Aiman, 20, Biscatne Drive, Huntington NY 117443, (USA), Mob. : +16315498647
- Shaukat Hayat, 104-Abhilasha Apartment, 176-Patliputra Colony, (Near Chand Hospital), Patna- 800013 (Bihar),Mob. : 09825641645 / 0612-2261902, E-mail : shaukathayatwriter@yahoo.com,
- Siddique Alam, C/o- Yasmeen Sultana, Flat- 5D, Block Wave, Merlin River View 15, Kabi Tirtha Sarani, Kolkata-700023, Mob. : 09830489953
- Noorul Huda Syed, 1-3, Block - D, Federal Capital Area, Karachi [Pakistan]. Mob. : 00331-2143991
- Yaseen Ahmad, 17-2-1159/2, Waheed Colony, India Function Hall Lane P.O.- Yakutpura, Hyderabad- 500023 (A.P.), Mob. : 09848642909
- Sagheer Rahmani 'Jeevika' Office, Near Amar Jyoti School, Domuhan, P.O. Bhaluan, Bodh Gaya, Dist. Gaya-824231 (Bihar), Mob. : 09708680472
- Ghazal Zaigham, 31- Officer's Hostel [Vidhayak Niwas-5] Meera Bai Marg, Lucknow-226001 (U.P.), Mob. : 09415011267
- Rafiq Shahin, Taleem Manzil, Marris Road, Aligarh-202002, Mob. : 08979248741
- Abu Zar Hashmi, Flat-103, CGO QTRS, Belvedere, Alipore, Kolkata-700027, Mob. : 09330057962
- Sajid Zaki Fahmi, Research Scholar, Deptt. of Urdu, JMI, New Delhi, Mob. 09990121625
- Rashid Ashraf, L-2, Block-13D-1, Adjacent Zubari Family Park, Gulshan-E-Iqbal, Karachi (PAK.)
- Prof. Syed Md. Aqueel Rizve, 80-B, Daryabad, Allahabad-211003 (U.P.) Mob. : 09335089918
- Ali Haider Malik, A-1011, Sector-11-B, North Karachi, Karachi-75850 [Pakistan]. Mob. : 00346-2505286
- Prof. Abdul Mannan Tarzi, Mohalla- Faizullah Khan, P.O. Lal Bagh, Darbhanga-846004 (Bihar), Mob. : 09431085811
- Safdar Imam Quadri, 202, Abu Plaza, NIT More, Ashok Rajpath, Patna-800006 (Bihar), Email: safdarimamquadri@gmail.com, Mob.: 09430466321
- Izhar Khizer, Old City Court, Near Uma Petrol Pump, Patna-800007, Mob. : 09771954313

........☆........

Editor, Printer, Publisher and Proprietor Azeema Firdausi, got it printed at Pakeeza Offset Press, Shahganj, Patna-6 and published from Arzoo Manzil,Sheesh Mahal Colony, Alamganj, Patna-800007,Bihar (INDIA)